ولکن شبه لهم وان الذین اختلفوا فیه لفی شک منه ما لهم به من علم الا

ثبوت حیات مسیح
مسمّٰی بہ
شہادۃ القرآن
باعلیٰ النداء
بانّ المسیح رفع حیّا الی السماء

جملہ حقوق محفوظ
نام کتاب
تاریخ اشاعت
شہادت القرآن
جنوری 2001ء
تالیف
حضرت مولانا میر ابراہیم سیالکوٹی
مطبوعہ
تعداد
1100
دار الاحسان پبلشرز لاہور
15828
نعمانی کتب خانہ

مثبتِ حیاتِ مسیحؑ

مسمّٰی بہ

شہادۃ القرآن

باعلی النّدآء

بِانَّ المسیح رُفع حیًّا اِلی السّمآء

حصہ اوّل — حصہ دوم

مؤلف:

مولانا محمد ابراہیم میر صاحب فاضل سیالکوٹی

نعمانی کتب خانہ: حق سٹریٹ اردو بازار ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

سرزمین سیالکوٹ نے بہت سی عظیم علمی عبقری شخصیات کو جنم دیا ہے۔ جن میں مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی ؒ ' علامہ محمد اقبالؒ ' علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ ' مولانا محمد صادق سیالکوٹی ؒ سرفہرست ہیں۔ مولانا ابراہیم میر 1874ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیٹھ غلام قادر ہے۔ مولانا میر سیالکوٹی ؒ ایک آسودہ حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا مرحوم نے خود بھی کئی جگہ اپنی آسودہ حالی کا بطور اظہار تشکر تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں اللہ نے اپنے ارادہ ازل سے مجھے ایسے متمول باپ کے ہاں پیدا کیا جو نعمت دنیا کے ساتھ نعمت دین سے بھی بہرہ ور تھا والد مرحوم نے میری رغبت علوم دینیہ کی طرف دیکھ کر جناب حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم وزیر آبادی کے دست مبارک پر فی سبیل اللہ وقف کر دیا اور مجھے حق وراثت میں اتنا حصہ دے گئے کہ ساری عمر روزی کمانے کی حاجت نہیں پڑی۔

مولانا سیالکوٹی کا گھرانہ دینی تھا۔ چنانچہ مولانا نے 1895ء کو میٹرک کا امتحان ہائی سکول غلہ منڈی سیالکوٹ سے پاس کیا تو سیالکوٹ کے مشہور "مرے کالج" میں داخلہ لے لیا اس کالج میں مصور پاکستان شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال ان کے ہم جماعت تھے۔

مگر والدین کی خواہش تھی کہ ہمارا بیٹا دینی تعلیم حاصل کرے اور خود مولانا کا بھی دینی تعلیم حاصل کرنے کی طرف رجحان تھا۔ اس لئے کالج کو خیر آباد کہا اور دینی تعلیم کے حصول کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم مولانا غلام حسن سیالکوٹی سے حاصل کی مولانا غلام حسن شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی کے فیض یافتہ تھے۔ نیز مولانا غلام حسن سیالکوٹی کے شیخ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے انتہائی گہرے تعلقات تھے۔ اس لئے حضرت حافظ صاحب سیالکوٹ میں گاہے بگاہے آتے رہتے تھے اس طرح مولانا غلام حسن کے توسط سے مولانا ابراہیم کے والد سیٹھ غلام قادر سے بھی حضرت حافظ صاحب کے دوستانہ تعلقات ہو گئے یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت حافظ صاحب نے سیٹھ غلام قادر سے کہا کہ آپ اپنے لڑکے ابراہیم کو میرے پاس وزیر آباد بھیج دیں حافظ صاحب کہ کہنے پر سیٹھ غلام قادر نے اپنے لڑکے کا ہاتھ حافظ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور ابراہیم میر سیالکوٹی

حصول تعلیم کے لئے دارالحدیث وزیر آباد میں آگئے مولانا نہایت ذہین وفطین قوی الحافظہ تھے۔ اس لئے کم وقت میں جملہ علوم اسلامیہ کی تعلیم حضرت حافظ صاحب سے حاصل کی یہاں سے فراغت کے بعد ابھی تشنگی باقی تھی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اس لئے وزیر آباد چھوڑ کر علوم وفنون کے مرکز دہلی کا رخ کیا اور شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی کے حضور زانوے تلمذ طے کیا مولانا میر سیالکوٹی سید صاحب کے آخری دور کے شاگرد ہیں

مولانا سیالکوٹی انتہائی نیک سیرت اور لائق طالب علم تھے اور اللہ رب العزت نے ان کو گوناگوں صفات سے متصف کیا تھا۔ جب مولانا سیالکوٹی دہلی سے فراغت کے بعد وزیر آباد تشریف لائے تو والدہ نے کہ بیٹا ابراہیم میری خواہش ہے کہ اس دفعہ تو نماز تراویح میں قرآن سنائے۔ مولانا حافظ قرآن نہ تھے کہا اماں جان کوئی بات نہیں آپ دعا کریں اور میں قرآن یاد کرتا ہوں۔ چنانچہ اول رمضان سے قرآن یاد کرنا شروع کیا روزانہ ایک پارہ یاد کرتے اور رات کو نماز تراویح میں سناتے والدہ نے تمام رمضان دعا کا سلسلہ جاری رکھا غرض ادھر رمضان کے تیس دن پورے ہوئے اور مولانا سیالکوٹی نے قرآن کے تیس پارے مکمل سنادیئے بلاشبہ حضرت سیالکوٹی کو اللہ نے یہ بہت بڑا اعزاز عطا فرمایا۔

مولانا نے سیالکوٹ میں ایک دینی درسگاہ دارالحدیث کے نام سے شروع کی مگر مصروفیات کی وجہ سے اس کا سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

جماعت اہلحدیث کو فعال اور منظم کرنے میں مولانا کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ دسمبر 1906ء کو آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا مولانا سیالکوٹی اس اجلاس میں شامل تھے۔ کانفرنس کو متعارف کروانے کے لئے تین رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی مولانا سیالکوٹی اس کمیٹی کی رکن تھے دوسرے دو ارکان مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔

مولانا سیالکوٹی کے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ساتھ برادرانہ تعلقات تھے چنانچہ مولانا نے اپنی کتب میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا سیالکوٹی اور مولانا ثناء اللہ اکثر ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ جب مولانا سیالکوٹی امرتسر جاتے تو مولانا ثناء اللہ اُن کو درس قرآن دینے کو کہتے اور اگر اثنائے قیام جمعہ کا دن آتا تو میر سیالکوٹی خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے اکثر تبلیغی پروگراموں میں جب دونوں اکٹھے نظر آتے تو سامعین میں خوشی کی

لیہ دوڑ جاتی غرض برصغیر میں مولانا سیالکوٹی اور مولانا امرتسری نے باطل پرستوں کو للکارا اور تقریر تحریر اور میدان مناظرہ میں ایک دوسرے کے دوش بدوش رہے۔ مولانا مرحوم نے درس تدریس تصنیف وتالیف دعوت ومناظرہ وعظ وتذکیر غرض ہر محاذ پر کام کیا اور شہرت کی بلندیوں کو پہنچے۔ ملکی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ مولانا کی تمام ہمدردیاں مسلم لیگ سے وابستہ تھیں 1930ء میں مسلم لیگ کا اجلاس جو الہ آباد میں ہوا مولانا اس میں شریک تھے۔ 1940ء میں اجلاس لاہور جس میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی اس میں بھی مولانا موجود تھے۔ غرض تحریک پاکستان کی حمایت اور مسلم لیگ کی رفاقت میں مولانا سیالکوٹی کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور مولانا سیالکوٹی کا شمار بانی پاکستان محمد علی جناح کے رفقاء میں ہوتا ہے۔

1945ء میں جمعیت علمائے اسلام کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی مولانا شبیر احمد عثمانی اس کے صدر تھے اور مولانا سیالکوٹی نائب صدر تھے اس کا پہلا اجلاس کلکتہ میں ہوا مولانا عثمانی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے چنانچہ اجلاس کی صدارت مولانا سیالکوٹی نے کی۔

''الھادی'' کے نام سے مولانا نے ایک پندرہ روزہ علمی مجلہ جاری کیا جو ایک عرصہ تک علمی دینی اور تحقیقی خدمات انجام دیتا رہا۔

مولانا اسحاق بھٹی لکھتے ہیں۔ مولانا سیالکوٹی ایک کثیر المطالعہ عالم دین تھے تفسیر حدیث فقہ اصول تاریخ وتذکرہ فلسفہ منطق اور تقابل ادیان وغیرہ علوم سے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اسلام اور احکام اسلام کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مناظرے میں بھی ان کی بڑی شہرت تھی۔ عیسائیوں آریوں اور قادیانیوں کے ساتھ انہوں نے متعدد مقامات پر مناظرے کیے اور کامیاب رہے بعض مسائل میں علمائے احناف سے بھی ان کے مناظرے ہوئے۔

مولانا سیالکوٹی نے جنوری 1956ء میں وفات پائی نماز جنازہ حافظ عبداللہ محدث روپڑی نے پڑھائی اور سیالکوٹ میں دفن ہوئے اللہ ان کی مرقد پر اپنی رحمت کی برکھا برسائے۔

مولانا سیالکوٹی کے تصنیفی خدمات بھی قابل رشک ہیں مولانا نے بیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

واضح البیان' سیرت مصطفی' تائید القرآن' تعلیم القرآن' تاریخ اہلحدیث' تاریخ نبوی' اصلاح عرب' تیسیر القرآن فی تفسیر القرآن (پارہ اول تا سوم)' تفسیر سورۃ

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه

کہف، عصمت النبی، بشارت محمدیہ، علم الوصول الی اسرار الرسول، سراجاً منیرا، فرقہ ناجیہ، خلافتِ راشدہ، اعجاز القرآن، الخبر الصحیح عن قبر المسیح، آئینہ قادیانی، فیصلہ ربانی بر مرگ قادیانی، رحلتِ قادیانی، انارۃ المصابیح، زاد المتقین، اور زیر نظر کتاب شہادت القرآن (مولانا سیالکوٹی کی ایک شاہکار تصنیف ہے۔ اس میں مرزائیت قادیانیت کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی اور انکے حواریوں کی متعفن تحریرات اور خرافات کا رد کیا گیا ہے)۔ عرصہ دراز کے بعد نعمانی کتب خانہ نے اس کی اشاعت کی طرف توجہ کی اور دیگر احباب معاونین کی رہنمائی سے آج یہ کتاب منصۂ شہود پر جلوہ نما ہے۔ شہادت القرآن کی تصحیح و تنقیح کے بعد پروفیسر عبدالقیوم میر برادرزادہ مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی نے 1959ء میں شائع کی۔

پروفیسر عبدالقیوم میر (مرحوم) موجودہ امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان سینٹر پروفیسر ساجد میر کے والد محترم ہیں۔ پروفیسر ساجد میر مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی اور اپنے خاندان کی تابندہ و درخشندہ روایات کے روحانی اور نسبی وارث ہیں۔

پروفیسر ساجد میر انگریزی زبان میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور ایک محب وطن اور اسلام پسند سیاستدان کے طور پر ملک میں معروف ہیں۔ کچھ وقت نائجیریا میں بھی گزارا اور وہاں اسسٹنٹ چیف ایجوکیشن آفیسر کے عہدے پر فائز رہے انہیں علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی شہادت کے بعد جمعیت اہلحدیث کا قائم مقام ناظم اعلیٰ نامزد کیا گیا بعد میں باقاعدہ ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے اب مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے امیر ہیں دعا ہے اللہ ان کی عمر دراز فرمائے۔

تقابل ادیان وغیرہ علوم سے متعلق ساجد میر پختہ معلومات رکھتے ہیں خصوصاً مرزائیت و عیسائیت کی مذہبی سرگرمیاں ان سے مخفی نہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک ضخیم کتاب 'عیسائیت مطالعہ و تجزیہ' منظر عام پر آئی ہے۔ زیر نظر کتاب کی اشاعت میں بھی موصوف نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا چنانچہ ہم نے اس کتاب کو کمپیوٹر کمپوزنگ اعلیٰ جلد بندی دلکش ڈیزائننگ کے ساتھ عوام الناس کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اس سلسلہ میں قارئین اگر کوئی غلطی پائیں تو اپنی تجاویز سے ناشر (نعمانی کتب خانہ) کو مطلع فرمائیں۔

ناشر

ضیاء الحق نعمانی

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

فہرست مضامین
شہادت القرآن حصہ اوّل

فہرست مضامین
شہادت القرآن حصہ دوم

حرفِ اول

اثباتِ حیاتِ مسیح علیہ السلام کے عنوان سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ میر سیالکوٹی کی معرکہ آراء تصنیف محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ یکے بعد دیگرے چند مرتبہ اشاعت کے باوجود بازار سے نایاب ہوگئی اور اس کے بعد پھر زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی! حسنِ اتفاق سے کتاب کا ایک نسخہ شیخ المشائخ قطب العالم حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر مدظلہ العالی کی خدمت اقدس میں پیش کیا گیا۔ تو حضرت اقدس زید مجدہ نے موضوع کی عظمت، مضامین کی بلندی اور دلائل کی پختگی سے متاثر ہوکر اس کتاب کو مختلف مجالس میں بالاقساط پڑھوایا۔ سماعت کے بعد حضرت اقدس زید مجدہ نے اس کتاب کی فوری اشاعت کی خواہش ظاہر فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کے بھتیجے مولانا عبدالقیوم صاحب مدظلہ سے مولانا مرحوم کا وہ ذاتی نسخہ حاصل کیا گیا۔ جس میں مولانا مرحوم نے طبع چہارم کے لئے جابجا ضروری اضافہ اور مناسب ترمیم کو بصورتِ حاشیہ قلمبند کر رکھا تھا۔ مگر انہیں اپنی زندگی میں اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا تھا! عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ اور تردیدِ مرزائیت کے سلسلہ میں موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کی اشاعت کے اہتمام وانصرام کی سعادت حضرت اقدس کی خواہش کے مطابق مجلس مرکزیہ تحفظ ختمِ نبوت پاکستان ملتان کو نصیب ہوئی۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ برمحل ہوگا کہ ملک بھر میں مجلس تحفظ ختم نبوت ہی ایک واحد جماعت ہے۔ جو ذاتی اقتدار کی رسہ کشی اور غیر اسلامی سیاسی بکھیڑوں سے بے نیاز ہوکر خالصۃً اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہی ہے! خدا کے فضل سے اس جماعت کا دائرہ کار پورے ملک میں وسیع وہمہ گیر ہو رہا ہے! مغربی

پاکستان کے اکثر بڑے شہروں میں اس جماعت کے مبلغین جماعتی خرچے پر تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مجلس کے زیر اہتمام دینی مدارس بھی قائم ہیں! گویا پاکستان بھر میں یہی ایک جماعت ایسی ہے جو منظم اور موثر طریق سے عیسائیوں' مرزائیوں اور دیگر باطل تنظیموں کا پوری تن دہی اور مستقل مزاجی کے ساتھ نہ صرف مقابلہ کر رہی ہے۔ بلکہ اس کی دعوت روز افزوں مقبول و محبوب ہو رہی ہے اور زیر نظر کتاب کی اشاعت بھی اسی مقدس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ان سطور کے بعد دیندار عوام سے عموماً' علماء کرام اور مشائخ عظام سے خصوصاً استدعا ہے کہ وہ اپنا دینی اور اخلاقی فرض پہچانتے ہوئے اس مفید ترین علمی تحفہ اور موثر تبلیغی ہدیہ کی بڑھ چڑھ کر قدر افزائی کریں۔ تاکہ مسئلہ ختم نبوت کی عظمت و اہمیت ہر دل میں زیادہ جاگزیں ہو اور اس کے اعزاز و اکرام کے صدقہ میں حق تعالیٰ ہماری تمام ذلتوں اور رسوائیوں کو دور کر کے ہمیں دارین کی نیک نامیوں اور درجات کی بلندیوں سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین

جناب حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی

بر طبع اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ خالق الحب والنویٰ الخالق لکل فرعون موسیٰ. والصلوٰۃ والسلام علٰی سیّد المرسلین صاحب الشفاعۃ الکبریٰ والہٖ وصحبہٖ اھل التقٰی والنقٰی.

امابعد رسالہ مؤلفہ جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی کا نظر ناقص سے گزرا۔ جس نے اہلِ اسلام کو الحاد اور تحریف سے بچانے کی وجہ سے ممنون و ماموں فرمایا۔ لَا رَیْبَ فَھُمْ اُعْطِیَۃُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ کے زیور کی سجاوٹ اور پھبن سے بہ نسبت زمانہ حال کی تالیفات کے جداگانہ جھلک دکھاتا ہے۔ فللّٰہ درا المؤلف حیث اری الناظر کل کلمۃ من الکلمات القرآنیۃ سلطان دارھا و کل اٰیۃ من الاٰیات الفرقانیہ برھان جارھا وان ماتوھم فیھا من التکرار فمن رمد الابصار. اللّٰھم اید الاسلام والمسلمین و اخذل الملاحدۃ والمبتدعین بطول حیاتہ واعف عن سیئاتہ و ضاعف حسناتہ واٰخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسّلام علٰی خاتم النبیین والہٖ وصحبہٖ اجمعین.

العبد الملتجی الی اللّٰہ المدعو بمھر علی شاہ عفی عنہ از گولڑہ

بسم الله الرحمن الرحيم
ما كان
محمد
أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله
وخاتم النبيين
الأحزاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنے چند

فرنگی کا ایک خود کاشتہ پودا قادیانیت یا مرزائیت کے نام سے موسوم ہے۔
اس نے اسلام اور اس کے بنیادی اصول و احکام کو مٹانے کے لئے مسلمانوں ہی سے ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی کا انتخاب کیا اور اس کو یہ پٹی پڑھائی کہ

ایک ایسے مذہب کی بنیاد رکھو۔ جس کا مقصد انگریز اور اس کی حکومت کی اطاعت ہو۔ اور جو مسلمانوں کی مذہبی و قومی اور ملی روایات کا خاتمہ کر دے اور جہاد کی سپرٹ کو ختم کیا جائے۔ تاکہ ہندوستان کی برٹش حکومت مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہو جائے اور اسے کوئی گزند اور نقصان نہ پہنچا سکیں اور آرام سے حکومت کر سکیں اور مسلمان ہر معاملہ میں انگریز حکومت کے سامنے سر جھکا سکیں۔

چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریز کی گٹھ جوڑ سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اس شخص نے سب سے پہلے "تبلیغ اسلام" کا ڈھونگ رچایا اور "براہین احمدیہ" حصہ اول شائع کر کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی۔ اس کے بعد اس شخص نے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد مجدد سے "مہدی" بن گیا اور یہ اعلان کیا کہ

جس مہدی عیسیٰ یا مسیح کے نزول کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے۔ وہ مرزا ہی ہے مگر درجات و مراتب میں مسیح سے افضل و اعلیٰ ہے۔

بقول مرزا

شہادت القرآن

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو

اس سے بہتر غلام احمد ہے

مسیح موعود سے ترقی کرتے ہوئے اس شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ

مرزا غلام احمد قادیانی رسول یا نبی اور ملہم ہے۔ جس پر انبیاء کی طرح وحی نازل ہوتی ہے خدا کے تمام پیغمبروں کی صفات اس میں پائی جاتی ہیں اور یہ شعر کہا

میں کبھی آدم کبھی موسیٰ کبھی یعقوب ہوں

نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں مری بے شمار

اور اس کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ

1. روئے زمین کے تمام اہل اسلام کافر مطلق ہیں۔
2. اسلام کے تمام علمائے کرام کافر' دجال' شیطان اور فسادی ہیں۔
3. میری تمام کتابیں صحف آسمانی کی حیثیت رکھتی ہیں ان کا درجہ قرآن کے برابر ہے۔

مثال مشہور ہے لکل فرعون موسیٰ (اللہ تعالیٰ نے ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ بھی ساتھ پیدا کیا ہے)۔

یہ مثال پنجاب کے کاذب مرزا غلام احمد قادیانی پر صادق آ گئی ہے جس دور میں مرزا قادیانی نے ملت اسلامیہ میں رخنہ ڈالنے کے لئے مسیح موعود یا مہدی زماں' نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی (م ۱۳۳۸ھ) کو پیدا فرمایا۔ آپ نے جس متانت اور سنجیدگی سے اس فتنہ کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ وہ اسلامیان ہند کی تاریخ میں ایک بے نظیر کارنامہ ہے مولانا محمد حسین بٹالوی کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیخ الاسلام فاتح قادیاں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کو پیدا فرمایا۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اس فتنہ ضالہ کی سرکوبی میں

صرف کردی اور مرزا قادیانی کو اتنا زچ کیا کہ آخر اس نے تنگ آ کر آپ سے مباہلہ کیا اور لکھا کہ

جھوٹا سچے کی زندگی میں کسی مہلک بیماری سے ہلاک ہو جائے۔

کوئی خاص وقت تھا کہ مرزا کی زبان سے کہی ہوئی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور مرزا قادیانی اپنی اس دعا کے ایک سال ایک ماہ اور ۱۲ دن بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں اپنے میزبان ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کے مکان واقع احمدیہ بلڈنگ لاہور میں ان کے بیت الخلاء میں دم توڑ گئے اور مولانا ثناء اللہ نے ۴۰ سال بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں رحلت فرمائی۔

مولانا ثناء اللہ مرحوم نے مرزا قادیانی کی وفات پر فرمایا

کذب میں پکا تھا پہلے مر گیا
نامرادی میں ہوا اس کا آنا جانا

فتنہ قادیانی کے خلاف علمائے اہلحدیث کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ مشہور صحافی آغا عبدالکریم شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں کہ

جن علمائے اہلحدیث نے مرزا صاحب اور ان کے بعد قادیانی امت کو زیر کیا۔ ان میں مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سرفہرست تھے۔ لیکن جس شخصیت کو علماء اہلحدیث میں فاتح قادیاں کا لقب ملا۔ وہ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ انہوں نے مرزا صاحب اور ان کی جماعت کو لوہے کے دانے چبوائے۔ اپنی زندگی ان کے تعاقب میں گزار دی۔ ان کی بدولت قادیانی جماعت کا پھیلاؤ رک گیا۔ مرزا صاحب نے تنگ آ کر انہیں خط لکھا کہ "میں نے آپ سے بہت دکھ اٹھایا ہے اور صبر کرتا رہا ہوں۔ اگر میں کذاب و مفتری ہوں جیسا کہ آپ لکھتے ہیں تو آپ کی زندگی میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ ورنہ آپ سنت اللہ کے مطابق مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔

خدا آپ کو نابود کر دے گا خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفسد مکذب کو صادق کی زندگی میں اٹھالے۔ (خط مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء)

اس خط کے ایک سال ایک ماہ اور بارہ دن بعد مرزا صاحب لاہور میں اپنے میزبان کے بیت الخلاء میں دم توڑ گئے۔ مولانا ثناء اللہ نے ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو سرگودھا میں رحلت فرمائی۔ وہ مرزا صاحب کے بعد ۴۰ سال تک زندہ رہے ان کے علاوہ مولانا عبداللہ معمار' مولانا محمد شریف گھڑیالوی' مولانا عبدالرحیم لکھوا لے' مولانا حافظ عبداللہ روپڑی' مولانا حافظ محمد گوندلوی' مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا عبدالقادر روپڑی اور حافظ محمد ابراہیم کمیر پوری وغیرہ نے قادیانی امت کو ہر محاذ پر ذلیل خوار کیا۔

اس سلسلہ میں غزنوی خاندان نے عظیم خدمات انجام دیں مولانا داؤد غزنوی جو جماعت اہلحدیث کے امیر اور مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری رہے۔ انہوں نے اس محاذ پر بے نظیر کام کیا۔ فی الجملہ تحریک ختم نبوت کے اس آخری دور تک جب مرزائی مسلمانوں سے الگ کیے گئے اور آئینی اقلیت قرار پا گئے۔ علماء اہلحدیث قادیانیت کے تعاقب میں پیش پیش رہے اور اس عنوان سے اتحاد بین المسلمین میں قابل قدر حصہ لیا۔

(تحریک ختم نبوت ص ۴۰۔۴۱)

فتنہ قادیانیت کے خلاف علماء اہلحدیث کی تحریری خدمات بھی قدر کے قابل ہیں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ مولانا حبیب اللہ امرتسریؒ مولانا عبداللہ معمارؒ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ مولانا ابوالقاسم بنارسیؒ مولانا حافظ عبداللہ روپڑیؒ مولانا حافظ محمد گوندلویؒ مولانا محمد حنیف ندویؒ مولانا صفی الرحمان مبارکپوری اور علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی تحریری خدمات تاریخ اہلحدیث کا ایک درخشندہ باب ہے۔

"شہادۃ القرآن" مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کی بے نظیر تصنیف ہے مرزا

قادیانی نے اپنے مسیح موعود کے دعویٰ میں موضوع اور منکر روایات کا سہارا لیا تھا اور آیات قرآنی میں تحریف کر کے لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔
مولانا سیالکوٹی نے اپنی اس کتاب میں مرزا قادیانی کی قلعی کھول دی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ''بجسدہ العنصری'' آسمان پر اٹھایا جانا ثابت کیا ہے۔

مولوی ابویحییٰ امام خان نوشہروی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے قرآن مجید کے متعلق کتابیں مختلف ضرورت کے مطابق لکھیں۔ جن میں صرف آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر دو جلدوں میں بعنوان ''شہادۃ القرآن'' ہے جو مسئلہ حیات عیسیٰ علیہ السلام پر ایسی گواہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو مردہ بتانے والے بھی كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ. پکار اٹھے۔

شہادۃ القرآن دو جلدوں میں ہے:

شہادۃ القرآن کی پہلی جلد رجب ۱۳۲۱ھ/ستمبر ۱۹۰۳ء مرزا قادیانی کی زندگی میں شائع ہوئی۔

اس کے بعد اس کی دوسری جلد ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی مگر مرزا قادیانی کو اس کتاب کا جواب لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

شہادۃ القرآن دوسری مرتبہ جلد اول صفر ۱۳۳۰ھ/فروری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ/اگست ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔

تیسری مرتبہ شہادۃ القرآن کی جلد اول ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ/مئی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ مگر دوسری جلد بوجوہ شائع نہ ہو سکی۔

چوتھی مرتبہ یہ کتاب دونوں جلدیں ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ/جولائی ۱۹۵۹ء مولانا عبدالقادر رائے پوری کی تحریک پر مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیں۔

اب پانچویں مرتبہ یہ کتاب نعمانی کتب خانہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ محترم ضیاء الحق نعمانی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے ۲۵ سال بعد اس کتاب کی اشاعت پر توجہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے کہ انہوں نے ایک بہت بڑا علمی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

عبدالرشید عراقی
سوہدرہ ضلع گوجرانوالہ
۱۰ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
۵/۴ اپریل ۲۰۰۱ء

حصہ اول (طبع چہارم)

حصہ دوم (طبع سوم)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ.

اما بعد' اثبات حیات مسیح علیہ السلام کے متعلق مولانا محمد ابراہیم صاحب میر فاضل سیالکوٹی کی قابل قدر کتاب "شہادت القرآن" کا پہلا حصہ رجب ۱۳۲۱ھ میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی زندگی میں طبع ہوا۔ اس کے بعد اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جس میں مرزائے قادیانی کے دلائل متعلقہ وفات مسیحؑ کا مفصل اور معقول جواب درج ہے' ۱۳۲۳ھ میں مرزا صاحب کی زندگی ہی میں طبع ہو گیا تھا۔ مگر انہیں ان دونوں میں سے کسی ایک حصے کے جواب کی ہمت نہ ہوئی۔

پہلا حصہ دوسری مرتبہ صفر ۱۳۳۰ھ (مطابق فروری ۱۹۱۲ء) میں طبع ہوا۔ اور دوسرا حصہ دوسری مرتبہ مولانا ثناء اللہ صاحب فاضل امرتسری کے اہتمام سے ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ مطابق اگست ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔

پہلا حصہ تیسری مرتبہ مصنف علام نے ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق مئی ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

اس کے بعد اس کتاب کی مانگ تو بہت زیادہ رہی' مگر کثرت اشغال و قلت فرصت کے باعث فاضل مصنفؒ اس کی طبع چہارم اپنی زندگی میں تو شائع نہ فرما سکے' لیکن انہوں نے اتنا اہتمام ضرور کیا۔ کہ حصہ اول کی طبع سوم کے ایک نسخے میں طبع

چہارم کے لیے اپنے دست مبارک سے جگہ جگہ ضروری اضافے فرما دیئے۔ اور کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ تحریر فرمائے

''صحیح کردہ نسخہ طبع چہارم کے لئے''

نیز تاکیداً تحریر فرما دیا کہ اس نسخے کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ مصنف علام کی اس تحریر کی تاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء بوقت شب (مطابق ۹ ربیع الآخر ۱۳۶۹ھ) ہے۔

راقم الحروف نے انتہائی کوشش کی ہے کہ مصنف کی دلی آرزو کے مطابق حصہ اول کی طبع چہارم میں اس کے تجویز کردہ تمام اضافے اور ترمیمات اپنے اپنے مقام پر صحت کے ساتھ درج ہو جائیں۔

مصنف علام ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء مطابق ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لیکن یہ یقین کر لینا چاہیے کہ حصہ اول کی طبع چہارم گویا انہیں کی نگرانی میں شائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ناظرین کو اس سے نفع پہنچائے!

ناشکری ہوگی اگر صمیم قلب سے اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے کہ شہادت القرآن کی یہ اشاعت کلیتہً حضرت اقدس مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری دَامَتْ فُیُوْضُھُمْ کی توجہ خاص کی رہین منت ہے۔ مولانا لال حسین صاحب اختر نے جس فیاضی سے کام لے کر شہادت القرآن کے ہر دو حصص کتابت کے لئے پیش فرمائے اللہ تعالیٰ اس کے لئے انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

۲۶ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ برادر زادہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی

۱۵ جولائی ۱۹۵۸ء عبدالقیوم میر

٭ مرزا ہادی علی بیگ صاحب رواں رامپوری نے مولانا نے مرحوم کی تاریخ وفات یوں تحریر فرمائی ہے: ۱۳۷۵ھ

قَالُوْا ہَادِيْ اُكْتُبْ: اَلْحَقُّ مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ

۶   ۵   ۹   ۱   ۶

دیباچہ طبع ثالث

مسمّٰی بسعادتِ الاقران بکشف بعض لطائف شہادت القرآن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْاَكْرَمِ، اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اما بعد۔ صاحبان! شہادت القرآن کا پہلا حصہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی نو آیاتِ قرآنیہ سے ثابت کی گئی ہے' اول مرتبہ ماہ رجب ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ جس میں ان تیس دلائل کا جواب ہے جو مرزا غلام احمد صاحب مدعی مسیحیت و نبوت نے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول پر بزعم خود قرآن شریف سے پیش کئے ہیں' مرزا صاحب کی زندگی ہی میں رمضان ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوا' مرزا صاحب ۲۴ ماہ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو بروز منگل (سہ شنبہ) میلہ بھدر کالی کے دن بمقام لاہور فوت ہوئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کو شہادۃ القرآن کا جواب لکھنے کے لئے کئی سال کی مہلت ملی' لیکن نہ تو جناب مرزا صاحب آنجہانی کو ہمت ہوئی اور نہ ان کی زندگی میں ان کی جماعت کے کسی واقعی عالم یا مدعی علم کو جرأت ہوئی۔

پھر دوسری مرتبہ پہلا حصہ صفر ۱۳۳۰ھ میں مطابق فروری ۱۹۱۲ء اور دوسرا حصہ اہتمام حضرت مولٰنا المکرم جناب مولوی ثناء اللہ صاحب دوامت برکاتہٗ سردار

اہلحدیث ذی الحج ۱۳۴۰ھ مطابق اگست ۱۹۲۲ء میں طبع ہوا۔

ارادہ تھا کہ دوسری طبع میں اس کی بعض مشکلات کی تسہیل اور مجملات کی توضیح و تفصیل کر دوں گا' لیکن میری قلت فرصت (جو ہمیشہ شامل حال رہتی ہے) اور طالبین کی شدت شوق و استعجال نے اس خواہش کو پورا نہ ہونے دیا

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ مُدْرِكُهُ وَ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَالَا تَشْتَهِي السُّفُنُ

اب تیسری طبع کی نوبت آ گئی ہے اور جس قدر شائقین کی طلب اور ''دفتر اہلحدیث'' کی فرمائش زیادہ ہو رہی ہے' اسی قدر میری فرصت کم سے کمتر ہو رہی ہے' ایسی قلت فرصت کی حالت میں کہ متعدد مشکل اور مطول تصانیف[1] کا سلسلہ جاری ہے اس علاوہ[2] کو بھی ساتھ رکھ لیا۔ اب اللہ ہے کہ ان سب کو پورا کرا دے۔ هُوَ حَسْبِي وَ نِعْمَ الرَّفِيْق. خیال تھا کہ اس تیسرے ایڈیشن میں امکان خرق عادت کا مضمون مفصل لکھا جائے۔ چنانچہ وہ لکھ بھی ڈالا۔ لیکن وہ اتنا طویل ہو گیا کہ اگر اسے اس کتاب کا جزو بنایا جائے تو کتاب کا حجم بڑھ جائے۔ بنابریں مناسب جانا کہ اسے الگ ایک رسالہ کی صورت میں طبع کرا دیا جائے۔

اہل علم نے اس کتاب (شہادت القرآن) کی جو قدر کی' وہ ان کی ذرہ نوازی' اور علمی قدردانی ہے' ورنہ میری نظر سے وہ اس قابل نہ تھی کہ اہل علم اسے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے' اور قادیانی مناظرات میں زیر نظر رکھتے۔

---

[1] مثلاً تاریخ اہلحدیث' خلافت راشدہ کے دو سلسلے (ایک اخبار اہلحدیث میں' اور دوسرا اخبار زمیندار میں) سیرۃ الرسول (آنحضرت ﷺ کے سوانح قدسیہ) تفسیر ثنائی کے ترجمۃ القرآن پر نظر ثانی' حسب فرمائش جناب مولنا المکرم اور اپنی تفسیر القرآن مسمّٰی بہ توفیق الرحمٰن اور بلدیہ سیالکوٹ کے تعلقات اور لوگوں کے بیچ کے معاملات اور فصل خصومات اور ہندوستان بھر سے روزانہ خط و کتابت اور انشائے فتاویٰ کے اشغال تو گنتی میں نہیں۔ اَللّٰهُمَّ تَمِّمْ كُلَّهَا بِالْخَيْرِ وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ مزید برآں فروری ۱۹۲۷ء کا سارا مہینہ سفر میں گذرا۔

[2] علاوہ (بالکسر) عربی میں اس چھوٹی سی گٹھڑی کو کہتے ہیں جو لادو جانوروں پر ان کے اصلی بوجھ سے زائد اوپر رکھ لیتے ہیں۔ ۱۲ منہ

میں حضراتِ دیوبند کا خصوصیت سے شکرگزار ہوں' کہ انہوں نے اپنی علمی قدر شناسی اور فراخ دلی کا علمی ثبوت دیا' خصوصاً مولنا مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کا کہ وہ برابر اپنے طلباء اور محصلین اور زیر اثر شائقین کو اس کتاب کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں' میں انسان ہو کر' اس ناچیز خدمت کو' بے عیب متاع' کی طرح پیش نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن چونکہ ایمان وایمانیات میں اذعان و وثوق ضروری ہے' اس لئے اپنے ایمان واذعان کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس میں حق حق بیان کیا ہے' اور اسے ایسے زبردست اور روشن دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اس کے جواب میں مرزا صاحب اور ان کی جماعت کا قلم کیا دم بھی ٹوٹ گیا ہے' نہ تو جواب کی ہمت پڑی اور نہ انشاء اللہ پڑے گی' کیونکہ میں نے اس میں خدا کے فضل و توفیق سے اصل دلیل کی بنا صرف قرآن کریم پر رکھی ہے' اور اسے ادھر ادھر کی کھینچ تان اور ایچا پیچیوں سے سلامت رکھتے ہوئے بالکل منشائے الٰہی کے مطابق بیان کیا ہے اور باقی سب قسم کے دلائل کو اس کے ماتحت تائیدی شہادتیں اور تشریحیں بنایا ہے۔ ہاں اس امر کا لحاظ شدت سے رکھا ہے کہ کسی آیت کے مفہوم کو کلام الٰہی کے امین اور صحیح مخاطب رسول اللہ ﷺ کے بیانِ قولی یا فعلی' اور فصیح زبان عرب کے محاورات اور علمی قواعد استدلال واستنباط کے خلاف بیان نہ کروں۔

اہل علم وفہم اصحاب کی خدمت میں ان کے مذاقِ علم کی ضیافت کے لئے چند سطور ذیل میں پیش کرتا ہوں' جس سے ان کی دوررس نظر' اس امر کو بسہولت پالے گی کہ میں نے اس کتاب میں کیسی پختگی سے امورِ ضروریہ کو ملحوظ رکھا ہے' اور مضمون کے مالہ وماعلیہ کو کس طرح نظر میں رکھ کر حق کا اثبات اور باطل کا ابطال کیا ہے' اور مفہوم کلام کو خدائے حکیم کے منشا کے مطابق بیان کیا ہے اور مقام احتجاج وتحقیق میں دفع الوقتی اور تساہل اور مقام تردید وتنقید میں اوچھے ہتھیاروں سے ہرگز کام نہیں لیا۔ بلکہ خدا کے فضل وحسن توفیق سے شہادت القرآن کے ہر دو حصوں میں الحق حق (بغیر کسی قسم کی ملاوٹ کے) زبردست دلائل سے بیان کیا گیا ہے۔

پہلے حصے میں مقام استدلال وتعلیل میں کسی امر کو بھی بغیر دلیل نہیں چھوڑا کہ کوئی مانع طلب کر سکے' اور ہر دلیل کو قواعد علیہ سے ایسا محکم کیا ہے کہ مخالف کو نقض کی گنجائش نہیں' اور قواعد علیہ کا اجراء اور استدلال کی بنا آیاتِ قرآنیہ پر رکھی ہے اور یہ مسلم ہے کہ ان کا معارضہ ممکن نہیں' اور ہر نقل کو صحیح صحیح بغیر کمی بیشی یا تغییر مفہوم کے لکھا ہے۔ پس صحت نقل کا مطالبہ عبث ہے' اور پھر مسلمات نقلیہ کو میزان عقل پر بھی پورا کر دکھایا ہے کہ ہر دو جہت سے برہان قوی ثابت ہو' پس تعارض عقل ونقل کا عذر بھی نہیں ہو سکتا۔

دوسرے حصے میں مرزا صاحب کے "دلائل وفاتِ مسیح" کا جواب ہے۔ اس میں ان کی ہر فرضی دلیل کے ہر مقدمہ پر علم لغت ونحو واصول اور قرآن وحدیث صحیح سے نقض کیا ہے اور ہر نقض میں شاہد پیش کیا ہے اور ان کے اپنے مسلمات سے ان پر الزام قائم کیے ہیں' پس اپنی کم بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے اور محض خدا کے فضل پر اعتماد رکھتے ہوئے' میں کہہ سکتا ہوں کہ شہادت القرآن کے حصہ دوم کے مطالعہ کے بعد مرزا صاحب کے صاحب علم ہونے کا خیال باقی نہیں رہ سکتا۔

اگر ان کے کسی حامی کے سر میں پھر بھی خیال سمائے کہ مرزا صاحب علم نحو واصول میں مہارت رکھتے تھے' تو اس کا فرض ہے کہ ان علوم کے رو سے اس کتاب کے حصہ دوم کا جواب لکھ کر اپنے خیالات کو مرزا صاحب کی تصریحات سے ثابت کرے' جو انشاء اللہ نہیں ہو سکے گا۔

مرزا صاحب کی زندگی میں نہ تو ان سے اور نہ ان کے کسی ذی علم مرید سے ہو سکا کہ شہادت القرآن کا جواب لکھیں۔ آخر ان کی وفات کے کئی ماہ بعد ان کے ایک حواری مولوی ظہور الدین صاحب اکمل نے اس کے پہلے باب کا جواب بنام شہادت الفرقان چھپوایا۔ لیکن حقیقت میں وہ شہادت القرآن کا جواب نہیں ہے۔ اسی لیے خود ان کی جماعت میں بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی' اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ مولوی اکمل صاحب شہادت القرآن کے مطالب عالیہ اور لطائف علیہ کو سمجھ نہیں

سکے۔ بلکہ جن امور کو بالتصریح بیان کیا گیا ہے ان کو بھی خیال میں نہیں رکھ سکے بلکہ جو باتیں ان کی جماعت اور خود مرزا صاحب اس سے قبل مسئلہ حیات و ممات حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق بیان کیا کرتے تھے وہی دہرادی ہیں۔ حالانکہ شہادت القرآن میں ان عذرات کی تردید صراحۃً یا اشارۃً موجود ہے اور خدا کے احسان سے خاکسار نے اس کتاب کو خاص اسی خیال سے ایسی مضبوطی اور خوبی کے ساتھ لکھا تھا کہ مرزا صاحب قادیانی اور ان کی جماعت کے علماء اس کے جواب سے عاجز رہیں۔ دیگر اس خیال سے کہ جو کچھ قادیانیوں کی طرف سے اس کے جواب میں نکلے اس کا جواب بھی خود شہادت القرآن ہی ہو اور مجھے نیا جواب لکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔

قاصد کے آتے آتے میں خط اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

سوالحمدللہ میرے دونوں خیال درست نکلے۔ نہ تو مرزا صاحب قادیانی اس کا جواب لکھ سکے اور نہ ان کے علماء اس کے دلائل کو توڑ سکے اور نہ مجھے جواب الجواب کے لئے شہادت القرآن سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ یہ ہیچمدان موقع بہ موقع اکمل صاحب کا جواب خاص شہادت القرآن ہی کی تصریحات اور اشارات سے دے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دوسری وجہ یہ کہ خاکسار نے شہادت القرآن کا پہلا باب رجب ۱۳۲۱ھ میں چھپوایا۔ اور دوسرا باب دو سال بعد رمضان ۱۳۲۳ھ میں طبع کرایا۔ اس دو سال سے کچھ زائد عرصہ میں پہلے باب کا کوئی جواب نہیں لکھا گیا اور اس کے بعد بھی ۱۳۲۶ھ تک خاموشی رہی اور مرزا صاحب چل بسے۔ ساڑھے پانچ سال بعد صرف پہلے باب کا جواب طبع ہوا۔ اور دوسرے باب سے (جس میں مرزا صاحب کے ان دلائل کو جو انہوں نے وفات حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لکھے ہیں لغت عرب اور قواعد علمیہ اور احادیث نبویہ اور علوم آلیہ اور اصول استدلال سے ایسا غلط ثابت کیا گیا ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد مرزا صاحب کی عیسویت کا رنگ تو کجا آپ کی علمیت کا بھی

شہادت القرآن

سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ اور قفار علماء میں شمار نہیں ہو سکتے استفتا کیا جائے ایں چہ بوالعجبی؟ لہذا خاکسار اکمل صاحب کے جواب کو شہادت القرآن کا جواب نہیں کہہ سکتا۔

بنا بریں مجھے اکمل صاحب کی کتاب کا جواب دینے کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ شہادت القرآن کی دوسری طبع نہایت عجلت وقلت فرصت اور کثرت سفر کی حالت میں ہوئی اور اس کے حاشیہ پر قادیانی کتاب کے متعلق ریمارک نہیں ہو سکے اور اب تیسری طبع پھر ہونے والی ہے۔ اس لئے مناسب جانا کہ ان شبہات کو بھی اٹھا دوں جو اکمل صاحب کو شہادت القرآن کے نہ سمجھنے کے سبب پڑے ہیں تا کہ شہادت القرآن کے لطائف اور زیادہ ظاہر ہوں اور پیر کہن سال مولوی محمد احسن صاحب امروہوی قادیانی کی وہ رائے درست ثابت ہو جو انہوں نے مولوی فیروز الدین صاحب فیروز ڈسکوی مرحوم کو مرزا صاحب کی زندگی میں سیالکوٹ میں ان سے سوال کے جواب میں کہی تھی کہ اگر شہادت القرآن کا جواب لکھا جائے۔ تو اس کی حیثیت اور بڑھ جائے گی۔ سو میں اس جواب الجواب کا نام جو بیشتر حاشیہ پر ہوگا۔ سعادت الاقران بکشف بعض لطائف شہادت القرآن رکھتا ہوں اور ہر امر سہل وصعب میں خدائے کریم سے توفیق چاہتا ہوں۔

راقم آپ کا صادق
ابو تمیم محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

شہادت القرآن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِی عَنَتْ لِجَلَالِ عِزَّتِہٖ وُجُوْہُ الْاَبْطَالِ بِالذُّلِ وَالْاِبْتِھَالِ۔ وَتَخَشَّعَتْ لِکَمَالِ حِکْمَتِہٖ اَعْنَاقُ اَکَابِرِ الرِّجَالِ۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ بِغَیْرِ احْتِیَاجٍ وَّ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ بِلَامِزَاجٍ وَّعِلَاجٍ۔ اَعَزُّ لَدَیْہِ مَاْوَی الْمُرْتَضِیْنَ وَالْمُلْتَجِیْنَ اِلَیْہِ۔ وَاَکْرَمَ مَثْوَی الْمُنْقَطِعِیْنَ اِلَیْہِ وَالْمُتَوَکِّلِیْنَ عَلَیْہِ۔ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ وَّلَا یُعْجِزُہٗ شَیْءٌ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ۔ لَا یُعَقِّبُ عَلٰی مَایَحْکُمُ وَلَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ اَرْسَلَ الرُّسُلَ بِالْحَقِّ وَاَنْطَقَھُمْ بِالصِّدْقِ فَاَوْضَحَ الْمَحَجَّۃَ وَلَمْ یَدَعْ لِاَحَدٍ الْحُجَّۃَ۔ فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی جَمِیْعِھِمْ وَسَلَّمَ۔ اِنَّہٗ وَلِیُّ النِّعَمِ وَ رَبُّ الْکَرَمِ خُصُوْصًا عَلٰی خِیَرَتِھِمْ وَ صَفْوَتِھِمْ اَلْمَخْصُوْصِ بِعُمُوْمِ الدَّعْوَۃِ وَ خِتَامِ النُّبُوَّۃِ۔ اَلَّذِی نَصَبَ مَعَالِمَ الْھُدٰی لِلْوَرٰی وَرَقٰی فِی مَدَارِکِ الْعُلَاءِ وَمَعَارِجِ السَّمَآءِ اِلَی الْغَایَۃِ الْقُصْوٰی۔ اَخْبَرَبِمَا یَکُوْنُ مِنَ الْغَیْمُوْرِ بِالْفِتَنِ وَالشُّرُوْرِ۔ وَمُحْدِثَاتِ الْاُمُوْرِ۔ وَاخْتَارَ اللّٰہُ لِتَصْدِیْقِہٖ کَلِمَتَہُ الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ الَّذِی یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ بِالْحُکْمِ وَالْعَلَمِ۔ وَ عَلٰی اٰلِہِ الْاَطْھَارِ وَ خُلَفَآئِہٖ سَادَۃِ الْاَبْرَارِ الَّذِیْنَ بَلَّغُوْا عَنْہُ بِاللِّسَانِ

وَالسِّنَانِ وَالْقَلَمِ. وَ ضَرَبُوْا اَعْنَاقَ الْجَبَابِرَةِ وَالدَّجَاجِلَةِ اُوْلِی الْكَبَائِرِ وَالْوَخَمِ. فَمَنِ اقْتَدٰی بِهِمْ فَقَدْ رَشَدَ وَاهْتَدٰی. وَ مَنِ ابْتَغٰی غَيْرَ سَبِيْلِهِمْ فَقَدْ ضَلَّ وَ غَوٰی.

تمہید:

اَمَّا بَعْدُ: پس بندہ ضعیف کی خلیل اللہ الحنیف محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ارباب فطنت و تحقیق واصحاب خبرت و تدقیق کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اس زمانِ غی و طغیان میں ہر شخص جداگانہ مذہب و طریقہ بنائے بیٹھا ہے اور اسی میں فلاح عقبیٰ اور صلاح دنیا سمجھتا ہے۔ ظلمت فلسفہ ان پر ایسی چھائی ہے کہ اپنے خیالات مخترعہ کی تصدیق کے لئے نہ تو کتاب آسمانی کی ضرورت سمجھتے ہیں اور نہ قائد ربانی حکیم حقانی رسول یزدانی صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان وافی کی حاجت۔ باوجود قلت بضاعت اور قصور باع میدان اجتہاد کے شہسوار بنتے ہیں اور انہیں اوہام باطلہ اور وساوسِ عاطلہ پر نجات کے متمنی۔ ایسے ہی لوگوں کے مناسب حال کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

وَكُلٌّ يَدَّعِی وَصْلاً لِلَيْلٰی وَ لَيْلٰی لَاتُقِرُّلَهُمْ بِذَاكَا

''یعنی ہر کوئی لیلیٰ کے وصل کا مدعی ہے۔ لیکن لیلیٰ کا ان میں سے کسی سے بھی اقرار نہیں۔''

ہر ایک اپنے لئے الگ مسلک بنائے ہوئے ہے اور سلف صالحینؒ کے مسلک کی اتباع کو' جن کے بار احسان سے ہم کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے' چھوڑے ہوئے ہے اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ. حتی کہ اسلام کو اصول و شرائع سے ناواقف بتاتے اور خود وحی و الہام کے دعاوی باطلہ جگاتے ہیں۔ چنانچہ حال میں مرزا غلام احمد صاحب ساکن قادیان ضلع گورداسپور نے اپنے لئے مسند مسیحی تجویز کی اور رفتہ رفتہ منبر محمدیت[1]

---

[1] دیکھو تریاق القلوب مصنفہ مرزا صاحب۔ شعر

منم مسیح زمان و منم کلیم خدا منم محمد و احمد کہ مجتبیٰ باشد

پر جا براجے اور پھر ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ عوام کالانعام کو یہ دھوکا دیا۔ کہ قرآن شریف کے کسی مقام سے ثابت نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام اسی جسم خاکی کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ قرآن شریف کے کئی مقامات میں مسیح کے فوت ہو جانے کا صریح ذکر ہے۔[2]

جب ان لوگوں کو کوئی پچھلی تفسیر بتائیں تو اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْن کہہ کر جھٹ انکار کر دیتے ہیں۔ اور اگر ان کے روبرو حدیث نبویؐ پڑھیں تو اسے بوجہ بے علمی مخالف و معارضِ قرآن بنا کر دور پھینک دیتے ہیں اور اپنی تفسیر بالرائے کو جو حقیقت میں تحریف و تاویل منہی عنہ ہوتی ہے۔ مؤید بالقرآن کہتے ہیں۔ بیچارے کم علم لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور ورطہ ترددات وگرداب شبہات میں گھر جاتے ہیں۔

وَلَئِنْ فَسَحَ اللّٰهُ فِيْ مُدَّتِيْ وَ وَفَّقَنِيْ بِمَزِيْدِ كَرَمِهٖ لَاُصَنِّفَنَّ فِي التَّوْفِيْقِ بَيْنَ الْحَدِيْثِ وَالْقُرْاٰنِ رِسَالَةً تَرْوِي الْغَلِيْلَ وَتَشْفِي الْعَلِيْلَ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

''اور اگر خدا نے عمر میری بڑھائی اور اپنے مزید کرم سے توفیق بخشی تو میں قرآن و حدیث کی موافقت میں ایک ایسا رسالہ لکھوں گا جو پیاسے کو سیراب کر دے اور بیمار کو شفا دے دے اور میں اسے خدا کی توفیق کے سوا انجام نہیں دے سکتا۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میری باطنی توجہ ہے۔''[3]

---

[1] دیکھو دافع البلاء مصنفہ مرزا صاحب۔ ۱۲ منہ۔

[2] دیکھو ازالہ اوہام مصنفہ مرزا صاحب طبع اول صفحہ ۶۴۳۔ طبع سوم صفحہ ۱۹ و ۲۰۔

[3] خدا کے کرم سے یہ مضمون تائید القرآن میں صفحہ ۱۵۳ سے صفحہ ۱۹۰ تک مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔ ۱۲ منہ۔

سوا ایسے شبہات کے وقت میں اللہ عزیز وحکیم نے مجھ عاجز کو محض اپنے فضل وکرم سے راہ حق کی ہدایت کی اور ہر طرح سے ظاہراً و باطناً معقولاً و منقولاً مسئلہ حقہ سمجھا دیا۔

مصنف کے بعض خواب

خواب نمبر ❶ :۔

چنانچہ شروع جوانی ۱۸۹۱ء میں (جب میں انگریزی سکول میں پڑھتا تھا) حضرت مسیح علیہ السلام کی زیارت بابرکت سے مشرف ہوا۔ اس طرح کہ آپ ایک گاڑی پر سوار ہیں اور بندہ اس کو آگے سے کھینچ رہا ہے۔ اس حالتِ باسعادت میں آپ سے مرزا صاحب قادیانی کے دعویٰ کی نسبت عرض کی۔ آپ نے زبانِ وحی ترجمان سے بالفاظ طیبہ یوں جواب فرمایا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں اللہ تعالیٰ اس کو جلد ہلاک کر دے گا[1]

بوجہ چند امور کے اس اشتیاق کو جب میں رکھے ہوئے انگریزی تعلیم پاتا رہا۔ دفعۃً ۱۸۹۶ء میں قائد ازلی کے اشارے سے تمنائے قلبی کو پورا کرنے کے لئے کالج[2] چھوڑ دیا اور بہمہ تن علوم عربیہ کے حاصل کرنے میں معروف ہو گیا۔ الحمد للہ کہ تھوڑی مدت میں جو کچھ مقدر تھا بھر پایا۔

خواب نمبر ❷ :۔

ان دنوں مرزا صاحب قادیانی کا بہت چرچا تھا اور انہوں نے مسئلہ حیات و وفات عیسیٰ کو بنائے دعویٰ قرار دے رکھا تھا۔ اس لئے خاکسار نے مسئلہ حیات

---

1. چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں بعارضہ ہیضہ عالم جزا کو سدھارے۔۱۲ منہ۔
2. خاکسار اس وقت ایف۔اے کے پہلے سال میں تھا۔۱۲ منہ۔

ونزول مسیح علیہ السلام کو کتب تفسیر وحدیث سے تحقیق کرنا شروع کیا تو سب کو رفع آسمانی اور نزول بار ثانی پر متفق پایا۔ مگر جب اس فرقہ کا یہ طریقہ دیکھا کہ وہ تفاسیر واحادیث کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں تو اتماماً للحجہ صرف قرآن شریف ہی سے مسائل زیر نزاع کو حل کرنا شروع کیا۔ سو الحمد للہ کہ دامن مراد کو گوہر مقصود سے بھر لیا۔ اور علوم عقلیہ کے ہر نا معقول اعتراض کو محض قرآن کریم ہی سے دفع کیا۔ جب علوم ظاہریہ سے عقیدۂ حیات ونزول حضرت مسیح علیہ السلام کو صحیح ثابت کر لیا۔ تو پھر باطنی طور پر فیضان الٰہی کا کرشمہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ شعبان ۱۳۱۹ھ میں جب حفظ قرآن شریف میں مشغول تھا[1] ایک رات بکمال تضرع وابتہال درگاہ ایزد متعال میں عرض پرداز ہوا۔ کہ خداوندا! اس امر میں جو کچھ تیرے نزدیک حق ہے مجھے دکھا' اور اس کی قبولیت وپیروی کی توفیق عطا فرما۔ پس خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت سفید کاغذ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف سے جس پر الفاظ اِنَّ عِیْسٰی حَیٌّ فِی السَّمَآءِ وَ سَیَنْزِلُ عِنْدَ قُرْبِ السَّاعَةِ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بے شک آسمان میں زندہ موجود ہیں۔ اور وہ قیامت کے قریب ضرور اتریں گے) مکتوب تھے۔ میرے سامنے کیا گیا[2]۔ اس رویائے حقہ سے بندہ کا سینہ باغ باغ ہو گیا اور نور اور معرفت کے پھولوں سے بھر گیا۔

القصہ ۱۹۰۲ء میں شہر سیالکوٹ میں بمواقع کثیرہ بعض احباب کے اصرار سے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات فی السماء کو مع دیگر مسائل (معراج وغیرہ) بخصوص قرآنیہ بیان کیا۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے منکرین کو بالکل پست کر دیا۔ اور

---

[1] الحمد للہ کہ اس کے فضل وتوفیق سے اس وظیفہ کے جاری رکھنے تک جو کہ آنحضرت ﷺ نے حفظ قرآن کے لئے علیؓ کو فرمایا تھا۔ (ترمذی) میں نے صرف ایک مہینہ میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ والحمد للہ ۱۲ منہ۔

[2] کیفیت یہ تھی کہ وہ کاغذ عالم غیب سے میری آنکھوں کی اونچائی کے برابر میرے سامنے آیا۔ اور سوائے دست قدرت کے کوئی اس کو تھامنے والا نہیں تھا۔ ۱۲ منہ

بہت سے مذبذبین اور متردین کو شاہراہ عقیدت پر چلایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے شہروں میں آوازہ بلند ہوا اور خطوط طلبی آنے لگے۔ بندہ نے سمجھا کہ حضرت عیسیٰ کی گاڑی کو چلانے والا خواب سچا ہوا چاہتا ہے لہٰذا برادران دینی کی استدعا کو بسرو چشم منظور کر کے محض تبلیغ دین کے لئے کئی سفر کیے چنانچہ وزیر آباد اور ضلع گجرات۔ شہر جہلم۔ شہر راولپنڈی۔ امرت سر اور پشاور میں سفر کر کے اس قدر وعظ کیے کہ اکثر لوگ مطمئن ہو گئے اور بعض مرزائی تائب ہو گئے۔ فرقۂ مرزائیہ کے بعض مدعیان علم سے پسرور۔ سیالکوٹ۔ وزیر آباد۔ کھاریاں موضع کملا (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات پنجاب) اور شہر جہلم[1] میں مباحثات ومناظرات بھی ہوئے۔ ان سب مواضع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ (خاکسار) کو غلبہ دیا اور مخالفین کو حجت میں مغلوب کیا چنانچہ بعض کو ہلاک[2] کیا اور بعض کو بیماری[3] میں مبتلا کیا اور بعض کو ندامت[4] کے دریا میں غرق کیا۔ جہلم میں (مرزا صاحب) قادیانی کے[5] سامنے کھڑے ہو کر صدہا مسلمانوں کے درمیان مسئلہ حیات ورفع مسیح علیہ السلام صرف قرآن شریف سے بیان کیا اور مرزا صاحب کو زبانی وتحریری طور پر تحقیق حق کی طرف دعوت بھی

---

1. شہادت القرآن کی تصنیف کے بعد بھی کئی ایک مقامات پر قادیانی علما سے مباحثات ہوئے۔ مثلاً چنیوٹ۔ لاہور۔ مونگیر (بہار) گوجرانوالہ۔ ڈیرہ بابا نانک صاحب۔ ان سب مقامات پر خدا تعالیٰ نے خاکسار کی مدد کی اور نمایاں فتح دی۔ ۱۲ منہ
2. مثلاً مولوی قائم الدین صاحب سیالکوٹی اور شیخ چراغ دین صاحب گجراتی۔ ۱۲
3. مثلاً مولوی مبارک علی صاحب کو مباحثہ جہلم میں۔
4. مثلاً مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی کو پسرور میں اور فضل دین صاحب کو کھاریاں میں۔
5. جب مرزا صاحب مولوی کرم الدین صاحب کے استغاثہ پر جہلم میں تاریخ مقدمہ پر گئے تھے۔ ۱۲ منہ

دی۔ مگر وہ اس پر ہاں نہ کر سکے پر نہ کر سکے اور اب بھی نہ کر سکیں گے۔[1] ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وجہ تصنیف:

آخر الامر صدر پشاور کے ایک مخلص دوست[2] کے مشورہ سے اس مضمون کو قلمبند کیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ گم گشتگان بادیۂ ضلالت کو قادیانی عقائد سے بچا کر شاہراہ عقیدت پر لائے۔ اور نیز ہر محقق کے پاس دلائل ساطعہ و براہین قاطعہ کا مجموعہ موجود رہے۔

اس کتاب میں تین مقدمات اور ایک تنبیہ اور دو فصلیں ہیں۔ مقدمۂ اولیٰ در امکان معجزات۔ مقدمہ ثانیہ در تشریح سنۃ اللہ۔ مقدمہ ثالثہ در خصائص حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ تنبیہ در بیان طریق استدلال مصنف۔ فصل اول در بیان عدم مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام۔ اس کا نام ضَرْبٌ بِالْيَمِيْنِ لِكَسْرِ صَلِيْبِ الْمُلْحِدِيْنَ ہے۔ فصل ثانی در اثبات حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام و رفع جسمی۔

سو اس کتاب کو اللہ تعالیٰ ودود کے نام سے شروع کرتا ہوں اور ہر امر سہل و صعب میں صرف اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وَالْاِلْتِمَاسُ مِنْ كِرَامِ النَّاسِ اَنْ يَّعْفُوا الزَّلَلَ وَيَسُدُّوا الْخَلَلَ لِاَنَّ جُهْدَ الْمُقِلِّ مَشْكُوْرٌ وَّ بَاذِلُ الْوُسْعِ مَعْذُوْرٌ وَ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ وَهُوَ حَسْبِيْ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ

---

[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا تا دم حیات طاقت نہ ہوئی۔ بلکہ جس روز مرزا صاحب لاہور میں فوت ہوئے اس سے ایک روز پیشتر ان کو میری طرف سے بوساطت ڈاکٹر ایم۔ اے سعید صاحب دعوت مناظرہ کا خط پہنچ چکا تھا۔ وہ خط کیا تھا۔ گویا پیام اجل تھا کہ دوسرے روز مرزا صاحب فوت ہوگئے۔ ۱۲ منہ

[2] ڈاکٹر سید ابو محمد جمال الدین صاحب مقیم پشاور (رحمہ اللہ) ۱۲ منہ۔

وَاغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ اَنْتَ رَبِّیْ وَاَنْتَ حَسْبِیْ وَ اَنْتَ لِیْ نِعْمَ الْمُعِیْنَ.

خاکسار

ابو تمیم محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

مقدمہ[1] اُولیٰ

دربیانِ امکانِ خرقِ عادت

خرقِ عادت (معجزہ و کرامت) کے متعلق مدت سے اختلاف چلا آتا ہے کہ آیا یہ ممکن ہے یا نہیں۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ اس کارخانہ قدرت میں جو کچھ ہم روزمرہ دیکھ رہے ہیں اور اس کا جو نظام ہم سمجھ چکے ہیں۔ اس کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ خدائے قدیر سب کچھ کرسکتا ہے' مگر اس کے افعال اس نظام سے باہر نہیں ہیں۔ اگر کوئی بات قرآن و صحیح حدیث میں اس کے برخلاف وارد ہو تو اس کی تاویل کی جائے گی۔ اور ظاہری معنی نہ لئے جائیں گے۔

ان کے مقابلہ میں دوسرا فریق ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم مقدورات باری کا احاطہ نہیں کرسکتے اور نہ قوانین قدرت پر ہمیں پوری اطلاع ہے۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ نظام قدرت کے سمجھنے کا دعویٰ تو اس صورت میں کریں۔ کہ اس کا اجرا ہمارے ہاتھ میں ہو۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا[2] (پ۵: نساء) ہماری بنا ہے اور وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ[3] (پ۳: بقرہ) ہماری بساط۔ جب قدسیانِ درگاہ سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ

---

[1] مقدمہ بکسر الدال المشددۃ و بفتحها ايضا (ملاجلال و میر زاہد) وقال الزمخشری فی الفائق المقدمة الجماعة التی تقدم الجيش من قدم بمعنی تقدم واستعيرت لاول کل شیء فقيل منه مقدمة الكتاب و مقدمة الكلام و فتح الدال خلف (ص ۲۰) ۱۲ منہ

[2] انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے۔ ۱۲ منہ

[3] خدا کے علم میں کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر اسی قدر جتنا وہ چاہے۔

شہادت القرآن

الحکیم[1] (پ البقرہ) پکار اٹھے تو ہم کون ہیں کہ اس کی حکمتوں کے احاطہ کا دعویٰ کر سکیں؟ خواجہ حافظ صاحب اسی معنی میں فرماتے ہیں:۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

مرزا صاحب قادیانی دعوائے مسیحیت سے پہلے تو اس دوسرے فریق کے ساتھ تھے۔ جیسا کہ ان کی کتاب ''سرمہ چشم آریہ'' کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ لیکن جب مسیحیت کا دعویٰ کرنے کی سوجھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و رفع سماوی رستے میں حائل نظر آئی۔ تو پڑی ہموار کرنے کے لئے جھٹ پہلے فریق کے ساتھ ہو گئے۔

معشوق ما بمذہب ہر کس برابر است — با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

چنانچہ مرزا صاحب اپنی بنیادی کتاب ''ازالہ اوہام'' میں فرماتے ہیں:۔

ماسوا اس کے اور کئی طریق سے ان پرانے خیالات پر سخت سخت اعتراض عقل کے وارد ہوتے ہیں' از انجملہ ایک یہ اعتراض ہے۔ کہ نیا اور پرانا فلسفہ بالاتفاق اس بات کو محال ثابت کرتا ہے کہ کوئی انسان اپنے اس جسم خاکی کے ساتھ کرۂ زمہریر تک بھی پہنچ سکے۔''

(ازالہ طبع اول تقطیع خورد ص ۴۵)

حالانکہ جناب مرزا صاحب آنجہانی دعوائے مسیحیت سے پہلے سالہا سال تک عیسیٰ علیہ السلام کے نزول آسمانی کے برابر قائل رہے۔ اور اپنی تصانیف میں جبکہ آپ کو الہام کا بھی دعویٰ تھا۔ اس کی تصریح کرتے رہے۔ چنانچہ ''براہین احمدیہ'' میں فرماتے ہیں:۔

''اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق و اقطار میں پھیل

---

[1] خداوندا تو پاک ہے۔ ہمیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھا دیا کچھ بھی معلوم نہیں بیشک تو ہی علیم (کل) اور حکیم (مطلق) ہے۔ ۱۲ منہ

جائے گا۔[1]"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع سماوی اور آمد ثانی قرآن و حدیث کی رو سے محال و غلط ثابت نہیں ہوئی بلکہ اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھنے کے لئے زمین صاف کی ہے۔

ھدایت:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں ایک ایسا امر ودیعت کر رکھا ہے جو اسے ہر امر کی لم (کیوں؟) اور کیف (کس طرح؟) کی نسبت سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ سوال دو طرح پر ہوتا ہے' اوّل استفسارا جس کو دوسرے لفظوں میں اطمینان قلب کے لئے کہنا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے احیائے موتیٰ کی کیفیت کی نسبت یہ سوال کیا تھا:۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (پ ۳۔ رکوع ۳ بقرہ)

"خداوند! مجھے دکھا کر تو کس طرح مردوں کو جلا کھڑا کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا! تو اس پر ایمان نہیں رکھتا؟ (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے) کہا! کیوں نہیں! لیکن اس لئے (دریافت کرتا ہوں) کہ میرے دل کو (عینی شہادت سے) اطمینان ہو جائے۔" (۲۶:۲)

اسی لئے امام بخاری علیہ رحمۃ اللہ الباری نے اس آیت کو اپنی صحیح میں ایمان کے کم و زیادہ ہونے کی دلیل میں پیش کیا ہے۔

دوم اس طرح کہ جس امر کی بابت سوال ہے اس کی نسبت دل غبار شبہات سے مکدر ہے۔ جیسا کہ منکرین حشر اجساد قیامت کی نسبت استبعادی سوال کرتے ہیں:

---

[1] براہین احمدیہ مصنفہ مرزا صاحب قادیانی حصہ چہارم صفحہ ۴۹۸ بضمن حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳۔ ۱۲ منہ

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (پ۲۳:یٰس)

یعنی "وہ (کافر) انسان کہتا ہے کہ ان ہڈیوں کو ان کے بوسیدہ ہونے پر کون زندہ کرے گا؟" (۳۶:۷۸)

سو پہلی صورت تو مدارج ایمانیہ میں سے ہے' اور دوسری کفر و ضلالت۔

ارشاد

چونکہ معجزہ اور کرامت کی نسبت ایک زمانہ وساوس میں قصور علم و فتور ایمان کے سبب مبتلا ہو رہا ہے۔ کوئی تو پہلی صورت میں زیادت علم اور جواب منکرین کے لئے تحقیقات میں لگا ہے۔ اور کوئی دوسری صورت میں شبہات میں پھنس کر انکار پر مصر ہے۔ کوتاہ اندیش انسان' خدا کی قدرت کے ناپیدا کنار سمندر کو چلوؤں سے ماپنا چاہتا ہے۔

اور "ایاز قدر خود بشناس" کی نصیحت کو سامنے نہیں رکھتا۔ اس لئے خاکسار نے مناسب جانا کہ بقدر اس وسعت و ہمت کے جو مجھے خداوند تعالیٰ نے عطا کی ہے' جہالت و غلط فہمی کے پردے کو اٹھا کر کشف حقیقت کر دوں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ۔

سو معلوم ہو کہ فلاسفہ کی طرف سے جو اعتراض تمام مادی و فعلی خوارق عادات پر آ سکتا ہے اس کی بنا علت و معلول' سبب و مسبب' اور خواص اشیا کے مسئلہ پر ہے۔ جو فلسفی خرق عادت کے منکر ہیں' وہ کہتے ہیں کہ یہ کارخانہ قدرت تمام کا تمام سلسلۂ علت و معلول۔ سبب و مسبب' تاثیر و تاثر سے وابستہ ہے' آگ جلاتی ہے' مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے' پانی تر کرتا ہے' کوئی چیز بغیر علت و سبب کے وجود میں نہیں آ سکتی' اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ علت تامہ موجود ہو اور معلول نہ پایا جائے' اور معجزہ اور کرامت کے مان لینے سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی چیز بغیر سبب و علت (معتادہ) کے وجود میں آ گئی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بلا باپ۔ یا اس کی ماہیت بدل گئی' جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن گیا' یا غیر علت علت بن گئی' جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو اس پتھر سے پانی

پھوٹ پڑا۔ یا یہ کہ کسی چیز کی خاصیت موجود ہوتے وہ اپنے فعل سے بیکار رہ گئی' مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جلتی آگ میں ڈالے گئے۔ لیکن جلے نہیں' وغیرہ ذالک۔

بس یہی ایک اصولی و جامع اعتراض ہے جو تمام فعلی و مادی معجزات و کرامات پر وارد ہوسکتا ہے۔ اور جس کے حل ہونے پر اس کا حل موقوف ہے۔

حل:

خدائے قدیر نے نظامِ عالم ایسا مضبوط بنایا ہے کہ ہم اسے توڑ نہیں سکتے اور نہ اس نے اشیا میں ایسے خواص رکھے ہیں کہ وہ ان سے منفک نہیں کیے جاسکتے۔ لیکن یہ بھی تو اسی نظام میں سے ہے کہ اس نے ایک چیز کے مقابلہ میں دوسری اس کی ضد بنائی ہے۔ جو پہلی کے اثر کو باطل کر دیتی ہے۔ اور یہ اضداد کچھ تو ہمارے علم میں آ گئی ہیں' اور جو علم میں نہیں آئیں وہ بہت زیادہ ہیں' اور کسی شے کی جو علت ہمارے علم میں آ چکی ہے ضرور نہیں کہ کارخانہ قدرت میں اس کی وہی علت ہو اور اس کے علاوہ دیگر کوئی نہ ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی ہو۔ پس اتنے ناقص علم کی بنا پر سلسلۂ کائنات کے احاطہ کا دعویٰ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔

حقیقت میں سلسلۂ علت و معلول اور سبب و مسبب ایک ایسا پیچیدہ گورکھ دھندا ہے کہ اس کی پیچیدگیوں کو کھولنا نہایت ہی دشوار ہے' کیونکہ جو کچھ انسان کے علم میں آیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اور جو اس سے پوشیدہ ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں[1]

---

[1] مولانا شبلی مرحوم الکلام میں لکھتے ہیں "۱۸۹۱ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کے ایک جلسہ میں پروفیسر لودج نے جو بہت بڑا ریاضی دان ہے۔ ایک لیکچر دیا' اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا کہ "اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مادی اور روحانی عالم میں اب تک جو حد فاصل تھی وہ ٹوٹ جائے۔ جس طرح اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں' اس طریقہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ممکنات کی کچھ انتہا نہیں اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں' وہ بمقابلہ ان چیزوں کے جو ہم کو معلوم نہیں ہیں کچھ بھی نسبت نہیں رکھتا۔" (الکلام حصہ دوم ص ۱۲۳) ۱۲ منہ

پس محدود سے بے حد پر رائے لگانی درست نہیں

اے گرفتار سبب از مسبب غافلی — سوئے ایں روتاب' ازاں سوماکلی

امام غزالیؒ نے ایک کتاب بنام تہافتہ الفلاسفہ لکھی ہے' اس میں اصولی طور پر بقدر ضرورت فلسفیوں کے تمام علوم کا ذکر کر کے ان میں سے چار مسئلے مخالف اسلام قرار دیے ہیں' ایک یہ ہے۔ جس کا ذکر ہم علت و معلول یا سبب و مسبب کے نام سے کر رہے ہیں۔ چنانچہ امام ممدوح فرماتے ہیں:۔

وَاِنَّمَا نُخَالِفُهُمْ مِنْ جُمْلَةِ هٰذِهِ الْعُلُوْمِ فِیْ اَرْبَعَةِ مَسَائِلَ (اَلْاُوْلٰی) حُکْمُهُمْ بِاَنَّ هٰذَا الْاِقْتِرَانَ الْمُشَاهَدَ فِی الْوُجُوْدِ بَیْنَ الْاَسْبَابِ وَ الْمُسَبَّبَاتِ اِقْتِرَانُ تَلَازُمٍ بِالضَّرُوْرَةِ فَلَیْسَ فِی الْمَقْدُوْرِ وَلَا فِی الْاِمْکَانِ اِیْجَادُ السَّبَبِ دُوْنَ الْمُسَبَّبِ وَلَا وُجُوْدُ الْمُسَبَّبِ دُوْنَ السَّبَبِ وَاَثَرُ هٰذَهِ الْاِخْتِلَافِ یَظْهَرُ فِیْ جَمِیْعِ الطَّبِیْعِیَّاتِ (ص ۶۴)

''ہم ان (فلسفیوں) سے ان علوم میں سے صرف چار مسائل میں مخالفت کرتے ہیں' پہلا مسئلہ یہ کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اقتران جو اسباب و مسببات میں دیکھا جاتا ہے ضروری و لازمی ہے پس ممکن نہیں کہ کوئی سبب بغیر مسبب کے موجود ہو یا کوئی مسبب بغیر سبب کے پایا جائے اور اس اختلاف کا اثر جمیع طبعیات میں ظاہر ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ہر چہار اختلافی مسائل کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

وَیَلْزِمُ النِّزَاعَ فِی الْاُوْلٰی مِنْ حَیْثُ اِنَّهٗ یَنْبَغِیْ عَلَیْهَا اِثْبَاتُ الْمُعْجِزَاتِ الْخَارِقَةِ لِلْعَادَةِ مِنْ قَلْبِ الْعَصَا ثُعْبَانًا وَ اِحْیَاءِ الْمَوْتٰی وَشَقِّ الْقَمَرِ وَ مَنْ جَعَلَ مَجَارِیَ الْعَادَاتِ لَازِمَةً لُزُوْمًا ضَرُوْرِیًّا اَحَالَ جَمِیْعَ ذٰلِکَ وَ اَوَّلُوْا مَا فِی الْقُرْآنِ مِنْ اِحْیَاءِ الْمَوْتٰی وَقَالُوْا اَرَادَ بِهٖ اِزَالَةَ مَوْتِ الْجَهْلِ بِحَیَاتِ الْعِلْمِ

وَ اَوَّلُوا تَلَقُّفَ الْعَصَا لِسِحْرِ السَّحَرَةِ بِإِبْطَالِ الْحُجَّةِ الْإِلٰهِيَّةِ الظَّاهِرَةِ عَلٰى يَدِ مُوْسٰى شُبُهَاتِ الْمُنْكِرِيْنَ وَ اَمَّا شَقُّ الْقَمَرِ فَرُبَّمَا اَنْكَرُوْا وُجُوْدَهٗ وَ زَعَمُوْا اَنَّهٗ لَمْ يَتَوَاتَرْ (ص ۶۵)

"پہلے مسئلہ سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی بنا پر معجزات کا اثبات نہیں ہو سکتا جو عادت کے خلاف ہوتے ہیں' یعنی عصا کا سانپ بن جانا' اور مردوں کا زندہ ہو جانا اور چاند کا پھٹ جانا اور جو ان امور عادیہ کو ضروری و لازم گردانتے ہیں وہ ان سب کو محال جانتے ہیں اور قرآن شریف میں مردوں کے زندہ ہونے کی بابت جو کچھ وارد ہوا ہے اس کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد جہالت کی موت کو علم کی زندگی سے زائل کرنا مراد ہے۔ اور جادوگروں کے جادو کو (موسیٰ کے) سونٹے کے نگل جانے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حجت نے جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئی منکرین کے شبہات کو باطل کر دیا۔ باقی رہا شق القمر سو کبھی تو اس کا انکار ہی کر دیتے ہیں کہ یہ خبر متواتر نہیں۔"

علمائے اسلام نے فلسفیوں کے اس اعتراض کے جواب میں دو طریق اختیار کیے ہیں:

طریق اوّل کا بیان یہ ہے کہ اسلام نے تمام مسببات و معلولات کی حقیقی علت ارادۂ خداوندی کو قرار دیا ہے۔ اور تمام عالم کو اس کے امر تکوینی کا محل تصرف اور مظہر قدرت گردانا ہے' اور بغیر اس کے کسی سبب و علت میں قدرت موثرہ تسلیم نہیں کی چنانچہ فرمایا:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ.

(اعراف ۷:پ ۸:۵۴)

"یعنی خلق و امر صرف ذات باری کا خاصہ ہے وہ رب العلمین بہت

برکت و عظمت والا ہے۔"

امام رازیؒ نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:۔

اِحْتَجَّ اَصْحَابُنَا بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ عَلٰى اَنَّهٗ لَامُوْجِدَ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ. (تفسیر کبیر جلد چہارم ص ۲۳۹)

"ہمارے اصحاب (اہلسنت) نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ خدا کے سوا کوئی موثر و موجد نہیں ہے۔"

اسی کے مطابق امام غزالیؒ نے یہ جواب دیا ہے:۔

(مسئلہ ۱۷) اَلْاِقْتِرَانُ بَيْنَ مَا يُعْتَقَدُ فِي الْعَادَةِ سَبَبًا وَمَا يُعْتَقَدُ مُسَبَّبًا لَيْسَ ضَرُوْرِيًّا عِنْدَنَا بَلْ كُلُّ شَيْئَيْنِ لَيْسَ هٰذَا ذَاكَ وَلَا ذَاكَ هٰذَا وَلَا اِثْبَاتُ اَحَدِهِمَا مُتَضَمِّنٌ لِاِثْبَاتِ الْاٰخَرِ وَلَا نَفْيُهٗ مُتَضَمِّنٌ لِنَفْيِ الْاٰخَرِ فَلَيْسَ مِنْ ضَرُوْرَةِ وُجُوْدِ اَحَدِهِمَا وُجُوْدُ الْاٰخَرِ وَلَا مِنْ ضَرُوْرَةِ عَدَمِ اَحَدِهِمَا عَدَمُ الْاٰخَرِ.

(تہافۃ الفلاسفہ ص ۶۵)

"جس چیز کو عادت میں سبب مانا جاتا ہے۔ اور جس کو سبب سمجھا جاتا ہے ہمارے نزدیک ان میں اقتران ضروری نہیں۔ بلکہ ہر دو میں سے نہ یہ وہ ہے اور نہ وہ یہ (یعنی حقیقت میں نہ تو سبب سبب ہے اور نہ مسبب اس کا مسبب) اور نہ ان میں سے ایک کا اثبات دوسرے کے اثبات کا متضمن ہے۔ اور نہ ایک کی نفی دوسرے کی نفی کی متضمن ہے۔ پس ایک کے وجود سے دوسرے کا وجود ضروری نہیں' اور نہ ایک کے عدم سے دوسرے کا عدم ضروری ہے۔"

امام غزالیؒ نے اس امر کو بہت تفصیل سے مع مثالوں کے بیان کیا ہے جو بخوف طوالت ہم درج نہیں کر سکتے۔

اسی طرح حضرت حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ میں کہا ہے:۔

وَالْقَوْلُ بِالْمُعْجِزَاتِ يَتَوَقَّفُ عَلٰى اِنْكَارِ اللُّزُوْمِ الْعَقْلِيِّ بَيْنَ الْاَسْبَابِ وَالْمُسَبَّبَاتِ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ص۹)

''اور معجزات کا اقرار' اسباب و مسببات میں لزوم عقلی کے انکار پر موقوف ہے۔''

حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اسباب و مسببات میں اقتران بطور تلازم نہیں بلکہ بطور عادت ہے۔ جس کا خرق و خلاف ممکن و جائز ہے۔ لیکن ہر امر کے لئے ارادہ الٰہی شرط ہے۔

دوسرے طریق کا بیان اس طرح ہے کہ معجزات و کرامت اور خوارق عادات کے بھی اسباب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مخفی ہوتے ہیں اور عام انسانی رسائی سے بالا ہوتے ہیں۔ کیونکہ عجائبات قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں اور وہ بالتمام ہمارے احاطۂ علم میں ہیں بھی نہیں۔ پس اگر ہم کو اپنے قصور علم کے سبب کسی امر کی علت معلوم نہیں ہوئی۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعہ میں بھی اس کی علت کوئی نہیں۔ کیونکہ عدم علت اور عدم علم بالعلت میں فرق ہے۔ امام غزالیؒ نے اس طریق پر بھی جواب دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

(اَمَّا الثَّانِيْ) فَهُوَ اَنْ نَقُوْلَ ذَالِکَ يَكُوْنُ بِاَسْبَابٍ وَلٰكِنْ لَيْسَ مِنْ شَرْطِهٖ اَنْ يَّكُوْنَ السَّبَبُ هُوَ الْمَعْهُوْدُ بَلْ فِيْ خِزَانَةِ الْمَقْدُوْرَاتِ عَجَائِبُ وَ غَرَائِبُ لَمْ يُطَّلَعْ عَلَيْهَا يُنْكِرُهَا مَنْ يَظُنُّ اَنْ لَا وُجُوْدَ اِلَّا لِمَا شَاهَدَهٗ كَمَا يُنْكِرُ طَائِفَةُ السِّحْرَ وَالنَّارَ نْجِيَاتِ وَ الطِّلِسْمَاتِ وَالْمُعْجِزَاتِ وَ الْكَرَامَاتِ وَهِيَ ثَابِتَةٌ بِالْاِتِّفَاقِ بِاَسْبَابٍ غَرِيْبَةٍ لَايُطَّلَعُ عَلَيْهَا بَلْ لَوْلَمْ يَرَاِنْسَانُ الْمِقْنَاطِيْسَ وَجَذْبَهٗ لِلْحَدِيْدِ وَ حُكِيَ لَهٗ ذَالِکَ لَا اسْتَنْكَرَهٗ وَقَالَ لَا يُتَصَوَّرُ جَذْبُ الْحَدِيْدِ اِلَّا بِخَيْطٍ يُشَدُّ عَلَيْهِ وَيُجْذَبُ فَاِنَّهُ الْمُشَاهَدُ فِي الْحِسِّ حَتّٰى اِذَا شَاهَدَهٗ تَعَجَّبَ مِنْهُ وَ عَلِمَ

شبہات القرآن

إِنَّهُ قَاصِرٌ عَنِ الْإِحَاطَةِ بِعَجَائِبِ الْقُدْرَةِ (تہافۃ الفلاسفہ ص ۸۸)

''دوسرے طریق کا بیان اس طرح ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اس کے اسباب تو ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اسباب وہی ہوں جو ہمیں معلوم ہیں بلکہ الٰہی خزانوں میں ایسے ایسے عجائبات بھی ہیں۔ جن پر کسی کو اطلاع نہیں۔ ان امور کا انکار وہی کرتا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ صرف وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ جو میرے مشاہدے میں آ جائے۔ جس طرح کہ بعض لوگ سحر (جادو) اور عجوبہ نمائی اور طلسمات اور معجزات اور کرامات کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان سب کا ہونا بالاتفاق ایسے نادر و مخفی اسباب سے ثابت ہے۔ جن پر عام طور پر اطلاع نہیں' بلکہ اگر کسی شخص نے کبھی سنگ مقناطیس کا لوہے کو کھینچنا نہ دیکھا ہو اور اس کے پاس اس بات کا ذکر کیا جائے تو وہ ضرور انکار کرے گا۔ اور کہے گا کہ لوہے کا کھینچا جانا ممکن نہیں' مگر اس صورت میں کہ اس سے ڈورا باندھا جائے اور اسے کھینچا جائے۔ کیونکہ مشاہدے میں یہی آیا ہے' حتیٰ کہ جب وہ اس امر کا مشاہدہ کر لے۔ تو اس سے حیران رہ جائے گا اور سمجھ لے گا کہ میں عجائبات قدرت کے احاطہ کرنے سے قاصر و عاجز ہوں۔''

اسی طرح علامہ خواجہ زادہ نے بھی اپنی کتاب ''تہافۃ الفلاسفۃ'' کی فصل ہشتم میں بحث طبعیات میں اعجوبہ نمائیوں اور اسرار قدرت کی بعض مثالیں جن کے اسباب مخفی یا باریک ہیں بیان کر کے لکھا ہے:۔

وَمَا إِنْكَارُ هٰذَا إِلَّا بِضِيْقِ الْحَوْصَلَةِ وَالْأُنْسِ بِالْمَوْجُوْدَاتِ الْغَالِبَةِ وَالذُّهُوْلِ عَنْ أَسْرَارِ اللّٰهِ تَعَالٰى فِي الْخِلْقَةِ وَمَنْ اِسْتَقْرَأَ عَجَائِبَ الْعُلُوْمِ لَمْ يَسْتَبْعِدْ مِنْ قُدْرَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مَا يُحْكٰى مِنْ مُعْجِزَاتِ الْأَنْبِيَآءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ بِحَالٍ مِنَ الْأَحْوَالِ۔ (ص ۷۵ جلد دوم)

"اور معجزات کا انکار (ایمانی) حوصلہ کی تنگی اور اکثر موجودات سے مانوس ہونے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے اسرار سے غفلت و بے خبری کی وجہ سے ہے اور جو کوئی علوم (عقلیہ) کے عجائبات کا استقراء کرے گا۔ وہ ان امور کو جو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں مروی ہیں ہرگز ہرگز کسی حال میں بھی خدا کی قدرت سے بعید نہیں جانے گا۔"

اسی طرح الشیخ الرئیس بوعلی سینا جو علوم عقلیہ میں اپنے بعد کے مشرقی علما کے مسلم پیشوا و امام ہیں۔ اپنی کتاب اشارات کے اخیر میں معجزات وخوارق عادات کے ذکر کے بعد بعنوان نصیحۃ فرماتے ہیں۔

إِيَّاكَ وَ اَنْ تَكُوْنَ تَكَيُّسُكَ وَ تَبَرُّءُكَ عَنِ الْعَامَّةِ هو ان تَبَرَّءَ مُنْكِرًا لِكُلِّ شَيْءٍ فَذٰلِكَ طَيْشٌ وَ عَجْزٌ وَ لَيْسَ الْخَرْقُ فِيْ تَكْذِيْبِكَ مَالَمْ تَسْتَبِنْ لَكَ بَعْدُ جَلِيَّةٌ دُوْنَ الْخَرْقِ فِي تَصْدِيْقِكَ مَالَمْ تَقُمْ بَيْنَ يَدَيْكَ بَيِّنَةٌ بَلْ عَلَيْكَ الْاِعْتِصَامُ بِحَبْلِ التَّوَقُّفِ وَاِنْ اَزْعَجَكَ اِسْتِنْكَارُ مَايُوعَاهُ سَمْعُكَ مَالَمْ تَتَبَرْهَنْ اِسْتِحَالَتُهٗ[1] لَكَ فَالصَّوَابُ اَنْ تَسْرَحَ اَمْثَالَ ذٰلِكَ اِلٰى بُقْعَةِ الْاِمْكَانِ مَالَمْ يَذُدْكَ عَنْهُ قَائِمُ الْبُرْهَانِ وَاعْلَمْ اَنَّ فِي الطَّبِيْعَةِ عَجَائِبَ وَلِلْقُوَى الْعَالِيَةِ الْفَعَّالَةِ وَالْقُوَى السَّافِلَةِ الْمُنْفَعِلَةِ اِجْتِمَاعَاتٌ عَلٰى غَرَائِبَ[2]

"(اے عقلمند!) تو اس امر سے پرہیز کر کہ عام لوگوں سے تیری ہوشیاری

---

[1] محال دو قسم پر ہے۔ عقلی و عادی عقلی ممتنع ذاتی یعنی ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً اجتماع ضدین اور ارتفاع نقیضین' اور شریک باری' لیکن عادی ممکن بالذات ہوتا ہے۔ اگر علل واسباب موجبہ کے ساتھ خدا کا ارادہ منضم ہو گیا۔ تو وہ صادر و حادث ہو گیا۔ ورنہ نہیں ہوتا۔ مگر اپنی ذات میں ممکن ہی رہتا ہے۔ ۱۲ منہ

[2] شرح اشارات مطبوعہ مصر جلد ۲ص ۱۴۳۔ ۱۲ منہ

و برأت کی امتیازی صورت یہ ہو کہ تو ہر امر سے انکاری بریت کرے کیونکہ یہ طیش و عاجزی ہے اور تجھے جس امر کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی اس کی تکذیب کر دینا اس بات کی تصدیق کرنے سے کم (بے عقلی) نہیں ہے جس کی دلیل تیرے نزدیک قائم نہیں ہوئی بلکہ تجھ پر لازم ہے کہ تو توقف کی رسی سے اپنا بچاؤ کر لے اگرچہ تجھے ان باتوں کا انکار جو تیرے کان میں پڑی ہیں پھسلا دے۔ جب تک کہ تجھے اس کا محال ہونا صاف طور پر واضح نہ ہو جائے۔ پس ٹھیک یہ ہے کہ تو ایسی باتوں کو امکان کے میدان میں لے جائے جب تک کہ تجھے یقینی دلیل وہاں سے نہ روکے اور خوب جان رکھ کہ طبیعت میں بڑے بڑے عجائبات ہیں اور اوپر کے اثر کرنے والے قویٰ اور نیچے کے اثر قبول کرنے والے قویٰ کے اجتماع میں بڑے بڑے نادر نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔''

اس کی توضیح یوں ہے کہ ہم کو دو امر معلوم ہیں۔ اول معلول کا وجود۔ دوم معلول کا بغیر علت کے موجود نہ ہو سکنا۔ اگر معلوم نہیں تو صرف یہ کہ اس معلول کی علت کونسی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ساری علتیں ہمارے علم میں نہیں آ گئیں۔ بلکہ قدرت کے ہزار ہا بلکہ بے شمار ایسے اسرار ہیں۔ جن کی علتیں ہمارے احاطۂ علم اور پرواز ادراک سے پرے ہیں۔ پس اس نقصانِ علم کے ساتھ کسی معلول کی علت کے معلوم نہ ہونے سے اس معلول کے وجود و وقوع سے انکار کرنا اس اصول پر مبنی ہو گا کہ مجہول سے معلوم کا انکار ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ استدلال کا صحیح طریق یہ ہے۔ کہ معلوم سے مجہول کا علم حاصل کیا جائے نہ یہ کہ مجہول کی جہالت کی وجہ سے معلوم کا انکار کیا جائے۔ امام رازیؒ آیت وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (بقرہ پ ۲) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

تَفْسِيْرُهُ أَنَّ الطَّرِيْقَ الْمُسْتَقِيْمَ الْمَعْلُوْمَ هُوَ أَنْ يُسْتَدَلَّ بِالْمَعْلُوْمِ عَلَى الْمَظْنُوْنِ فَأَمَّا الْاِسْتِدْلَالُ بِالْمَظْنُوْنِ عَلَى

اَلْمَعْلُوْمِ فَذَاکَ عَکْسُ الْوَاجِبِ وَ ضِدُّ الْحَقِّ[1]

"اس کی تفسیر یوں ہے کہ سیدھا اور معلوم طریق استدلال یہ ہے کہ معلوم کے ذریعے مظنون کو معلوم کیا جائے اور مظنون سے معلوم (کے انکار) پر استدلال کرنا اس بات کا عکس ہے جو واجب ہے اور حق کی ضد ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ اس نازک مقام پر عدم العلم اور علم العدم میں فرق کرنا واجب ہے اور اسی کے ملحوظ نہ رکھنے سے لوگ غلطی کھاتے ہیں یعنی یہ کہ علت تامہ کا موجود نہ ہونا امر دیگر ہے اور اس کا ہمارے علم سے مخفی ہونا امر دیگر ہے۔[2] اسی اصول کی بنا پر قرآن مجید اپنے منکرین کی نسبت فرماتا ہے:۔

بَلْ کَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ. (یونس پ ۱۱)

"یعنی ان منکرین نے اس شے کو جھٹلایا جس کے علم کا ان کو احاطہ نہیں ہوا۔ اور ابھی تک ان کو اس کی حقیقت یا انجام بھی معلوم نہیں ہوا۔ (۳۹:۱۰)

اسی طرح علامہ ابن رشد مغربی جن کو فلسفہ یونانی کے سمجھنے میں بے مثل مانا گیا ہے۔ اور فرانس وغیرہ ممالک مغرب میں ان کی وفات کے صدیوں بعد تک بھی ان کی تحقیقات پر اضافہ کرنا منع خیال کیا جاتا رہا۔ تہافۃ الفلاسفہ[3] میں فرماتے ہیں:۔

اَمَّا الْکَلَامُ فِی الْمُعْجِزَاتِ فَلَیْسَ فِیْهِ لِلْقُدَمَاءِ مِنَ الْفَلَاسِفَةِ قَوْلٌ لِاَنَّ هٰذِهٖ کَانَتْ عِنْدَهُمْ مِنَ الْاَشْیَاءِ الَّتِیْ لَا یَجِبُ اَنْ یُتَعَرَّضَ

---

[1] تفسیر کبیر جلد دوم ص ۱۵۲۔ ۱۲ منہ

[2] معجزات کے متعلق انشاء اللہ الگ رسالہ لکھوں گا۔ جس میں زمانہ ماضی و زمانہ حال کے فلاسفروں کے اقوال سے امکان ثابت کیا جائے گا۔ ۱۲ منہ

[3] علامہ ابن رشد ۵۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۵۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے یہ کتاب امام غزالیؒ کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ کے مقابلہ میں لکھی ہے جس میں بعض مقامات پر طریق استدلال میں یا الزام خصم میں امام غزالیؒ سے اختلاف کیا ہے۔ ۱۲ منہ

لِلْفَحْصِ عَنْهَا وَ تُجْعَلَ مَسَائِلَ فَإِنَّهَا مَبَادِی الشَّرَائِعِ وَالْفَاحِصُ عَنْهَا وَالْمُشَكِّكُ فِيْهَا يَحْتَاجُ إِلَى عُقُوْبَةٍ عِنْدَهُمْ. (ص۱۲۱)

''معجزات کی بابت تو یہ ہے کہ قدیم فلسفیوں کا (انکاری) قول ان کے متعلق کچھ بھی نہیں' کیونکہ یہ باتیں ان کے نزدیک ان چیزوں میں سے تھیں' جن کے اعمال کی نسبت کرید و پڑتال ان کو مسائل (نظریہ) بنانے کے لئے واجب نہیں تھی کیونکہ یہ شریعتوں کے ابتدائی (مسلمہ) امور ہیں اور ان میں بحث و کرید کرنے والا اور شک کرنے یا ڈالنے والا ان کے نزدیک سزا کا مستوجب ہے۔''

پھر اس سے ذرا آگے فرماتے ہیں:۔

وَاَمَّا مَاحَكَاهُ فِي اِثْبَاتِ ذٰلِكَ مِنَ الْفَلَاسِفَةِ فَهُوَ قَوْلٌ لَا اَعْلَمُ اَحَدًا قَالَ بِهٖ اِلَّا ابْنُ سِيْنَا (ص۱۲۲)

''اور (امام غزالیؒ نے) اثبات معجزات میں جو کچھ فلسفیوں سے نقل کیا ہے سو وہ ایسی بات ہے جس کی بابت مجھے معلوم نہیں کہ ابن سینا کے سوا کسی نے کہی ہو۔''

اسی طرح اس سے چند صفحے آگے فرماتے ہیں:۔

وَلِذٰلِكَ لَا تَجِدُ اَحَدًا مِّنَ الْقُدَمَاءِ تَكَلَّمَ فِي الْمُعْجِزَاتِ مَعَ اِنْتِشَارِهَا وَ ظُهُوْرِهَا فِي الْعَالَمِ لِاَنَّهَا مَبَادِئُ تَثْبِيْتِ الشَّرَائِعِ وَالشَّرَائِعُ مَبَادِئُ الْفَضَائِلِ. (ص۱۲۴،۱۲۵)

''اور اسی لئے تو قدیم فلسفیوں میں سے کسی کو بھی نہ پائے گا کہ اس نے معجزات میں (انکاری) کلام کیا ہو باوجود اس کے کہ معجزات کی اشاعت و ظہور تمام عالم میں تھا کیونکہ وہ سب شریعتوں کے ابتدائی امور (مسلمہ) ہیں۔ اور شریعتیں (حصول) فضائل کے مبادی ہیں۔''

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ قدیم حکما معجزات کو مبادی مان کر ان میں

غرض نہیں کرتے تھے۔ بلکہ منکر کو قابل سزا جانتے تھے' اس امر میں معقول و منقول کی تطبیق کی روش الشیخ الرئیس بوعلی سینا نے نکالی ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس مسئلہ میں جو امام غزالیؒ سے اختلاف کیا ہے وہ اصل مسئلہ یعنی امکان معجزہ میں نہیں۔ بلکہ طریق استدلال میں کیا ہے' جس کی بنا مذاق طبع پر ہے کیونکہ امام غزالیؒ بہ سبب ایشیائی ہونے کے ابن سینا کی روش پر تھے' اور ابن رشدؒ کا مذاق فلسفہ بہ سبب یورپی (اسپینی) ہونے کے ابن سینا کے تابع نہ تھا بلکہ وہ خود بالاستقلال یورپ کا ابن سینا تھا۔

اسی طرح شرح مواقف جو علم کلام کی مشہور درسی کتاب ہے۔ اس میں سید شریفؒ فرماتے ہیں:۔

وَاَمَّا الْفَلَاسِفَةُ فَقَالُوْا هُوَ مَنِ اجْتَمَعَ فِيْهِ خَوَاصٌّ ثَلَاثٌ (اِحْدَاهَا) اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اِطِّلَاعٌ عَلَى الْمُغَيَّبَاتِ. (وَثَانِيْهَا) اَنْ يَّظْهَرَ مِنْهُ الْاَفْعَالُ الْخَارِقَةُ لِلْعَادَةِ تَكُوْنُ عَالَمُ الْعَنَاصِرِ مُطِيْعَةً مُنْقَادَةً لِتَصَرُّفَاتِهٖ اِنْقِيَادَ بَدَنِهٖ لِنَفْسِهٖ. (وَثَالِثُهَا) اَنْ يَّرَى الْمَلَائِكَةَ مُصَوَّرَةً وَّ يَسْمَعَ كَلَامَهُمْ وَحْيًا[1]

فلسفیوں کے نزدیک نبی و رسول وہ ہے جس میں تین خواص جمع ہوں

(ایک) یہ کہ اسے غیب کی باتوں پر اطلاع ہو۔

(دوسرا) یہ کہ اس سے ایسے افعال ظاہر ہوں کہ وہ عام عادت کے خلاف ہوں اس وجہ سے کہ عالم عناصر اس کے تصرفات کے لئے اس کا ایسا مطیع و منقاد ہو جیسا کہ اس کا بدن اس کی روح کے تابع ہے۔

(اور تیسرا) یہ کہ وہ (نبی و رسول) فرشتوں کو دیکھے اور بذریعہ وحی ان کا کلام سنے۔"

---

[1] شرح مواقف استنبول جلد ثالث صفحہ ۱۷۴' ۱۷۵ و ۱۷۶۔ ۱۲ منہ

علماء وحکمائے اسلام بھی انبیا علیہم السلام میں ان ہر سہ امور کے قائل ہیں۔

قرآن مجید میں انبیا کے بیانوں میں جا بجا ان امور کا ذکر موجود ہے فرق یہ ہے کہ فلسفیوں کے نزدیک نبوت کا حصول کسبی ہے اور ان امور عجیبہ کا ان میں پایا جانا ان کی ریاضت و تقدس کا نتیجہ ہے۔ اور اسلامیوں کے نزدیک نبوت ایک وہبی چیز ہے۔ یعنی خدا کی بخشش سے حاصل ہوتی ہے۔ خدا اپنے علم و حکمت سے جسے چاہتا ہے منصب نبوت کے لئے چن لیتا ہے اور اسے تقدس و پاکبازی کی حالت پر خاص حفاظت سے جسے عصمت کہتے ہیں قائم رکھتا ہے۔ اور یہ امور عجیبہ ان کو بطور دلیل کے عطا کرتا ہے۔ جن کا اظہار ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ بلکہ جب خدا چاہے اسے ظاہر کرے اور جب مصلحت نہ دیکھے نہ ظاہر کرے' ہر دو امر کے لئے آیت ذیل ملاحظہ ہو:۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (پ۱۳:ابراہیم)

"ان (کفار) کو ان کے پیغمبروں نے کہا' ہم تو تمہاری طرح بشر ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (اسے رسول بنا کر) احسان کر دیتا ہے اور ہم میں تو یہ طاقت نہیں کہ (باختیار خود) خدا کے حکم کے بغیر کوئی نشان (معجزہ) لا سکیں۔" (۱۱:۱۴)

اس مضمون کی آیات اور بھی ہیں۔ لیکن ہم بنظر اختصار اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ نام کے معقولیوں کے پاس معجزات و کرامات کے انکار میں کوئی ایسی یقینی دلیل نہیں ہے کہ ہم اس پر اعتماد کر سکیں۔ بلکہ ہم تو یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ جس حد تک کہ ہر زمانہ میں اس کی ترقی ہوتی رہی ہے۔ خود فلسفیوں کے نزدیک بھی ہمیشہ ظنی رہا ہے چہ جائیکہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم کے مقابلہ میں ان کی

تحقیقات و معلومات و قواعد کو کوئی جگہ دے سکیں۔ کیونکہ انبیا علیہم السلام کا علم خدا کی وحی کے سبب سے یقینی ہے اور ظنی کو یقینی پر ترجیح دینا درست نہیں۔

کیا آپ دیکھتے نہیں؟ کہ ہر قرن کے فلسفی اپنے متقدمین کی تغلیط کرتے اور ان کی تحقیقات پر مضحکہ اڑاتے رہے ہیں۔ جو امور فلاسفۂ متقدمین نے بڑی عرق ریزی اور غور و فکر سے معلوم کیے تھے اور ان کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ میں اور کچھ عرصہ بعد بھی استاد کامل تسلیم کیے گئے تھے وہ متاخرین کے نزدیک جہل و نادانی سے زیادہ قبیح القاب پاتے ہیں۔ مثلاً حکمائے یونان نے آگ، ہوا، پانی اور مٹی کو عنصر (بسیط) قرار دیا تھا اور اسی اصل پر اتنے اصول و فروع متفرع کیے تھے کہ گویا قدرت الٰہیہ کا احاطہ کر بیٹھے ہیں۔ حال کے فلسفیوں نے ان کو مرکب ثابت کر کے اس پر پرانی عمارت کو بالکل منہدم کر دیا اور بمصداق ع

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

اصول جدیدہ وضع کیے۔ اکثر فلاسفہ پیشین فلک کو متحرک اور تعداد میں نو اور زمین کو ساکن جانتے تھے۔ حال کے نازک خیال سرے سے وجود آسمان ہی سے منکر اور حرکتِ ارضی کے قائل ہیں۔ ان کی تحقیق ایسی لغو ہے کہ کوئی ان میں سے قدم عالم کا قائل ہے اور کوئی وجود واجب الوجود ہی سے منکر۔ کوئی نبوت کو نہیں مانتا اور کوئی قیامت پر یقین نہیں لاتا۔ اس قدر اختلاف و بداعتقادی کے ہوتے کس کے مقلد ہو گے اور کس کو جاہل قرار دو گے؟

جب ان کی تحقیق مسلم ہے تو قدم عالم کا اقرار اور نبوت سے انکار کیوں نہیں کرتے؟ پس جب ان امور مذکورہ میں ان کو پیشوا نہیں جانتے تو تعلیم الٰہی کی تصدیق کے لئے ان کی آرائے فاسدہ اور اہوائے کاسدہ کی طرف کیوں رجوع کرتے ہو؟

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مرضیات و نامرضیات کی بابت انبیا علیہم السلام پر وحی نازل کی ہے فلاسفہ کو اس کی اطلاع نہیں کی بلکہ فلاسفہ پر بھی اتباع اور اطاعت

انبیا فرض کی ہے۔ جب انبیا علیہ السلام پر وحی نازل ہونے کا ایمان ہے۔ تو ان امور کا جو انبیا علیہم السلام نے بوحیِ الٰہی تعلیم کیے ہیں۔ فلسفیوں کے اوہامِ باطلہ اور مغالطاتِ عاطلہ کی بنا پر کیوں انکار کرتے ہو؟ کیا انبیا علیہم السلام کی وحی پر ان کی تحقیق کو جو حقیقت میں ظن ہے۔ ترجیح ہے؟ کہ اندھا دھند ان کے قدموں پر دوڑے جاتے اور آثارِ نبویہ کو چھوڑے جاتے ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس فرقہ کے احوال سے قرآن شریف میں اکثر مقامات پر خبر دی ہے اور ان کے اہوا کو ضلالت اور بے علمی اور ظن اور خرص (اٹکل پچو لگانا) فرمایا ہے اور صرف وحی کو حکم مقرر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ انعام میں فرمایا:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا

”(اے پیغمبر! ان سے کہو) کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو منصف قرار دوں حالانکہ وہی تو ہے۔ جس نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) مفصل کرکے نازل کی ہے۔“ (الایہ پ ۸: انعام)

اس کے بعد یوں فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ.

”(اے پیغمبر!) اگر تو نے دنیا کے اکثر لوگوں کی اطاعت کی تو وہ تجھے خدا کی راہ سے بہکا دیں گے۔ وہ تو صرف ظن کے پیچھے لگے ہیں۔ اور ان کے پاس سوائے اٹکل کے کچھ نہیں۔“ (۶: ۱۱۷)

حقیقت میں سیلِ اسلامی کے سامنے ان کے اوہامِ باطلہ ایک تنکے کی بھی حقیقت نہیں رکھتے اور ایسے ہی ان کی تاویلات رکیکہ۔

❶ رفع الی السماء کے مقابلہ میں کششِ ثقل کے ہزار عذر پیش کرتے ہیں۔ مگر جب انسان ضعیف البنیان اپنے ناتواں بازو سے ایک پتھر اوپر کو پھینک دے تو ہرگز انکار نہیں کرتے۔ کیا یہ رمیِ حجر (پتھر پھینکنا) اس امر کا مشعر نہیں کہ جب ضعیف البنیان انسان اس

قلیل مقدار خداداد طاقت سے زمین کی بے حد طاقت کو مغلوب کر لیتا ہے تو کیا وہ عزیز و مقتدر مالک الملک حضرت مسیح روح اللہ و حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہما وسلم کو ان کے مبارک جسموں سمیت نہیں اٹھا سکتا؟ بَلٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ (کیوں نہیں وہ ضرور ہر شے پر قادر ہے۔ اور میں اس بات پر منجملہ گواہوں کے ہوں)۔"

❷ پرندے باوجود کثیف الجسم[1] ہونے کے جو سماء میں اڑتے پھرتے آسمان کی طرف چڑھتے[2] اور پھر اترتے ہیں۔ مگر یہ معقل اتنا بھی تو نہیں سمجھتے کہ جس قادر ذوالجلال نے پرندوں کو یہ جناح (پر) دیئے ہیں اور یہ طاقتِ طیران (پرواز) بخشی ہے۔ اس نے فرشتوں کو بھی اُولِيْ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (دو دو۔ تین تین اور چار چار پر دیئے ہیں) تو ان کے نزول و صعود کو کون مانع ہے اور جس طرح وہ پرندوں کو اوپر جانے کی طاقت دینے پر قادر ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اوپر لے جانے پر قادر ہے[3]۔

❸ کرۂ ہوائی سے باہر جا کر ہوا کے بغیر زندہ رہنے کو محال سمجھتے ہیں اور اِذْ

---

[1] مرزا صاحب قادیانی نے اپنے ازالہ اوہام میں معراج جسمانی کے انکار میں لکھا ہے کہ سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا' (جلد اول ص ۴۷) اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِكَ مِنْ سُوْءِ الْاَدَبِ۔ ۱۲ منہ سعادت

[2] اکمل صاحب قادیانی نے یہاں پر عجب گل افشانی کی ہے۔ کہتے ہیں؟ کیا کوئی پرندہ آسمان پر موجود ہے؟" (ص ۶) سُبْحَانَ اللّٰہ نحن نہی عالم قادیانی معلوم شد۔ ۱۲ منہ سعادت

[3] اکمل صاحب اس پر سوال کرتے ہیں۔ "پرندوں کے اوپر جانے کو مسیح کے صعود سے کیا نسبت ہے؟" (ص ۶) جواب قرآن شریف میں سورۂ نحل میں یہ امر خدائے تعالیٰ کی وسعتِ قدرت کی مثالوں کے سلسلہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ پہلے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کہا ہے۔ پھر ماں کے پیٹ سے بچے کا دل۔ آنکھ۔ کان والا کر کے نکالنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد پرندوں کا بحکم خدا جو آسمان میں اڑنا ذکر کیا۔ ہم نے بھی اسی مناسبت سے خدا کی قدرت کی وسعت کا ذکر کر کے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کی رفع آسمانی کا ممکن ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرت ابراہیم کے مناظرۂ نمرود میں رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ کے بعد فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (پ ۳: بقرہ) کے لانے میں جو ربط ہے اسے سمجھو تو شہادت القرآن کا یہ مقام بھی سمجھ لو گے۔ فافہم ۱۲ منہ

۴ ہزار ہا حیوان بے مادر و پدر پیدا ہوتے ہیں بلکہ یہ متعقل اپنے ہی بطون (پیٹوں) سے خارج ہوتے دیکھتے ہیں۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کا بے پدر پیدا ہونا ان کی باریک عقل میں نہیں سما سکتا۔ چنانچہ فرمایا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ. (پ ۲۵: حم سجدہ)

"ہم ان کو اپنے نشانات آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفسوں میں بھی ضرور دکھاتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ان کو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ برحق ہے۔" (۴۱:۵۳)

طریق ثبوت معجزات:

انسان یا تو اپنے مشاہدہ و تجربہ یا استدلال سے علم حاصل کرتا ہے یا کسی مخبر صادق کی خبر سے

پہلی صورت کی نسبت یہ تفصیل بھی بالضرور یاد رکھنی ہوگی کہ بعض مشاہدات و تجربات مختص بمردمان ہوتے ہیں کہ خاص خاص اشخاص ان کو دیکھ کر فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اور بعض مختص بمکان ہوتے ہیں کہ ان حوادث کا وقوع خاص خاص مقامات پر ہوتا ہے۔ اور بعض مختص بزمان ہوتے ہیں کہ ان کا وقوع ایک زمانِ

---

۵ یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ جنین کی پرورش کے لئے منہ کے سوائے ایک خاص صورت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کو آسمان پر اٹھانے کے لئے کرۂ ہوائی سے آگے جانے کی کوئی خاص صورت بنا دی۔ اکمل صاحب اسے سمجھ نہیں سکے تو کہتے ہیں۔ (اس آیت) کو کرۂ ہوائی سے باہر جا کر زندہ رہنے کی تائید میں پیش کرنا فضول ہے۔" (ص ۶) جواب۔ کرۂ ہوائی کے اندر یا باہر ہونا ملحوظ نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا اپنے ارادہ کے پورا کرنے میں قادر مطلق و حکیم مطلق ہونا ملحوظ ہے۔ جو آپ سمجھ نہیں سکے۔" ۱۲ منہ سعادت

خاص سے متعلق ہے۔ پس بنی آدم کے مشاہدات و تجربات آپس میں مساوی نہیں ہو سکتے۔

پھر یہ بھی کہ طبائع جو علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔ استعداد میں متفاوت ہیں۔ اور یہ امر فلسفیوں میں مسلم ہے۔ اس لئے ہر شخص کے کسی امر کو حاصل کرنے کی کیفیت اور اس کے ادراک کی حقیقت بھی یکساں نہیں۔ پس اگر کسی وقت کسی جگہ کوئی امر عجیب حادث ہو۔ جس پر ہمارا سابق علم حاوی نہ ہو تو ہم اسے خارج از قانون قدرت کہہ کر ٹال نہیں دیں گے۔ بلکہ لازماً واقعہ کی تصدیق کریں گے۔ اگرچہ اس کی علت و سبب ہمارے علم میں نہ آئے۔

ہاں جن لوگوں نے اسے اپنے مشاہدے سے نہیں دیکھا۔ ان کے اعتبار کے لئے سچی خبر کی ضرورت ہے۔ جس طرح کہ ہم دوسری بن دیکھی چیزوں کو محض خبر سے مانتے ہیں اور باطل و بے ثبوت کی پیروی سے بچنے کے لئے اس کی صداقت کو بھی جانچتے ہیں۔ پس اسی طرح معجزات کی خبروں کو بھی ان کے مخبروں کی حیثیت سے پرکھیں گے۔ سو قرآن کی نسبت تو مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ قطعاً و یقیناً کلام الٰہی ثابت ہو چکا ہے لہٰذا جو معجزات یا عجائبات قدرت اس میں مذکور ہیں۔ وہ بلا تردد و تامل اسی طرح ماننے پڑیں گے۔ جس طرح کہ قرآن منوائے۔ ورنہ معاذ اللہ کذب باری لازم آئے گا۔ یا قرآن مجید کی صحت و قطعیت میں فرق آئے گا اور یہ دونوں باتیں داخل کفر ہیں۔

باقی رہے وہ معجزات جو احادیث میں وارد ہیں' ان کی نسبت بھی یہی قاعدہ جاری ہو گا کہ اگر وہ روایات صادق و متقی اور حافظ و ضابط راویوں کے متصل سلسلہ سے خدا کے پاک رسول ﷺ تک پہنچ جائیں۔ تو ان کے ماننے میں بھی کلام نہیں ہو گا۔

صحابہ ؓ کی نسبت خدائے تعالیٰ نے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

(پ۲:بقرہ)

شہادت القرآن

"اس طرح ہم نے تم کو عادل امت بنایا کہ تم (دیگر) لوگوں پر گواہ ہو۔" (۲:۱۴۳)

(وقال) كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (پ۴: آل عمران)

"(نیز فرمایا) تم بہترین امت ہو جو (دیگر) لوگوں کے لئے (بطور نمونہ) چنے گئے ہو۔" (۳:۱۰۹)

اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو حجۃ الوداع میں خطبۂ منیٰ میں مخاطب کر کے فرمایا تھا:

لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ مِنْكُمْ (صحیح بخاری کتاب العلم)

"تم جو اس وقت حاضر ہو ان کو جو تم میں سے حاضر نہیں ہیں (یہ دین) پہنچا دینا۔"

اس سے صاف ثابت ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول پاک ﷺ نے تبلیغِ دین کے لئے صحابہؓ کو بعد کی امت کے لئے وکیل و مبلغ قرار دیا ہے لہٰذا سب اصحاب عادل و صادق ہیں اور واقعات میں بھی ایسا ہی پایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف عمداً غلط بات کو منسوب نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جس کسی لفظ میں ان کو تردد و شک ہو اس میں بھی پرہیز کرتے تھے اور ظاہر کر دیتے تھے کہ آپ نے یوں فرمایا تھا یا یوں فرمایا تھا۔

تنبیہ:

لہٰذا معجزات حدیثیہ بھی مثل قرآن شریف واجب الاعتقاد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معجزات و خوارق عادت کے ثبوت کے لئے مخبر صادق کی سخت ضرورت ہے۔ امکانِ معجزات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام ہر ممکن امر کو محض اس کے امکان کی بنا پر واقعہ کی صورت میں بھی منواتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کے امکان کے بعد اس کے وقوع کے لئے اس خبر کا پرکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ سچی ہے یا کیسی؟ سچی ثابت ہو جانے پر اس کی

تسلیم وتصدیق سے اپنے خیالات وقیاسات سے جن کی بنا قصورِ فہم یا عدمِ علم یا نقص علم پر ہے۔ان کا انکار نہ تو عقلاً صحیح ہے اور نہ شرعاً درست ہے۔واللہ الهادی.

مقدمۂ ثانیہ

مقدمہ ثانیہ

در تشریح سنۃ اللہ

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم اس کارخانۂ قدرت میں ایک خاص نظام دیکھتے ہیں۔ جس کا نام سنۃ اللہ بھی ہے۔ اور خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (پ ۲۶: فتح) یعنی ''خدا کی سنت (روش) بدلا نہیں کرتی'' (۲۲:۴۸) پس معجزہ و کرامت جن کی صورت سنۃ اللہ کے خلاف ہے۔ ممکن نہیں۔

اس کے جواب کی دو صورتیں ہیں اول نظام قدرت کو ملحوظ رکھ کر عقلی جواب۔ دوم یہ کہ آیت پیش کردہ کا مطلب وہ نہیں جو منکرینِ معجزہ و کرامت نے سمجھا۔ پہلی صورت کے لحاظ سے کچھ جواب تو پہلے مقدمہ میں گزر چکا اور کچھ اس جگہ بھی بحسب ضرورتِ مقام لکھا جاتا ہے۔ سو معلوم ہو کہ کسی قاعدہ کو سنۃ اللہ یا خدا کا قاعدہ قرار دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک نقلی دوسرا عقلی۔ نقلی یہ کہ قرآن شریف یا حدیث صحیح میں اسے سنۃ اللہ کہا ہو اور عقلی یہ کہ ہم اس کارخانۂ قدرت کے انتظام کے سلسلہ پر نظر کر کے کسی امر کو سنۃ اللہ قرار دے لیں۔ اسے علم منطق میں استقرار کہتے ہیں اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ تام اور ناقص۔ تام اسے کہتے ہیں کہ تمام ہم قسم جزئیات پر نظر کریں اور ان میں ایک مشترک نظام پائیں اور اسے قاعدہ قرار دیں۔

ناقص یہ ہے کہ چند جزئیات پر نظر کر کے ایک امر کو قاعدہ قرار دیں۔ استقرائے تام جو عقلاً سب جزئیات کا حصر کرے۔ مفید یقین ہوتا ہے اور استقرائے ناقص مفید ظن ہوتا ہے[1] کیونکہ تمام جزئیات کا حصر ہوا نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دیگر جزئیات جو ہمارے علم میں نہیں آئیں۔ اس نظام و قاعدہ کے ماتحت نہ ہوں جو ہم نے تجویز رکھا ہے۔

---

[1] مستفاد از ملا مبین بحث استقراء ص ۲۴۹ جلد دوم۔ نیز شرح مطالع مطبوعہ استنبول ص ۳۴۸ بحث استقرار۔ ۱۲ منہ

پس اس قرارداد کو قاعدہ کہنا درست نہیں۔ کیونکہ قاعدہ وہ ہے جو جمیع جزئیات پر منطبق ہو۔ لہٰذا وہ ہمارا سمجھا ہوا قاعدہ سنۃ اللہ نہ رہا[۱]

اب سوال یہ ہے کہ جس امر کو ہم نے سنۃ اللہ قرار دیا ہے آیا اس کے متعلق خدا نے یا اس کے رسول (ﷺ) نے کہا ہے کہ یہ امر خدا کی سنت ہے؟ یا جو قاعدہ ہم نے اپنے استقراء سے بنایا ہے وہ سب جزئیات کو دیکھ بھال کر بنایا ہے؟ اور ہم اس کی مخلوقات کا احاطہ کر چکے ہیں؟ اور اس کی قدرت کے اسرار کو اور اس کے نظام کو کامل طور پر سمجھ چکے ہیں؟[۲]

قرآن و حدیث کا واقف اور نظامِ قدرت پر صحیح نظر رکھنے والا بیشک گردن جھکا دے گا اور اس امر کو تسلیم کرے گا کہ ان قواعد کو جو ہم نے بنائے ہیں خدا و رسول نے ہرگز سنۃ اللہ نہیں کہا اور ہمارا استقراء بالکل ناقص ہے[۳] کیونکہ مخلوقاتِ الٰہی اور اس کے عجائباتِ قدرت انسان کے احاطۂ علم سے باہر ہیں۔ ہم کو وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (پ۲۹: مدثر) یعنی ''تیرے رب کے لشکروں کو اس کے اپنے سوا کوئی نہیں جانتا'' (۷۴: ۳۱) اور وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (پ۱۵: بنی اسرائیل) یعنی ''تم کو تو صرف تھوڑا سا علم عطا کیا ہے۔'' (۱۷: ۸۵) کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ آیت وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (پ۲۶: فتح) اور اس

---

[۱] اکمل صاحب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کارخانہ قدرت پر نظر کر کے کسی امر کو سنۃ اللہ نہ کہنا چاہیے (ص۶) پس جب یہ مسلّم ہے تو پھر جھگڑا کیا رہا۔ ۱۲ منہ

[۲] اکمل صاحب کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کسی امر کو اپنی سنت کہے'' کے ساتھ یہ ایزاد کر لیجیے۔ کسی امر کو بطور کلیہ فرمانا بھی سنت ہے۔'' اچھا جناب! تو پھر کیا؟ آپ کے مدعا کے مطابق تو قرآن میں کوئی کلیہ نہیں۔ ہے تو یہی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ جو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔ ۱۲ منہ

[۳] حاصل یہ کہ ہم اپنے ناقص تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر کسی امر کو سنت اللہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ مخلوقات و صنائع خالق کا استقرائے کلی ناممکن ہے اور استقرائے ناقص مفید ظن ہوتا ہے نہ مفید یقین۔ فافہم وتدبر۔ ۱۲ منہ

کی دیگر نظائر کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ان آیات میں سنۃ اللہ سے انبیا کی نصرت اور ان کے دشمنوں کی تعذیب اور خذلان و ناکامی مراد ہے[1]۔ سو اس امر کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری یہ قدیمی روش ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہوگی[2]۔ اس بات کے سمجھنے کا آسان طریق یہ ہے کہ یہ آیات جہاں جہاں قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں۔ طالب مشتاق ان مواقع کو نکال کر ماقبل و مابعد پر نظر کرے۔ تو ساتھ ہی انبیا علیہم السلام کی نصرت اور ان پر خدا کی مار اور پھٹکار کا ذکر موجود ہوگا۔ پس قاعدہ نظم و ارتباط قرآن حکیم اس کو مجبور کر دے گا۔ کہ وہ تسلیم کر لے کہ اس جگہ سنۃ اللہ سے مراد پیغمبروں کی نصرت اور ان کے دشمنوں کی تعذیب و خذلان ہے۔ چنانچہ ہم وہ سب مواقع علی الترتیب مع ان کے ماقبل کے نقل کر کے فیصلہ ناظرین کے فہم رسا پر چھوڑتے ہیں۔

---

[1] اکمل صاحب فرماتے ہیں: ''سنۃ اللہ کے معنی عذاب الٰہی کسی لغت سے دکھائے ہوتے۔'' (ص ۶) خدا جانے اکمل صاحب نے کس کمال کی بنا پر اپنا نام اکمل تجویز کیا۔ جناب والا! سنت کے معنی ہیں عادت و سیرت چنانچہ صراح میں ہے: ''سنة بالضم روش'' اور قرآن شریف میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہمیشہ گزشتہ امتوں میں یہ کرتا آیا ہوں کہ منکرین انبیا کو عذاب کروں تو اب بھی ایسا ہی کروں گا اور یہ میری سنت ہے۔ مصنفین کتب لغت پر یہ واجب نہیں کہ لفظ سنت کی ذیل میں سب قسم کی عادتوں کو لکھ دیں یہ تو متکلم کے کلام سے معلوم ہو گا۔ گو آپ کا سوال بالکل جاہلانہ ہے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ اس نے اپنے ایک بندے سے آپ کا مطالبہ بھی پورا کرا دیا۔ دیکھئے قاموس میں سنة الاولین کی نسبت لکھا ہے۔ ای معاملۃ العذاب اسی طرح لسان العرب میں بھی ہے جو انشاء اللہ آگے مذکور ہوگا۔ ۱۲ منہ سعادت

[2] اکمل صاحب لکھتے ہیں (ص ۲) ''لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ میں لائی جنس کو دیکھو۔ ہر بدلانے والے کی نفی ہے'' جواب کیا آپ کا یہ مدعا ہے کہ پھر خدا بھی نہیں بدل سکتا۔ جناب یہ بات آپ نے بے علمی کی وجہ سے لکھی کلمت کی اضافت جب خدا کی طرف کی گئی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے سوا خدا کے کلمات کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ دیکھئے تفسیر ابوالسعود میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے لا قادرَ علی تبدیلہ و تغییرہ غیرہ یعنی خدا کے سوا کوئی دوسرا اس کی تبدیلی و تغییر پر قدرت نہیں رکھتا۔'' ۱۲ منہ

اوّل سورہ بنی اسرائیل (پ ۱۵: ۷۶ و ۷۷)

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا.

''اور تحقیق یہ لوگ نزدیک ہیں کہ تجھ کو دل برداشتہ کر کے اس سرزمین (مکہ) سے نکال دیں۔ پھر یہ بھی اس میں تیرے پیچھے تھوڑی ہی مدت بسیں گے۔ (یہ) سنت ہے ان پیغمبروں کی جن کو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو ہماری سنت کے لئے تحویل (ٹال دینا) نہ پاوے گا۔''

اس موقع پر صاف مذکور ہے کہ کفار مکہ پیغمبر ﷺ کو مکہ شریف سے خارج کرنا چاہتے تھے' حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی کہ اگر آپ کو نکال دیں گے تو خود بھی نہ رہیں گے کیونکہ انتقامِ انبیا از اعدا ہماری سنت قدیمہ ہے اور یہ کبھی محول نہ ہوگی۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر کبیر میں کہا ہے یعنی اِنَّ كُلَّ قَوْمٍ اَخْرَجُوْا نَبِيَّهُمْ سُنَّةُ اللّٰهِ اَنْ يُّهْلِكَهُمْ ۱۲ یعنی خدائے تعالیٰ کی اس سے یہ مراد ہے کہ ''جس کسی قوم نے اپنے نبی کو نکالا۔ ان کے متعلق خدا کی سنت یہی ہے کہ ان کو بس ہلاک ہی کر دے'' اور آیت لَاتَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا پر کہا ہے: والمعنٰی اِنَّ مَا اَجْرَى اللّٰهُ تَعَالٰى بدا العادة لَمْ تَتَهَيَّا لِاَحَدٍ اَنْ يُّقَلِّبَ تِلْكَ الْعَادَةَ ۱۲ یعنی ان کے معنی یہ ہیں کہ جس امر کو خدا اپنی عادت ٹھیرا لے۔ تو کسی سے بھی نہیں ہو سکتا کہ اس عادت کو بدل ڈالے۔ اسی طرح تفسیر ابوالسعود میں بھی لکھا ہے کہ خدا کی یہی سنت ہے کہ جو امت اپنے رسول کو اپنے علاقہ سے نکال ڈالے۔ خدا تعالیٰ اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی سورہ بنی اسرائیل میں فرعون کی نسبت فرمایا:

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا وَّقُلْنَا مِنْ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ (پ ۱۵: بنی اسرائیل ۱۰۳' ۱۰۴)

''پس ارادہ کیا (فرعون نے) کہ دل برداشتہ کرے ان کو اس سر زمین (مصر) سے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو ڈبو دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو کہا کہ اب تم اس زمین (مصر) میں (بااختیار ہوکر) سکونت اختیار کرو۔''

گویا سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا کی ایک مثال بھی ذکر فرما دی۔

موقع ثانی: (پ۲۲: سورہ احزاب)

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا۝ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۝ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۝ (۶۲،۶۱،۶۰:۳۳)

''اگر منافق اور وہ جن کے دل میں مرض (شک) ہے اور وہ جو شہر میں بری خبریں اڑاتے پھرتے ہیں۔ باز نہ آئیں گے تو ہم تجھ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ پھر وہ اس شہر مدینہ میں تیرے نزدیک تھوڑے ہی دن رہیں گے۔ لعنت مارے ہوئے ہو کر جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے۔ جو لوگ پہلے گزرے ہیں ان میں (بھی) خدا کا (یہی) دستور رہا ہے اور اے پیغمبر! تم خدا کے دستور میں ہرگز (کسی طرح کا) ردو بدل نہ پاؤ گے۔''

اس میں بھی عذاب الٰہی کا صاف ذکر ہے چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں لکھا ہے

سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ فِي الْاُمَمِ الْمَاضِيَةِ سُنَّةً وَهِيَ اَنْ يُّقْتَلَ الَّذِيْنَ نَافَقُوا الْاَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَسَعَوْا فِيْ تَوْهِيْنِ اَمْرِهِمْ بِالْاِرْجَافِ وَنَحْوِهٖ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا یعنی ''گزشتہ امتوں میں خدا کی سنت یہی رہی ہے کہ ان لوگوں کو جو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام سے منافقت کریں۔ اور ان کے امر (دین) کے ضعیف کرنے میں ارجاف (غلط پروپیگنڈا) کرنے یا اس کی مثل (اور

شرارتوں) سے سعی کریں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیتا رہا ہے۔"

اسی طرح تفسیر کبیر میں بھی یہی مضمون ہے۔ اسی طرح لسان العرب میں ہے۔ اَیْ سَنَّ اللّٰہُ ذٰلِکَ فِی الَّذِیْنَ نَافَقُوا الْاَنْبِیَاءَ وَاَرْجَفُوْا بِھِمْ اَنْ یُّقَتَّلُوْا اَیْنَ ثُقِفُوْا اَیْ وُجِدُوْا اس کے بعد سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ (سورہ کہف) کی نسبت کہا ہے: قَالَ الزَّجَّاجُ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ اَنَّھُمْ عَایَنُوا الْعَذَابَ [1]

موقع ثالث (پ۲۲: سورہ فاطر ۳۵، ۴۳)

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ فَھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّۃَ الْاَوَّلِیْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا. (پ۲۲: فاطر)

"اور بری تدبیر (کا وبال) صرف اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے۔ تو یہ لوگ سوائے پہلوں کی سنت کے اور کچھ نہیں انتظار کرتے۔ پس تو ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پائے گا۔ اور نہ خدا کی سنت میں تحویل (ٹالنا) پائے گا۔" (۳۵: ۴۳)

چنانچہ تفسیر ابوالسعود میں کہا ہے: اَیْ سُنَّۃُ اللّٰہِ فِیْھِمْ بِتَعْذِیْبِ مُکَذِّبِیْھِمْ یعنی "ایسے لوگوں کے بارے میں خدا کی سنت یہ ہے۔ کہ مکذبین کو عذاب کرے۔"

اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے۔ لَیْسَ لَھُمْ بَعْدَ ھٰذَا اِلَّا اِنْتِظَارُ الْاِھْلَاکِ وَھُوَ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ یعنی ان بد اندیشوں کے لئے اس کے بعد سوائے ان کی ہلاکت کے کسی چیز کا انتظار نہیں ہے اور یہی پہلے لوگوں میں خدا کی سنت ہے۔

موقع رابع: (پ۲۶: سورہ فتح) (۴۸: ۲۲، ۲۳)

وَلَوْ قَاتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا○ سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ

---

[1] لیجئے اکمل صاحب لغت کی کتاب سے بھی سُنَّۃُ اللّٰہ سے مراد عذاب اللہ ثابت ہو گیا۔ اب تو قادیانی مسیح کو چھوڑ دیجئے۔ ۱۲ منہ

لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.

''اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر جائیں گے۔ پھر ان کو کوئی بھی حامی و مددگار نہ ملے گا (یہ) خدا کی سنت (ہے) جو پہلے گزر چکی اور تو ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پائے گا۔''

چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے: سُنَّةُ اللّٰهِ نُصْرَةُ رَسُوْلِهٖ وَاِهْلَاکُ عَدُوِّهٖ یعنی ''خدا کی سنت یہ ہے کہ اپنے رسول کی مدد کرے اور اس کے دشمن کو ہلاک کرے۔'' اسی مضمون 'عدمِ تبدیلِ عذابِ الٰہی' کو مواقع کثیرہ میں بالفاظ دیگر بیان کیا گیا ہے گویا وہ آیات تفسیر ہیں سنۃ اللہ کی۔ چنانچہ فرمایا سورۂ انعام میں۔

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. (پ۸)

''اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔'' (۱۴۸:۶)

نیز سورۂ یوسف میں فرمایا:

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. (پ۱۳: یوسف)

''اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔'' (۱۱۰:۱۲)

اور سورۂ مومن کے اخیر میں فرمایا:

فَلَمْ يَکُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِکَ الْکٰفِرُوْنَ.[1] (پ۲۴)

---

[1] اکمل صاحب نے ان آیتوں میں سنۃ اللہ سے عذاب الٰہی مراد ہونے میں بہت بے سود کوشش کی ہے۔ اس کا صحیح و درست جواب یہ ہو سکتا تھا کہ آپ قرآن شریف میں سے کوئی پانچ ہی جگہ نکال دیتے جہاں سنۃ اللہ کو غیر مبدل کہا ہو۔ اور ساتھ ہی بالا لفظ عذاب و نکال کا ذکر و قرینہ نہ ہو۔ کیونکہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ مگر آپ کو یہ باتیں بتائے کون؟ مسیح قادیانی تو خود ان علوم سے ناواقف تھا۔ مرید کیا جانیں گے؟ اور کلمتُ اللّٰه کے متعلق ایک بات آپ کو بتاؤں کہ یہاں پر مراد خدا کے وعدے ہیں۔ جو قادیانی سے کبھی بھی پورے نہیں ہوئے۔ سمجھ میں نہ آئے تو محمدی بیگم کا نکاح۔ ڈاکٹر عبد الحکیم اور عبد اللہ آتھم کی موت۔ مولوی ثناء اللہ صاحب سے آخری فیصلہ کے مواعید سمجھ لیں۔ ۱۲ منہ

شہادت القرآن

''پس جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا۔ تو ان کو ان کے ایمان نے کچھ بھی فائدہ نہ دیا (یہ) خدا کی سنت (ہے) جو اس کے بندوں میں گزر چکی اور اس وقت کفار خسارے میں ہوئے۔'' (۴۰:۸۵)

اس بیان و تفصیل سے طالب ذکی پر واضح ہوگیا کہ متعلقین کا انکار خرق عادت کے لئے آیت وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً سے تمسک کرنا مراد الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔

مقدمہ ثالثہ

در بیانِ خصائص حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قادرِ قیوم کا طریق تعلیم اسی نہج پر چلا آیا ہے کہ جب لوگ مسبب حقیقی سے غافل ہو کر اسباب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو وہ عزیز حکیم ان کے مزعومات کو باطل کرنے کے لئے اپنی قدرت کے کرشمے ظاہر کیا کرتا ہے' حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے وقت طب اور فلسفہ کا بڑا چرچا تھا (اور ظاہر ہے کہ ان علوم کا مدار اسباب ہی پر ہے) شب و روز کے توغل نے ان کے اذہانِ قاصرہ میں یہی کچھ مزین کر دیا تھا کہ کوئی چیز بغیر سبب[1] و علاج اور بدونِ ترکیب و مزاج کے پیدا نہیں ہو سکتی

اے گرفتارِ سبب از مسبب غافلی — سوئے ایں روتاب زاں سو مائلی

سو اللہ سبحانہ' وتعالیٰ نے ان کے اس واہی خیال کے ابطال کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کو خلاف عادت بے باپ پیدا کیا۔ اور آپ کو طفلی میں خلاف عادت نطق فصیح کی طاقت دی[2] اور ایسے مریضوں کو جن کے علاج سے اطبا عاجز ہوں۔ بغیر اسباب معتادہ کے ان کے ہاتھ پر شفا دی۔ اور معجزۂ احیائے موتیٰ جو طاقت بشری سے باہر ہے' ان کے ہاتھ پر ظاہر کیا۔ اور مٹی کی مورت میں آپ کی پھونک سے زندگی کی روح پھونک دی جو اس سے بھی عجیب تر ہے۔ اور صعود الی السماء جسے فلاسفر محالات میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر چڑھا کر

---

[1] یعنی کوئی وہ سبب جو انسانی علم میں آ چکا ہے۔ ۱۲ منہ

[2] یہ کلام سورۂ مریم پ ۱۶ کے دوسرے رکوع میں صاف مذکور ہے۔ ۱۲ منہ (۱۹: ۳۰ تا ۳۳)

کروا تنخ محقق کر دیا اور فلاسفہ کے اس خیال کو کہ گردش زمانہ کے اثر سے ہر چیز متغیر و مستحیل ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مسئلہ نزول سے باطل کیا۔

چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے۔

قال كثير من العلمآء بعث الله كل نبی من الانبيآء بما يناسب اهل زمانه. فكان الغالب علی زمان موسٰی عليه السلام السحر و تعظيم السحرة فبعثه الله بمعجزة بهرت الابصار و حيرت كل سحار فلما استيقنوا انها من عند العظيم الجبار انقادوا للاسلام و صاروا من عبادالله الابرار. واما عيسٰی عليه السلام فبُعث فی زمن الاطباء واصحاب علم الطبيعة فجاء هم من الأيات بمالاسبيل لاحد اليه الا ان يكون مؤيدًا من الذی شرع الشريعة فمن اين للطبيب قدرة علٰی احياء الجماد او علٰی مداواة الاكمه والابرص و بعث من هو فی قبره رهين الٰی يوم التناد. وكذالک محمدٌ صلی الله عليه وسلم بُعث فی زمان الفصحاء و البلغاء و تجاريد الشعراء فاتاهم بكتاب من الله عزوجلّ فلو اجتمعت الانس والجن علٰی ان ياتوا بمثله او بعشر سور من مثله او بسورة من مثله لم يستطيعوا ابدا. ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا. وما ذاک الا ان كلام الرب عزوجل لا يشبه كلام الخلق ابدا.

(تفسیر ابن کثیر جلد دوم ص ۲۲۷، ۲۲۸)

"بہت سے علمائے امت نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس (نشان) کے ساتھ مبعوث کیا جو اس کے زمانہ کے لوگوں کے مناسب تھا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو اور جادوگروں کی تعظیم کا بہت چرچا تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے آپ کو ایسے معجزے (عصا) سے مبعوث

کیا۔ جس نے آنکھوں کو حیران؛ اور ہر جادوگر کو مبہوت کردیا۔ پس جب انہوں نے یقین کرلیا کہ وہ معجزہ خدائے بزرگ و جبار کی طرف سے ہے تو اسلام کے مطیع ہوگئے اور خدا کے نیک بندے بن گئے۔ (اسی طرح) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اطبا اور علم طبعیات والے لوگوں کے زمانہ میں مبعوث کئے گئے۔ پس وہ ان کے پاس ایسے نشانات لائے۔ جن کی نسبت سوائے اس کے کوئی اور گمان نہیں ہوسکتا کہ یہ سب اس ہستی کی طرف سے ہیں جس نے یہ شریعت مقرر کی ہے پس کسی طبیب کو مردوں اور جمادات کے زندہ کرنے پر یا مادر زاد اندھے اور برص کے علاج پر اور اس شخص کے اٹھا کھڑا کرنے پر جو اپنی قبر میں قیامت کے دن تک کے لئے مرہون ہو۔ کہاں سے قدرت لائے؟ اسی طرح محمد ﷺ بڑے بڑے نامی فصحا اور بلغا و شعرا کے زمانہ میں مبعوث کئے گئے۔ پس آپؐ خدا کی طرف سے ایسی کتاب لائے کہ اگر تمام انسان اور جن اس امر پر مجتمع ہوجائیں کہ اس کی مثل یا اس کی دس سورتوں کی مثل یا ایک سورت کی مثل لائیں تو کبھی بھی نہ لاسکیں گے۔ اگرچہ بعض بعض کے مددگار بھی بن جائیں اور یہ اسی لئے ہے کہ خدا کا کلام مخلوق کے کلام سے ہرگز نہیں ملتا۔

تشریح لفظ آیت۔ آیت کے معنی ہیں علامت۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے:۔

والأية العلامة قرآن شریف میں اس کا اطلاق کئی امروں پر آیا ہے کہ ایک ان میں سے عجائبات قدرت ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا. (پ۱۵: کہف)(۹:۱۸)

"کیا تو نے گمان کیا کہ غار والے اور تختی والے ہمارے نشانات میں

سے کوئی انوکھی چیز تھے۔"

اسی کے موافق لسان العرب میں کہا ہے۔ اٰیَاتُ اللّٰہِ عَجَائِبُہٗ اسی معنی کے لحاظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لئے قرآن شریف میں متعدد مقامات میں آیت کا لفظ وارد ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ. (پ۱۶: مریم)(۲۱:۱۹)

"تا کہ ہم اسے (ابن مریم) لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنائیں۔"

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ. (پ۱۷: انبیاء)(۹۱:۲۱)

"اور ہم نے اسے (مریم کو) اور اس کے بیٹے (مسیحؑ) کو جہان والوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنادیا۔"

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً. (پ۱۸: مومنون)(۵:۲۳)

"اور ہم نے ابن مریمؑ کو اور اس کی ماں کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنایا۔"

وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ. (پ۲۵: زخرف)(۵۲:۴۳)

"ہم نے اسے (ابن مریم کو) بنی اسرائیل کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا۔"

ان آیات میں خدائے تعالٰی نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو آیت اور مثل یعنی نشان ونمونہ قدرت فرمایا ہے۔ پس اگر ان کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی ایسی بات وارد ہو۔ جو عام عادت کے خلاف نظر آئے۔ اور لوگوں کو اس سے تعجب پیدا ہو تو قرآن وحدیث پر ایمان رکھنے والوں کو اس سے کچھ بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جسے خدائے تعالٰی نے عام عادت کے خلاف بلا باپ پیدا کیا ہو۔ اور اسے اپنی قدرت کا ایک نشان قرار دیا ہو۔ اس کے حالات عام نظام کے ماتحت نہ ہوں۔ تو کوئی تعجب نہیں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت۔ ان کا طفلی میں

حکیمانہ تکلم فی المہد۔ ان کے معجزات [1] ان کی رفع سماوی اور پھر آسمان سے ان کا نزول سب باتیں اس نظام سے بالکل الگ ہیں۔ جو انسان کے علم میں آیا اور جس پر اس کی معلومات کی چکی گردش کر رہی ہے۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق رفع نزاع واختلاف کے لئے یہ طریق نہایت سادہ اور سلامت روی کا ہے۔ اور ایک مومن کے لئے اس میں کوئی اینچ پیچ نہیں ہے۔

سوال:۔ آیات مذکورہ بالا میں حضرت مریم کی شان میں بھی لفظ آیت وارد ہے تو حضرت مریمؑ میں یہ امر کہاں پائے جاتے ہیں؟

جواب:۔ کسی امر کے ثبوت کے لئے قرآن و حدیث میں اس کے اصل کا وجود ضروری ہے۔ پس جس امر میں حضرت مریمؑ کو آیت کہا گیا ہے۔ بیشک وہ اس میں آیت (نشان قدرت) ہیں اور جو امر ان کے حق میں مذکور ہی نہیں وہ زیر بحث ونزاع آ ہی نہیں سکتے۔ ان میں ان کو آیت قرار دینے کے کیا معنی؟ اس لئے ہم نے اوپر کی عبارت میں نزاع واختلاف کی قید لگائی ہے۔

نکتہ:۔ سورت انبیاء اور سورت مومنون کی آیات میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ دونوں کی نسبت لفظ آیت بصیغہ وحدت وارد ہے۔ حالانکہ دو کے لئے صیغہ

---

[1] قاضی اکمل صاحب معجزات مسیحیہ پر اعتراض لکھتے ہیں ''اگر حضرت عیسیٰؑ نے معجزے کے پرندے اڑائے یا بقول آپ کے خلق حیات کیا۔ تو کیا حضرت موسیٰؑ کا عصا سانپ نہیں بن گیا تھا۔'' (ص ۴) جواب ہاں جناب! بن گیا تھا۔ لیکن اس سے آپ کو فائدہ کیا؟ اور ہمیں نقصان کیا؟ اس میں بھی تو ہماری ہی تائید ہے۔ اور یہ جو آپ نے کہا ''بقول آپ کے خلق حیات کیا'' جناب! یہ مجھ پر افترا ہے آپ تو لکھتے ہیں۔ ''شہادت القرآن حصہ اول اس وقت میرے سامنے ہے۔'' (ص ۲) بھلا اس میں کہیں دکھا دیجئے تو کہ اس میں کہاں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے خلق حیات کیا۔ جناب اس میں تو صاف لکھا ہے ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خلق حیات حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر اپنی قدرت کاملہ سے کر دکھایا۔'' اسی طرح اعادہ حیات کو بھی خدا ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ (دیکھو ص ۱۲ طبع ثانی)

تثنیہ کا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس امر میں یعنی ولادت بلا پدر میں دونوں کا حال بمجموع ایک آیت (نشان) ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں زیر لفظ آیت۔ آیت وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ أُمَّهُ آيَةً (مومنون پ ۱۸) کو ذکر کر کے کہا ہے:-

وَقَالَ أَبُوْ مَنْصُوْرٍ لِأَنَّ الْآيَةَ فِيْهِمَا مَعًا آيَةٌ وَّاحِدَةٌ وَهِيَ الْوِلَادَةُ دُوْنَ الْبَعْلِ (جلد۱۸۔ص۲۶)

"ابو منصور نے کہا یہ اس لئے ہے کہ دونوں میں معاً ایک ہی نشان ہے۔ اور وہ ولادت ہے بغیر مرد کے۔"

خاکسار کہتا ہے کہ اس کی نظیر آیت هُنَّ أُمُّ الْكِتٰبِ (آل عمران پ۳) (۶:۳) ہے کہ هُنَّ جمع کی خبر اُمّ واحد ہے کیونکہ مجموع آیات محکمات ایک شے ہے اور مجموع آیات متشابہات ایک شئی ہے[1] پس حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم میں ایک امر مشترک ہے اور دیگر امر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ثابت ہیں اور حضرت مریم کی نسبت نہیں۔

أَمَّا الْاِشْتِرَاكُ فَفِيْ أَنَّهَا وَلَدَتْهُ مِنْ غَيْرِ بَعْلٍ بِمَحْضِ قُدْرَةِ اللّٰهِ وَأَمَّا الْاِفْتِرَاقُ فَفِي التَّكَلُّمِ فِي الْمَهْدِ وَالْمُعْجِزَاتِ الدَّالَّةِ عَلٰى صِدْقِ النُّبُوَّةِ وَالرَّفْعِ إِلَى السَّمَآءِ حَيًّا وَالنُّزُوْلِ مِنْهَا فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ. (میر سیالکوٹی)

"اشتراک اس امر میں ہے کہ حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰؑ کو صرف خدا کی قدرت سے بغیر خاوند کے جنا۔ اور ان میں فرق ان امور میں ہے۔ ماں کی گود میں خلاف عادت باتیں کرنا اور معجزات جو صدق نبوت پر دلالت کرتے ہیں اور آسمان پر زندہ اٹھایا جانا اور آخری زمانہ میں وہاں سے نازل ہونا۔"

---

[1] مستفاد از تفسیر کبیر۔ ۱۲ منہ

حاصل کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن میں آیۃ کہا گیا اور امور خمسہ مذکورہ بالا ان کی نسبت قرآن وحدیث میں بطور خرق عادت ذکر کئے گئے۔ پس آپ ان سب میں آیت اللہ ہیں۔ ایسا نہیں کہ چونکہ آپ کو آیۃ کہا گیا ہے اس لئے پانچوں امور مذکورہ بالا ان میں بغیر قرآن وحدیث میں وارد ہونے کے بطور خرق عادت مانے جائیں۔ کیونکہ یہ نتیجہ بحسب واقعہ وذکر ہے۔ نہ بحسب علاقہ ولزوم۔ اسی لئے ہم اس بطور قضیہ اتفاقیہ[2] کے قرار دیتے ہیں نہ بطور قضیہ لزومیہ کے۔

تذییل:

اسی طرح فرعون کی نسبت وارد ہے لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (پ ۱۱: یونس) (۱۰:۹۲) اور وہ صرف اس کے دریا میں ہلاک ہونے اور پھر ذلت کے ساتھ ساحل پر پڑے رہنے میں ہے جیسا کہ سیاق آیت اس پر شاہد ہے۔ نیز اسی کے حق میں فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (پ۳۰: نازعات)

''اس (خدا) نے اس (فرعون) کو دنیا اور آخرت (ہر دو جہان) کے عبرتناک عذاب میں پکڑا۔ بیشک اس امر میں (خدا سے) ڈرنے

---

[1] قاضی اکمل صاحب اس لفظ آیت پر لکھتے ہیں ''دوسرے امور کے لئے آیت ٹھیرانا ضروری ہو تو کیا وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوا۔ جواب:- جناب یہ تو اللہ تعالیٰ سے پوچھئے کہ اس نے کیوں نہیں کہا۔ ہم نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ قرآن میں مذکور ہونے کے سبب نشان کی صورت مقرر کی ہے۔ اور ولادت بلا پدر اس کی مؤید ہے لیکن آپ اسے سمجھے نہیں۔ ۱۲ منہ

[2] ملا مبین نے شرح مسلم میں بحث شرطیات میں لفظ اتفاقیہ پر لکھا ہے بحیث یکون کلا النسبتین والعقین فی نفس الامر من غیر علاقۃ بینھما یعنی دونوں نسبتیں نفس الامر میں واقع ہوں اور ان میں علاقہ لزوم وتصایف نہ ہو۔'' ۱۲ منہ

والے کے لئے (بڑی بھاری) عبرت ہے۔" (۷۹: ۲۵و۲۶)

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام[1] کی شان میں فرمایا وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَةً لِلنَّاسِ (پ۳: بقرہ) (۲: ۲۵۹) یعنی "تا کہ ہم تجھ کو لوگوں کے لئے ایک نشانِ (قدرت) بنائیں" سو یہ بھی صرف اس امر میں ہے کہ مردوں کو پھر زندگی بخش دینا خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ[2] اور اس کے بعد فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[3] سے ظاہر ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ چونکہ خصوصیات مسیحیہ حضرت مریمؑ اور حضرت عزیر[4] علیہما السلام میں اور فرعون کے حق میں وارد نہیں ہوئیں۔ اس لئے ہم نہ تو ان کو ان امور میں آیت اللہ کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ ان کے متعلق یہ سوال اٹھ سکتا ہے۔ فَافْهَمْ وَ تَدَبَّرْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَاصِرِیْنَ۔

---

[1] قرآن مجید میں اس موقع پر حضرت عزیرؑ کا نام مذکور نہیں۔ مفسرین کی ایک بھاری جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ قصہ حضرت عزیر علیہ السلام کا ہے۔ سو بنا بر مشہور لکھا گیا واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ ۱۲

[2] یعنی خدا اس بستی کے مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ پس خدا نے اسے سو سال تک مارے رکھا' پھر زندہ کیا۔ (۲: ۲۵۹) ۱۲ منہ سعادت

[3] یعنی پس جب سب کچھ اس کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو کہنے لگا۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا ہر شے پر قادر ہے۔ (۲: ۲۵۹) ۱۲ سعادت

[4] قاضی اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں۔ "یہی لفظ (آیۃ) حضرت مریم علیہا السلام کے حق میں بھی وارد ہوا ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کے حق میں بھی اور پھر فرعون کے بارے میں بھی آیا ہے۔ (ص ۳)

جواب:- ہاں جناب آیا ہے۔ لیکن اس اعتراض میں آپ کا کیا کمال ہے یہ سوال تو میں نے خود ذکر کر کے اس کا جواب کافی ووافی دے دیا ہے۔ جسے آپ سمجھ نہیں سکے اگر اعتراض کرنا تھا تو اس جواب پر کرتے۔ ۱۲ منہ

☆ مطابق اصل ۱۲ منہ

تنبیہ

(دربارہ طریقِ بیان)

اثباتِ مدعا کے لئے صرف قرآن شریف سے تمسک کیا گیا ہے' اور رفع تنازع کے لئے کوئی امر ایسا نہیں لکھا جس کی تائید کتاب اللہ یا حدیث رسول اللہ ﷺ یا زبانِ عرب سے نہ ہوتی ہو۔ خواہ اسے کسی تفسیر سے لکھا ہے۔ خواہ استعدادِ خداداد سے سمجھا ہے۔ غرض جو کچھ لکھا ہے۔ مراد کتاب اللہ کے موافق لکھا ہے۔ خلاف نہیں لکھا۔ مفسرینؒ کے اقوال[1] صرف اس لئے ذکر کیے ہیں کہ اس زمانہ جہالت میں کفرانِ نعمت کی صعبتِ مذموم بڑھتی جاتی ہے۔ بنا برآں بعض مصنف تو تحقیقات کو اپنی طرف منسوب کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے ماخذ کا پتا نہیں بتاتے اور بعض آئمہ مفسرینؒ کے اقوال کو نظرِ عزت سے نہیں دیکھتے۔ لیکن خاکسار ان دونوں امروں میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں۔ جس امر کو کسی کتاب سے لیا ہے اس کا نام لکھ دیا ہے۔ اور مفسرین کے جس قول کو اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید قرآن و حدیث یا لغتِ عرب یا قواعدِ علمیہ سے کر دی ہے۔ پس جب قدر ناشناس لوگ سلف صالحین کے اقوال کو قرآن و حدیث اور لغتِ عرب اور قواعدِ علمیۂ سے مؤید پائیں گے۔ تو انشاء اللہ بدظنی دور ہو جائے گی۔ دوسرے اس غرض کے لئے کہ اپنے موافقین کو

---

[1] قاضی ظہور الدین صاحب اکمل قادیانی نے اپنی کتاب "شہادت الفرقان" کے شروع میں خاکسار کی اس کتاب شہادت القرآن کے نام کے متعلق لکھا ہے۔ "نام تو شہادت القرآن ہے۔ مگر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ شہادۃ تفاسیر ہے۔" (ص ۳)
جواب: ۔ خدا جانے قادیانیوں کی سمجھ کو کیا ہو گیا؟ تفاسیر کے حوالہ جات جس غرض کے لئے دیئے گئے ہیں۔ وہ صاف صاف بیان کر دی گئی ہے۔ پھر بھی کہتے ہیں شہادۃ تفاسیر ہے۔ قاسم ۱۲ منہ

زیادت اطمینان حاصل ہو اور اپنے پرے ظن تفسیر بالرائے دور ہو جائے۔

تیسرے اس لئے کہ نازک خیالی کے مدعی جو حقیقت میں تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ جان لیں کہ وہ سلف صالحین اور متقدمین اسلام کے فہم و ادراک کو نہیں پہنچ سکتے۔

اَللّٰهُمَّ انت عضدی و نصیری بک اعتصم عما یصم و انا

عبدک الناسوتی محمد ابراهیم میر السیالکوتی

فصل اوّل

در بیانِ عدم مصلوبیتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

چونکہ مرزا صاحب قادیانی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کا افتتاح مسئلہ صلیب سے کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ ان کے نزدیک بمنزلہ بنا کے ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی پہلے اس کی تحقیق کریں۔ کہ آیا یہ واقعہ صلیبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت درست ہے یا نہیں؟ سو اس کے لئے بیان ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

اس بات کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اب سے قریباً دو ہزار سال قبل کے واقعہ کے صحت و صداقت کے لئے کسی زبردست قابل اعتبار شہادت و سند کی ضرورت ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال سے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن مجید یا حدیث صحیح مرفوع میں اس کی تصریح ہو۔ دوم یہ کہ نزولِ قرآن سے قبل کی کتابوں یا روایتوں میں اس کا ذکر ہو۔ بشرطیکہ وہ قرآن و نبی ﷺ کی تصریح کے خلاف نہ ہوں' اور زمانہ کے دست برد' لوگوں کے جعل و تصرف اور ان کے رد و بدل اور تحریف و تبدیل سے محفوظ چلی آئی ہوں۔ اور ان کے مصنفین تک ان کا سلسلۂ روایت صحتِ سند سے پہنچا ہو' اور پھر ان مصنفین نے اسے معتبر ذرائع و قابلِ وثوق وسائل سے معلوم کر کے درج کیا ہو۔ سو قرآن شریف میں تو صاف طور پر مَا صَلَبُوْهُ (پ ۶: نساء) مذکور ہے۔ جس کے خلاف ایک مسلمان کسی بھی دیگر شہادت کو ہرگز نہیں مان سکتا۔ اور نہ اس کے بعد تحقیقات کی کوئی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ہاں بے شک مسیحی اسفار میں صلیب کا واقعہ حضرت مسیح کی نسبت اثبات میں مذکور ہے۔ اور ان ہی کی بنا پر سر سید احمد

صاحب علی گڑھی نے صلیب و وفات مسیح کا واقعہ لکھا[1] جن کی پیروی میں مرزا صاحب بھی باضافۂ دعوائے مسیحیت صلیب و وفات مسیح کے قائل ہوئے۔ ان مسیحی کتابوں کے سوا دونوں صاحبوں کے ہاتھ میں اسلامی کتب میں سے کچھ بھی نہیں۔ اور یہ محقق ہو چکا ہے کہ یہ کتابیں محض جعلی ہیں اور ان کے بیانات ہرگز قابل وثوق نہیں ہیں[2]

چونکہ ہم نے اس کتاب میں التزام کیا ہے کہ اپنے دعویٰ اور دلیل کی بنا قرآن کریم پر رکھیں۔ اس لئے ہم قرآن شریف کی چند آیات سے ثابت کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت واقعہ صلیبی محض دروغ ہے۔

پہلی آیت:- (قال اللہ تعالیٰ) وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ. (پ ۳: آل عمران) یعنی "یہود نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور صلیب پر چڑھانے کی) تدبیر کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ایک تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔" (۳:۵۳)

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ امام رازیؒ نے اس آیت مندرجہ عنوان کے ذیل میں لفظ مکر کی تحقیق میں فرمایا ہے۔

لِأَنَّهٗ عِبَارَةٌ عَنِ التَّدْبِيْرِ الْمُحْكَمِ الْكَامِلِ ثُمَّ اخْتُصَّ فِي الْعُرْفِ بِالتَّدْبِيْرِ فِيْ إِيْصَالِ الشَّرِّ إِلَى الْغَيْرِ.

"مکر سے تدبیر محکم اور کامل مراد ہے۔ پھر عرف عام میں یہ لفظ ایسی تدبیر میں خاص ہو گیا جو کسی دوسرے کو ضرر پہنچانے کے لئے کی جائے۔" (تفسیر کبیر جلد دوم ص)

امام رازی کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔ اور کتاب اللہ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

چنانچہ فرمایا:-

---

[1] دیکھو تفسیر القرآن مصنفہ سر سید مرحوم سورۂ آل عمران۔ ۱۲ منہ

[2] مسیحی کتب کی رو سے اس واقعہ کی تحقیق الگ رسالہ میں کی جائے گی۔ انشاء اللہ ۱۲ منہ

وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (۳۵:۱۰) (وقال) فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا۝ ن اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ. (پ۲۲:فاطر)

''اور جو لوگ بد اندیشیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان کو سخت عذاب ہوگا اور ان کا مکر ہی تباہ ہوگا۔ نیز فرمایا پس جب ان کے پاس ڈرانے والا (نبی ﷺ) آ گیا تو ان کو سوائے نفرت و بھاگنے کے اور کچھ حاصل نہ ہوا' بوجہ زمین میں بڑائی چاہنے کے اور بد اندیشی کرنے کے اور بد اندیشی کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے۔'' (۳۵:۴۲و۴۳)

پہلی آیت میں تو سَیِّئَات کو فعل یمکرون کا مفعول گردانا۔ اور دوسری میں دو دفعہ مکر کو سَیِّئ سے موصوف کیا' جس سے صاف ثابت ہے کہ اصل لغت میں مکر کے معنی صرف تدبیر کرنے کے ہیں۔ نیز اس آیت زیر بحث یعنی وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ کو وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ پر ختم کرنا بھی اس امر کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ تدبیرِ الٰہی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں خیر ثابت ہوئی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شرِ اعداء سے بالکل محفوظ رکھا اور آسمان پر اٹھا لیا اور یہود کے حق میں شر ہوئی کہ ان کو مکر میں ناکام رکھا۔ اور ان میں سے ایک شخص پر عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی۔ جس کو انہوں نے پکڑ کر صلیب پر چڑھایا۔ اور قتل کیا۔ جیسا کہ مفصل مذکور ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جملہ مَكَرَ اللّٰهُ میں مکر کو خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی بھی قباحت و اعتراض نہیں۔

سوال:- مَكَرُوْا میں ضمیر فاعلی کس کی طرف راجع ہے؟

جواب:- کفار بنی اسرائیل کی طرف۔ جن سے عیسیٰ علیہ السلام نے احساسِ کفر کیا تھا' چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے۔ الواو لِكُفَّارِ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ الَّذِيْنَ اَحَسَّ مِنْهُمْ

الکفر. (کشاف جلد اوّل) ایسا ہی دیگر تفاسیر مثل سراج منیر. بیضاوی خازن. مدارک. جلالین. معالم. جامع البیان. ابن کثیر. ابی السعود. عباسی اور تفسیر فیضی میں ہے۔

مفسرین کا یہ قول بالکل راست اور مطابق قرآن مجید ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ الآیہ (پ ۷: مائدہ)

اے عیسیٰ! جب ہٹائے رکھا میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو[1] (۵:۱۱)

سوال:- یہود کا یہ مکر کس امر کے لئے تھا؟

جواب:- اس امر کے لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالیں[2] چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے وَ مَكْرُهُمْ اَنَّهُمْ وَكَّلُوْا بِهٖ مَنْ یَّقْتُلُهٗ غِیْلَةً یعنی ''یہود بے بہبود کا مکر یہ تھا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایک ایسا شخص مقرر کیا۔ جو ان کو فریب سے قتل کر ڈالے۔'' اور غیلہ بالکسر کی تعریف سراج منیر میں یہ لکھی ہے کہ کوئی کسی کو دھوکے سے کہیں لے جائے۔ جب وہاں پہنچے تو اسے قتل کر ڈالے وَهِیَ بِالْكَسْرِ اَنْ یُّخْدَعَ غَیْرَهٗ فَیَذْهَبَ بِهٖ اِلٰی مَوْضِعٍ فَاِذَا صَارَ اِلَیْهِ قَتَلَهٗ (تفسیر السراج المنیر جلد اوّل) اسی طرح دیگر تفاسیر مثل رحمانی. سواطع.

---

[1] اس آیت کی پوری تفسیر آگے آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

[2] اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں۔ ''آپ نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ یہ مکر عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے تھا بس جناب اس پر صلیب کے حاشیے نہ چڑھائیے۔ (ص ۶) جواب:- قتل ایک ایسا فعل ہے جس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک ان میں سے صلب بھی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے مکے سے جو قبطی مرا تھا۔ اس پر بھی قتل کا لفظ آیا ہے۔ خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو مارا تھا۔ اس پر بھی اور میدان جنگ میں جو مارے جاتے ہیں ان پر بھی قتل کا لفظ آیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی صورت صلب تھی۔ اور اسے مرزا صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں پھر خدا جانے اکمل صاحب کیوں انکار کرتے ہیں لطف یہ کہ آگے چل کر خود بھی اسے تسلیم کرتے ہیں دیکھو ص ۱۲ و ۱۳ ان کی کتاب کا) کہ کتنی جگہ صلب کو قتل کے ساتھ ضم کیا ہے۔ جناب والا! جب آپ کے نزدیک صلب کے معنی صلیب پر قتل کرنے کے ہیں۔ تو ساتھ قتل کیوں لکھے جاتے ہیں۔ سعادت

جلالین. جامع. البیان. معالم. تفسیر حافظ ابن کثیر. سراج منیر. تفسیر علامہ ابی السعود. لباب التاویل. مدارک. کبیر. انوار التنزیل. عباسی. ان سب تفاسیر میں بالا تفاق یہی لکھا ہے کہ یہود کا مکر یہ تھا۔ کہ عیسیٰ کو قتل کر ڈالیں۔ بلکہ ابن کثیر اور مدارک میں قتل کے ساتھ صلب کو بھی ضم کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر مدارک میں ہے:۔

حِیْنَ اَرَادُوْا قَتْلَهٗ وَصَلْبَهٗ.

یعنی "جب انہوں آپ کو قتل کرنے اور سولی دینے کا ارادہ کیا۔"

سوال:۔ یہ مکر اور تدبیر قتل وصلب کس کے حق میں کی گئی؟

جواب:۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں۔ چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے ای کفار بنی اسرائیل بعیسیٰ اسی طرح دیگر تفاسیر مثل ابن کثیر. مفاتیح الغیب. ارشاد العقل السلیم. لباب التاویل. مدارک. کشاف الحقائق. عباسی. تبصیر الرحمٰن. سواطع الالہام. جامع البیان. معالم. فتح البیان. السراج المنیر. انوار التنزیل. ان سب تفاسیر میں بالاتفاق یہی لکھا ہے۔ کسی میں اسم ظاہر ہے اور کسی میں صرف ضمیر پر اکتفا کیا گیا ہے۔

مفسرینؒ کا یہ قول بالکل حق اور مطابق کتاب اللہ ہے جیسے سورۂ مائدہ میں وارد ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمائے گا۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ.

(پ ۷: مائدہ ۱۱۰)

(اے عیسیٰ! وہ وقت یاد کر) جب میں نے تجھ سے بنی اسرائیل کو دور ہٹائے رکھا۔ جب تو ان کے پاس روشن دلائل لایا تو ان میں سے منکروں نے کہا کہ یہ تو (سراسر) صریح جادو کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

سوال:- یہود نے یہ مکر اور تدبیر قتل آپ کے حق میں کیوں کی؟

جواب:- یہود نے آپ کے معجزات کو جادو قرار دے کر آپ کو جادوگر ٹھیرایا۔ اور پھر قتل کا حکم لگایا۔ اور اس کی صورت صلیب پر کھینچنا تجویز کی۔ چنانچہ اوپر کی آیت میں معجزات کو جادو قرار دینا صاف مذکور ہے۔ اور آیت مندرجہ عنوان کے قبل بھی ذکر معجزات اس امر پر دلالت کر رہا ہے اور فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ کے یہی معنی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کفار یہود سے مکر قتل کا احساس کیا۔ اس جگہ کفر بمعنی قتل من باب تَسْمِيَةُ الشَّيْءِ بِاسْمِ سَبَبِهٖ ہے یعنی کسی شے کے لئے وہ نام بولنا جو اس کے سبب کا نام ہے۔" چنانچہ مطول میں لکھا ہے:-

رَعَيْنَا الْغَيْثَ اَیِ النَّبَاتَ الَّذِیْ سَبَبُهُ الْغَيْثُ. (مطول)

"چرائی ہم نے بارش یعنی نباتات جس کے اگنے کا سبب بارش ہے۔"

اسی طرح آیت وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ (پ۲۵: جاثیہ (۵:۴۵) میں "رزق بمعنی مطر یعنی بارش ہے سبب ہے رزق کے پیدا ہونے کا" پس رزق مسبب ہے۔ اسی طرح اس کے نظائر قرآن شریف میں بکثرت ہیں اور کتب بلاغت میں اس قاعدے کی تصریح موجود ہے۔ دیگر یہ کہ کفر کا احساس کے ساتھ ذکر کرنا بھی اس امر کا مؤید ہے کہ اس جگہ کفر سے مراد قتل ہے۔ کیونکہ احساس ایسے مواقع میں اس جگہ مستعمل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی خوفناک امر ہو جیسے آیت فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ (پ۱۷: انبیاء) اور نیز آیت اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ (پ۴: آل عمران) ای تَقْتُلُوْنَهُمْ قَرِيْبًا مِنْ اَحَسَّهٗ اِذَا اَعْلَمَ حِسَّهٗ اِفْلَاكًا.

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ میں کفر بمعنی قتل ہے۔ پس مکر یہود کی صورت ارادۂ قتل و صلب عیسیٰ علیہ السلام متعین ہو گئی۔

سوال:- کیا مفسرین کے اس قول کی تائید قرآن شریف سے ہو سکتی ہے کہ مکر سے مراد قتل ہے؟

جواب:- کیوں نہیں؟ بے شک مفسرینؒ کے بیان کی تائید میں کئی آیات ہیں۔

منها قول تعالیٰ حاکیا عَنْ اِخْوَۃِ یُوْسُفَ اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْہُ اَرْضًا. (پ۱۲:یوسف)

''یوسف کو قتل کر ڈالو یا اسے کسی زمین میں پھینک دو۔'' (۹:۱۲)

اور اس تدبیر قتل کا نام مکر رکھا۔ چنانچہ اسی سورہ یوسف ہی میں وَھُمْ یَمْکُرُوْنَ (پ۱۳)(۱۰۲:۱۲) فرمایا۔ اور نیز سورہ نمل میں صالح علیہ السلام کے بیان میں فرمایا:

وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَۃِ تِسْعَۃُ رَھْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰہِ لَنُبَیِّتَنَّہٗ وَاَھْلَہٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّہٖ مَاشَھِدْنَا مَھْلِکَ اَھْلِہٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ.

''اور اس شہر میں نو شخص تھے۔ جو زمین میں فساد کرتے تھے۔ اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ خدا کی قسم کھاؤ کہ اس (صالح علیہ السلام) کو اور اس کے اہل کو راتوں رات قتل کر ڈالیں گے۔ پھر اس کے ولی کو کہیں گے کہ ہم تو اس کے قتل کے موقع و وقت پر حاضر نہ تھے اور ہم ضرور سچے ہیں۔'' (۲۷: ۴۸، ۴۹)

یعنی نو مفسدوں نے آپس میں یہ منصوبہ باندھا اور اس پر قسمیں کھانے کو کہا' کہ صالح علیہ السلام کو اور آپ کے اہل کو راتوں رات قتل کر ڈالیں۔ ان کی اس تدبیر شر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اس سے آگے فرمایا۔ وَمَکَرُوْا مَکْرًا. الآیہ. یعنی ''انہوں نے بڑا بھاری مکر کیا'' یعنی پوشیدہ طور پر نبی صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی تدبیر کی' اسی طرح حضرت سید المرسلین خاتم النبیین ﷺ کی نسبت کفار نے جو مشورت کی اس کی نسبت فرمایا۔

وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ.

(پ۹: الانفال)(۳۰:۸)

"اور جب کفار تدبیر کرتے تھے۔ کہ تجھے قید کرلیں۔ یا جلا وطن کردیں یا قتل کر ڈالیں وہ بھی تدبیر کرتے تھے اور خدا بھی تدبیر کرتا تھا اور خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسبت کفار نے جو مشورہ کیا اس کی نسبت فرمایا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَن قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ۔
(پ۲۰:عنکبوت)

"اور اس کی قوم سے کوئی جواب نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا۔ اسے قتل کر ڈالو یا آگ میں جلا ڈالو۔" (۲۹:۲۴)

اور ان کے منصوبہ کا نام کید رکھا۔ چنانچہ سورۂ انبیا میں فرمایا۔ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ انہوں نے اس کی نسبت خفیہ تدبیر کی پس ہم نے انہی کو نہایت زیاں کار کر دیا۔" (انبیاء پ۱۷:۲۱:۷۰)

اور مکر اور کید مترادف ہیں۔ چنانچہ مصباح میں ہے۔ کَادَهُ. "مَكَرَ بِهِ"

سوال:- کفار ماکرین کے ساتھ سنتِ الٰہیہ کیا ہے۔ اور ان کے مکر کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟

جواب:- ماکرین کو ہلاک کرنا اور ان کے مکر کا وبال انہی پر نازل کرنا اور اپنے عباد مرسلین کو ان کے مکر سے بچالینا۔

دلیل:- اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاطر وغیرہ میں فرمایا۔

وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ. (وقال) وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (فاطر) (وقال) وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (المومن) (وقال) وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ (انبیاء) (وقال) فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ

الْاَسْفَلِیْنَ (صافات) (وقال) قَدْ مَکَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (النحل) (و قال) وَقَدْ مَکَرُوْا مَکْرَهُمْ وَ عِنْدَاللّٰهِ مَکْرُهُمْ وَ اِنْ کَانَ مَکْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ (وقال) فِیْ هٰذَا الْوَعْدِ بِرُسُلِهٖ وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (صافات) (وقال ایضاً) کَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (مجادله) (وقال) وَکَانَ فِی الْمَدِیْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ یُّفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَاشَهِدْنَا مَهْلِکَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصَادِقُوْنَ وَ مَکَرُوْا مَکْرًا وَّمَکَرْنَا مَکْرًا وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ مَکْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَ قَوْمَهُمْ اَجْمَعِیْنَ۔ فَتِلْکَ بُیُوْتُهُمْ خَاوِیَةً بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ وَ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ (النمل)

ترجمہ:۔ یعنی جو لوگ بری تدبیریں اور منصوبے باندھتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اور ان کا مکر ہی ہلاک ہوگا اور نیز فرمایا اسی سورت میں کہ بری تدبیر کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے۔ اور نیز سورۂ مومن میں فرمایا کہ ہر امت نے اپنے رسول کو ماخوذ کرنے پر کمر باندھی۔ پس میں نے انہی کو عذاب میں گرفتار کیا۔ پس میرا عذاب ان پر کیسا سخت ہوا۔ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں جو مکر اور کید ان کی قوم نے کیا تھا۔ اس کی بابت فرمایا کہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک بھاری مکر کرنا چاہا۔ پس ہم نے

انہیں کو سخت زیاں کار اور سخت پست اور ذلیل کر دیا۔ اور نیز سورۂ نحل
میں فرمایا کہ کفار مکہ کے پیشتر بہت لوگوں نے مکر اور تدابیر کیں۔ پس
اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارات کو بنیادوں سے گرا دیا۔ اور ان پر چھت
ان کے اوپر سے گر پڑے۔ اور ان کو ایسی جگہ سے عذاب آیا۔ جہاں
سے ان کو شعور بھی نہ تھا۔ اور نیز سورۂ ابراہیم میں بڑے زور اور تاکید
سے فرمایا کہ کفار مکہ نے جہاں تک ان سے ہو سکا' بہت سی تدبیریں
کیں اور اللہ تعالیٰ کو ان کی سب تدبیریں معلوم ہیں۔ اگرچہ ان کی
تدابیر اور مکر ایسے زبردست اور محکم ہوں کہ ان سے زوالِ جبال یعنی
پہاڑوں کا گر جانا ممکن ہو سکے۔ تو بھی ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ
کبھی بھی اس وعدے کے خلاف کرے گا۔ جو اس نے اپنے رسولوں
سے کیا ہوا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب ہے۔ اور اعداء سے بدلہ لینے
والا ہے۔ اور اس وعدے کی نسبت سورۂ صافات میں فرمایا۔ کہ بیشک
ہمارا اپنے عبادِ مرسلین سے پہلے ہی وعدہ ہو چکا ہوا ہے۔ کہ وہ ضرور
ضرور منصور ہوں گے۔ اور نیز سورۂ مجادلہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ
امر مقرر کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور ضرور غالب رہیں
گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور بڑا غالب ہے اور سورۂ نمل
میں حضرت صالح علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا کہ اس شہر میں نو شخص
مفسد اور غیر مصلح تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ صالح علیہ السلام
اور آپ کے اہل بیت کو راتوں رات قتل کرنے پر قسمیں کھاؤ اور اس
پر بھی کہ پھر اس کے ولی یعنی حامی و وارث کو کہیں گے۔ کہ ہم تو اس
کے اہلِ بیت کے مرنے کے موقع اور وقت پر حاضر ہی نہ تھے۔ اور ہم
ضرور سچے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ انہوں نے بڑا
بھاری مکر کیا تھا' اور ہم نے بھی مکر (تدبیر محکم) کیا اور وہ ہماری تدبیر

کا شعور نہ رکھتے تھے۔ پس دیکھ ان کے مکر کا انجام کیا ہوا۔ کہ ہم نے
ان تو مفسدوں اور ان کے باقی حامی کاروں سب کو بالکل ہلاک کر
دیا۔ پس یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب اجڑے پڑے ہیں بیشک
اس معاملہ میں علم والے یعنی سمجھ والے لوگوں کے لئے (رسولوں کی
نصرت اور ان کے دشمنوں کی ذلت کا) بڑا بھاری نشان ہے اور ہم
نے مؤمنین اور متقین یعنی اتباع صالح علیہ السلام کو بچا لیا۔" انتہی

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں رسل اللہ کے برخلاف کفار کے مکر کا ذکر ہے۔ اس جگہ یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو ان کے مکر اور شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور الٹا ماکرین ہی پر وبال و عذاب نازل کیا کرتا ہے۔ سو اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں بھی اسی طرح کی آیت آئی ہے۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت سید المرسلین ﷺ کے حق میں وارد ہے۔ یہ کس قدر غلط اور لغو بات ہے کہ جو الفاظ دیگر رسولوں کے محفوظ رہنے پر دلالت کریں۔ انہی الفاظ کے ہوتے حضرت کلمۃ اللہ و روح اللہ علیہ السلام اس قدر ذلت اور خواری سے صلیب پر کھینچے جائیں کہ آپ کی مبارک رانوں پر میخیں لگائی جائیں اور آپ کے پاک ہاتھوں میں کیلیں ٹھونکی جائیں۔ اور آپ کے مقدس سر پر کانٹوں کی ٹوپی پہنائی جائے۔ اور آپ کے خزانہ حکمت کی پسلی میں تیر مارا جائے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ جس امر کی تاکید کے لئے اللہ تعالیٰ اس قدر تاکید فرمائے اور بانظام بیان کرے۔ اسی امر کو برخلاف مراد الٰہی اپنا عقیدہ بنایا جائے۔

سوال:۔ وَمَكَرَ اللهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر کی۔ یہ تدبیر الٰہی کیا تھی؟

جواب:۔ یہود کے خلاف اللہ تعالیٰ کا مکر یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا۔ اور انہی میں سے کسی کو آپ کا ہم شکل بنا دیا۔ جس کو یہود نے صلیب پر چڑھا کر قتل کیا۔ چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے وَمَكْرُ اللهِ ان رَفع عيسىٰ الى

السماء والقٰی شِبْھَہٗ علی من اراد اغتیالہ حتیٰ قُتِل یعنی" اللہ کا مکر اور اس کی تدبیر یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور آپ کی شکل اور شباہت اس شخص پر ڈال دی۔ جس نے آپ کو دھوکے سے قتل کرانا چاہا تھا۔ حتیٰ ...... کہ وہ قتل کیا گیا۔" اسی طرح تفسیر جلالین میں بھی ہے۔

ومکر اللّٰہ بھم بان القٰی شبہ عیسٰیؑ علٰی من قصد قتلہ فقتلوہ و رفع عیسٰی انتھٰی.

"اور خدا کا مکر ان سے یہ تھا کہ عیسیٰ کی شباہت اس پر ڈال دی۔ جس نے آپ کے قتل کا قصد کیا تھا سو انہوں نے اسے قتل کیا اور خدا نے عیسیٰ کو اوپر اٹھا لیا۔"

اور اسی طرح تفسیر علامہ ابی السعود میں بھی ہے۔

بِاَنْ رَفَعَ عِیْسٰی علیہ الصلوٰۃ والسّلامُ والقٰی شِبْھَہٗ عَلٰی من قصد اغتیالہ حتیٰ قُتِلَ. ۱۲

"کہ خدا نے عیسیٰ کو اوپر اٹھا لیا۔ اور ان کی شباہت اس پر ڈال دی جس نے آپ سے فریب کا قصد کیا تھا۔ چنانچہ وہ قتل کیا گیا۔"[1]

---

[1] اکمل صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں "ان میں سے کسی کا قتل ہونا بھی ضروری تھا تو ثابت کرتے کہ حضرت ابراہیم کی جگہ بھی کوئی آگ میں ڈالا گیا اور ہماری سرکار ﷺ کے غار میں رہنے کے عوض کوئی اور غار میں رہا۔" (ص ۸) جبکہ ایک رسول کی شکل ایک کافر پر ڈالی گئی اور حکم ہمیشہ ظاہر پر کیا جاتا ہے ۱۲ (ص ۸ ملخصاً) ان دونوں کا جواب بصراحت سوال کر کے دے دیا گیا تھا۔ لیکن اکمل صاحب نے عشوہ نمائی کی۔ جناب! عالم امکان میں ممکنات کی صورتیں بہت ہوتی ہیں۔ ہر ممکن درجۂ وجوب میں آنے سے پہلے ہر صورت کا احتمال رکھتا ہے' لیکن جب واقع ہو جائے۔ تو بس اسی میں ماننا پڑتا ہے پھر اس میں احتیاج دلیل وخبر کی ہوتی ہے۔ جب واجب ہو گیا تو باقی سب احتمالات اور امکانی صورتیں جاتی رہیں اور ظاہر پر حکم تب ہوتا ہے۔ جب حقیقت معلوم نہ ہو۔ جب حقیقت مَا صَلَبُوْہُ وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ سے معلوم ہو چکی تو ظاہر باطل ہو گیا۔ فافھم منہ ۱۲۔ سعادت

اور اسی طرح تفسیر مدارک میں ہے۔

بان رفع عیسٰی اِلَی السمآء والقٰی شبھہ علٰی من اراد اغتیالہ حتٰی قتل (مدارک)

''کہ خدا نے عیسٰیؑ کو آسمان پر اٹھالیا۔ اور آپ کی شباہت اس پر ڈال دی۔ جس نے آپ سے فریب کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ قتل کیا گیا۔''

اور اسی طرح ابن کثیر میں بھی ہے:۔

فلما احاطوا بمنزلہ و ظنّوا انھم ظفروا بہ نجّاہ اللّٰہ تعالٰی من بینھم و رفع من روزنۃ ذالک البیت الی السمآء واُلقی شبھہ علٰی رجل ممن کان عندہ فی المنزل۔ فلمّا دخل اولٰئک اعتقدوہ فی ظلمۃ اللیل عیسٰیؑ فاخذوہ و صلبوہ و وضعوا علٰی راسہ الشوک و کان ھذا مکراللّٰہ بھم فانہ نجّٰی نبیّہٗ ورفعہ من بین اظھرھم و ترکھم فی ضلالھم یعمھون. (ابن کثیر جلد سوم)

''جب یہود نے آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ اور گمان کیا کہ آپ پر غالب ہو گئے ہیں تو خدا نے ان کے درمیان سے آپ کو نکال لیا اور اس مکان کی کھڑکی سے آسمان پر اٹھالیا۔ اور آپ کی شباہت اس پر ڈال دی جو مکان میں آپ کے پاس تھا۔ سو جب وہ اندر گئے تو اس کو رات کے اندھیرے میں عیسٰی علیہ السلام خیال کیا۔ پس اسے پکڑا اور سولی دیا اور سر پر کانٹے رکھے اور ان کے ساتھ خدا کا مکر یہی تھا کہ اپنے نبی کو بچالیا اور اسے ان کے درمیان سے اوپر اٹھالیا اور ان کو ان کی گمراہی میں حیران چھوڑ دیا۔''

اور اسی طرح تفسیر بیضاوی میں بھی ہے۔

حین رفع عیسٰی علیہ السلام والقٰی شبھہ علٰی من قصد

اغتياله حتى قتل. (بیضاوی)

"جب عیسیٰ کو اوپر اٹھا لیا اور آپ کی شباہت اس پر ڈال دی۔ جس نے آپ کو فریب سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا حتیٰ کہ وہی قتل کیا گیا۔"

اسی طرح دیگر تفاسیر مثل رحمانی۔ فتح البیان۔ معالم۔ سراج منیر۔ فیضی۔ عباسی۔ کبیر۔ جامع البیان میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے پانچ وجہیں ذکر کی ہیں۔ پہلی تین میں بالتصریح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور کسی پر آپ کی شباہت ڈالے جانے کا ذکر کیا اور چوتھی میں کسی ظالم بادشاہ کا بنی اسرائیل پر مسلط کر دینا۔ مکر الٰہی ٹھہرایا۔ ناقد بصیر پر ظاہر ہے کہ یہ وجہ منافی وجوہ سابقہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ ضم کی جا سکتی ہے۔

پانچویں وجہ علیٰ سبیل الاحتمال یہ فرمائی:۔

يحتمل ان يكون المراد انهم مكروا فی اخفاء امره وابطال دينه و مكر الله بهم حيث اعلى دينه واظهر شريعته وقهر بالذل والدناءة اعداءه وهم اليهود. (تفسیر کبیر جلد ثانی)

"احتمال ہے کہ اس سے یہ مراد ہو کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امر کے مخفی رکھنے اور آپ کے دین کے ابطال میں تدبیر کی اور خدا نے ان سے یہ تدبیر کی کہ آپ کے دین کو بلند کیا۔ اور شریعت کو غالب کیا۔ اور نہایت ذلت اور پستی سے آپ کے دشمنوں کو مغلوب کیا اور وہ یہودی ہیں۔"

اوّل تو اس وجہ کی تضعیف خود امام رازیؒ نے کلمۂ احتمال سے کر دی ہے۔ دیگر یہ کہ اس وجہ اور قول جمہور مفسرین میں منافات نہیں۔ کیونکہ ان میں نسبت سبب اور مسبب کی ہے۔ کیونکہ نبی برحق کا آسمان پر اٹھایا جانا اس نبی کی فضیلت کا مستلزم ہے اور دشمنوں کی ذلت و ناکامی کا موجب ہے۔ فلا منافاة بينهما اصلاً ("پس ان دونوں میں ہرگز کوئی منافات نہیں۔")

سوال:۔ مفسرین علیہم الرحمۃ نے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر یہ تھی کہ ایک اور

شخص کو جس نے عیسیٰ کو پکڑوانا چاہا تھا۔ صلیب پر چڑھوا کر قتل کرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا۔ کیا ان ہر دو امر کی تائید قرآن شریف سے ہو سکتی ہے؟

جواب:- بیشک مفسرینؒ نے یہ سب کچھ قرآن شریف ہی سے لکھا ہے۔ امر اوّل کا بیان وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں مصرح ہے اور فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اس کا مؤید ہے۔ اور امر ثانی کی تصریح میں انی متوفیک ورافعک الیّ اور بل رفعه اللّٰه موجود ہیں۔ ان کی تفصیل موقع پر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوال:- وَاللّٰهُ خیر الماکرین میں بجائے اسم مضمر کے اسم ظاہر کیوں اختیار کیا گیا ہے؟ وھو خیر الماکرین کیوں نہیں کہا گیا؟

جواب:- قرآن شریف میں اللہ جل جلالہ کے اسمائے حسنیٰ بکثرت ہیں۔ اور وجہ اس کثرت کی یہ ہے کہ چونکہ قرآن شریف کی آیات مثل دعاوی مع بینات کے ہیں۔ اس لئے ذکر ہر اسم کا حسبِ اقتضائے مقام ہوتا ہے۔ اور وہ اسم بمنزلۂ دلیل وعلت کے ہوتا ہے۔ چونکہ آیتِ مانحن فیھا موقع نصرتِ حضرت روح اللہ رسول برحق اور ذلت اعداء میں وارد ہے۔ اس لئے اسم جلالۃ (اے اللہ) کو بوجہ مہابت واثباتِ رسالت وحفاظتِ رسول کمال مناسبت ہے۔ جیسا کہ سورۂ مجادلہ میں ہے:-

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ○

(پ ۲۸: مجادلہ) (۵۸:۲۱)

"اللہ تعالیٰ نے یہ امر مقرر کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور ضرور غالب رہیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑا قوی اور غالب ہے۔"

چونکہ یہ آیتِ سورۂ مجادلہ بھی کفار پر رسول کو غالب کرنے کی بابت وارد ہے اس لئے ذکر اسم جلالۃ (ان اللہ) کا کیا۔ اور آخر میں اسم جلالۃ کے ساتھ قوت اور غلبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو بمنزلہ علت کے ہے۔

ولا یخفی امثال ذالک علی المتامل و من لم یعط حظا من ذالک فلا یلومن الا نفسه وھمته.

"اور ایسی باتیں اس پر مخفی نہیں۔ جو تامل کرنے والا ہو اور جس کو اس ملکہ میں سے حصہ نہ ملا ہو۔ وہ سوائے اپنے نفس کے کسی کو ملامت نہ کرے۔"

چنانچہ تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں علامہ ابوالسعود اسعدہ اللہ بالفوز بجنت النعیم اسی آیت میں فرماتے ہیں:-

واظهار الجلالة فی موضع الاضمار لتربية المهابة والجملةُ تذييل مقرر لمضمون ما قبله (ابوالسعود)

"موضع اضمار میں اسم جلالۃ کو ظاہر لانا تربیت مہابت کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ تذییل ہے جو مضمون ماقبل کی تقریر اور اثبات کرتا ہے۔"

سوال:- واللہ خیر الماکرین کی تفسیر کس طرح پر ہے؟

جواب:- اس آیت سے مقصود اس امر کا اظہار ہے کہ اللہ قدیر کی تدبیر کے مقابلہ میں مخلوق عاجز کی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی تدبیر اپنے رسولوں کے حق میں خیر ہوتی ہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں بھی تدبیر خیر کی کہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا[1]

سوال:- بے شک ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ ماکرین مکر میں ناکام رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ الٹا ان ہی پر عذاب نازل کرتا ہے مگر قرآن شریف میں یہود کے بعض انبیا کے قتل کرنے کا جو ذکر آیا ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

جواب:- قرآن کریم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں شرک پھیلنے

---

[1] اکمل صاحب اس پر لکھتے ہیں "رسولوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر بیشک خیر ہی ہوتی ہے۔ مگر تدبیر خیر سے خواہ مخواہ آسمان پر اٹھا لینا مراد لینا ہٹ دھرمی ہے۔" (ص ۹۷ حاشیہ نمبر ا) جواب خواہ مخواہ مراد نہیں لی۔ بلکہ بیان قرآنی سے لی ہے۔ اسے آپ ہٹ دھرمی کہتے ہیں تو پڑے کہیں اور یاد رکھیے کہ لزوم واقعہ اور وقوع واقعہ میں فرق ہوتا ہے۔ فافہم ۱۲ منہ۔ سعادت۔

کے بعد رسل اللہ تین طرح پر بھیجے گئے ہیں۔ اول وہ رسول جو اصحاب شرائع ہیں اور وہ پانچ ہیں۔ نوح نبی اللہ۔ ابراہیم خلیل اللہ۔ موسیٰ کلیم اللہ۔ عیسیٰ روح اللہ۔ محمد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ۔ جیسا کہ فرمایا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (پ۲۵:شوریٰ) (وَ قَالَ) وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (پ۲۱:الاحزاب)(۳۳:۷)

”خدا نے تمہارے لئے وہ دین مقرر کیا ہے جس کی تاکید نوحؑ کو کی تھی۔ اور جو (اے پیغمبرؐ) ہم نے تیری طرف وحی کیا اور جس کی تاکید ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی تھی۔“ (۴۲:۱۳) نیز فرمایا ”اور جب ہم نے سب نبیوں سے اور (اے پیغمبرؐ) تجھ سے بھی اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ سے بھی اقرار لیا۔“

آیت احزاب میں تخصیص بعد تعمیم کا فائدہ مزید کرامت اور زیادتِ شرافت ہے اور وہ ان کا اصحابِ شرائع ہونا ہے جیسا کہ آیت شوریٰ میں مصرح ہے۔

دوسرا وہ گروہ ہے جو اپنی اپنی قوم کی طرف بالاستقلال رسول کئے گئے اگرچہ صاحب شریعت نہ تھے۔ ہاں ان کے ہاتھ پر معجزات ظاہر ہوئے۔ اور ان کی قوم بہ سبب تکذیب کے معذب ہوئی۔ مثل صالح اور ہود اور لوط اور شعیب علیہم السلام۔

تیسری وہ جماعت جو حکمت اور نبوت دیئے گئے۔ لیکن اتباع توراۃ کے مامور تھے اور یہ وہ ہیں جو بنی اسرائیل میں سے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے۔

چنانچہ فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا (الآیہ پ۶: مائدہ)

”ہم نے ہی توریت کو نازل کیا تھا اس میں ہدایت اور نور تھا۔ اس

کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیا قومِ یہود کے لئے فیصلہ کرتے تھے۔" (۵:۴۴)

مثل یحییٰ اور زکریا علیہما السلام کی۔ پس محاورۂ قرآنی میں نبی اور رسول (مصداق میں) مترادف اور متبادل ہیں۔ ہر نبی رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے۔ صاحب شریعت ہو یا نہ ہو جیسے کہ موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی شان میں رسولا نبیا (پ ۱۶) فرمایا اور اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی شان میں بھی رَسُوْلًا نَبِیًّا فرمایا اور معلوم ہے کہ حضرت کلیم اللہ صاحب شریعت تھے اور حضرت ذبیح اللہ صاحبِ شریعت نہ تھے۔ پس بعض علماؒ کا یہ قول کہ رسول وہ ہے جس پر کتاب اترے ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حسبِ التزام قرآن کریم ہے بلکہ یہ ان کی اصطلاح ہے[1]

وَلَا مُشَاحَةَ فِي الْاِصْطِلَاحِ.

"اور اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔"

چنانچہ بعض علما نے ہماری طرح تحقیق کیا ہے (حاشیہ شرح ملا ص ۴)

نتیجہ اس تمہید کا یہ ہے۔ کہ قسم اول و دوم کے رسولوں کے مقابلہ میں ماکرین مکر میں ناکام رہتے ہیں، کیونکہ ان کا قتل شریعت اور رسالت میں شبہ ڈالتا ہے بخلاف جماعۂ ثالثہ کے کہ ان کا قتل کتاب اور شریعت میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

---

[1] اکمل صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ "کیا آپ کے علما قرآن شریف کے برخلاف اصطلاحات کے گھڑ لینے کے مجاز ہیں"؟ (ص ۱۹) جواب۔ جناب قرآن شریف کے خلاف تو کوئی بھی مجاز نہیں۔ لیکن آپ کو سمجھ ہو تو کوئی کیا کرے، قرآن نے جس امر کا التزام نہیں کیا اسے کوئی گروہ اپنی اصطلاح میں کسی خاص معنی میں مقید کرلے تو اسے خلاف قرآن نہیں کہتے۔ دیگر یہ کہ میں نے تو اس اصطلاح کی پابندی بھی توڑ دی۔ اور حاشیہ شرح ملا کا حوالہ بھی دے دیا۔ آپ نے نظر انداز کیوں کر دیا؟ دیکھئے وہاں لکھا ہے والرسول انما مترادف للنبی ...... والیہ ذھب جماعۃ من اکبرہم۔ اسی طرح مرزا صاحب بھی اپنے آپ کو رسول بھی کہتے ہیں اور نبی بھی اور پھر غیر تشریعی بھی کہتے ہیں۔ فافہم۔ سعادت

اسی لیے جرم قتل انبیا سوائے قوم یہود کے کسی امت سے سرزد نہیں ہوا۔ اگرچہ ہر امت نے اپنے رسول کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ مفسرین علیہم الرحمۃ آیت "یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ" وامثالھا میں حضرت یحییٰ اور ذکریا علیہما السلام کو بالاتفاق مثال میں لکھتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر جلالین میں کئی مواضع پر اور نیز تفسیر کبیر میں ذکریا و یحییٰ لکھا ہے اور تفسیر کشاف۔ معالم۔ مدارک۔ جامع البیان۔ خازن۔ سراج منیر۔ بیضاوی۔ فتح البیان۔ رحمانی۔ ابی السعود ان سب تفاسیر میں شعیا اور ذکریا اور یحییٰ علیہم السلام لکھے ہیں۔ پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صاحب شرع و معجزات رسول ہیں۔ اس لئے یہود آپ کو صلیب پر نہیں کھینچ سکتے تھے۔

کسر صلیب کی دوسری آیت:

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (پ۶: نساء)

''اور ان کے اس قول کے سبب بھی کہ انہوں نے کہا کہ بے شک ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا ہے۔ اور انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔'' (۴: ۱۵۷)

یہ آیت نفی صلیب کے لئے نص صریح اور دلیل قطعی ہے۔ اس کا منکر کافر ہے۔ یہ آیت دو وجہ سے نفی صلیب پر دلالت کرتی ہے۔ الوجہ الاول قولہ تعالیٰ بالتصریح وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ یعنی یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا اور نہ انہوں نے آپ کو صلیب پر چڑھایا۔

محرر سطور نے ایک مطبوع اشتہار مرزا صاحب کو بھیجا تھا۔ جس کی نقل حسب ذیل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. جناب مرزا صاحب! بندہ جمیع اہل السنۃ والجماعۃ سلف و خلف کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر نہیں چڑھائے گئے اور اب تک فوت بھی نہیں ہوئے۔ آپ اگر قرآن

کریم میں سے مسیح علیہ السلام کا صلیب پر چڑھایا جانا ثابت کر دیں۔ اور اگر صلیب پر چڑھایا جانا ثابت نہ کر سکیں تو بعد از اقرار عدم مصلوبیت قرآن شریف میں سے بدلائل قطعیہ ان کی وفات ثابت کر دیں۔ تو بندہ اس بات کا حلفی اقرار کرتا ہے کہ آپ کی تحقیق کا بہت ہی ممنون و مشکور ہو کر مسیح علیہ السلام کی وفات کو تسلیم کر لے گا۔ اس امر کے فیصلے کے لئے خواہ آپ مجھے قادیان میں حاضر ہونے کے لئے فرما دیں اور کسی عام مجلس میں اس مرحلہ کو طے کریں۔ خواہ کسی اور جگہ پر تشریف لا کر مجھے اطلاع بخشیں، خواہ آپ سیالکوٹ میں قدم رنجہ فرما کر بندے کو ممنون فرمائیں۔ بندہ ہر طرح حاضر ہے۔ آپ کے سیالکوٹ آنے کی صورت میں آنے کے ذاتی اخراجات کا متحمل بندہ ہو گا۔ اگر آپ بندے کو قادیان میں طلب نہ فرمائیں اور کسی اور جگہ بھی بہ سبب کسی خفی وجہ کے خود تشریف نہ لا سکیں تو وہاں قادیان ہی میں بیٹھے بیٹھے اس بار کو برداشت کریں۔ بندہ اس پر سر تسلیم نہیں پھیرے گا۔ اس عریضہ کے جواب میں آپ کا یہ فرما دینا کہ ہم نے یہ مسئلہ ازالۂ اوہام میں بہ بسط لکھا ہوا ہے۔ بندہ کے لئے جواب باصواب نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ دلائل جو آپ نے ازالۂ اوہام میں بیان کئے ہیں۔ بندہ کے نزدیک قطعیت چھوڑ مفید ظنیت بھی نہیں ہو سکتے۔ اس عریضہ کی قبولیت و عدم قبولیت سے بندہ کو ایک ہفتے کے اندر اندر بدستخط خاص قلمی یا بذریعہ اشتہار طبع شدہ اطلاع بخشیں۔ اور اس کی تعمیل کی میعاد ایک ماہ سے زائد نہیں ہونی چاہیے۔ ۸ جون ۱۹۰۲ء

یہ اشتہار رجسٹری کرا کر مرزا صاحب قادیانی کی خدمت میں ارسال کیا گیا جس کی رسید بھی آ گئی تھی۔ مگر جواب ندارد۔ ہاں ان کے ایک مرید بلکہ استاد زادے مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی نے اس کا جواب لکھ کر اپنی لیاقت کا اظہار کیا۔ سو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً اس کی بھی تردید ہو جائے۔

یہ رسالہ نام کا جواب باصواب ہے اور اس میں مولوی مبارک علی صاحب نے حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے کے ثبوت پر زور مارا ہے۔ اور آپ کو دلائل مزبورہ پر بڑا ناز ہے۔ چنانچہ لوح کے اندرونی صفحہ میں فخر سے فرماتے

ہیں۔ ''سوال اور اس کے جواب میں غور فرما کر حسن کلام اور خوبیٔ جواب اور طرز استدلال کی داد دیں۔'' انتہی۔ اور نیز نظم دلچسپ میں یوں رقمطراز ہیں۔

گو دیکھنے میں چھوٹی سی یہ اک کتاب ہے ۔۔۔ اس کا ہر ایک نکتہ مگر لاجواب ہے

اس کتاب میں مصنف صاحب نے اپنی تحقیقات کی داد ان دو امروں کی صحت پر مانگی ہے۔ امرِ اوّل ''صلب کے معنی صلیب پر مارنا ہیں۔ لہٰذا مَا صَلَبُوْہُ کے معنی ''یہود نے حضرت مسیحؑ کو صلیب پر نہیں مارا۔'' ہوئے۔ چنانچہ صفحہ ۱۴ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اصل لغت میں مصلوب ایسے شخص کو کہتے ہیں۔ جس کی موت صلیب پر واقع ہو جائے دیکھو قاموس اور اقرب الموارد وغیرہ اور جس شخص کی موت صلیب پر واقع نہ ہو۔ اس کو لغت کے رو سے مصلوب کہنا ناجائز ہے انتہی۔ اور نیز ص ۲۴ میں یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں'' کیونکہ عرف لغوی میں مصلوب اسے کہتے ہیں۔ جس کی موت صلیب پر واقع ہو جائے اور جس کی موت واقع نہ ہو۔ اسے مصلوب نہیں کہتے۔'' ۱۴

امر دوم کلمہ لکن اس وہم کے دفعیہ کے لئے آتا ہے۔ جو کلامِ سابق سے پیدا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اس لئے فرمایا کہ مَا صَلَبُوْہُ کی نفی سے مطلق سولی چڑھ جانے کی نفی بھی سمجھی جاتی تھی۔ مگر چونکہ نفس سولی پر چڑھ جانا درست تھا۔ اور سولی پر مرجانا غلط۔ اس لئے وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے اس وہم کو دور کیا۔ اور ظاہر کر دیا کہ نفی صلب سے مراد نفی نتیجہ صلب (موت) ہے۔ یعنی سولی پر مرے نہیں۔ چنانچہ ص ۱۶ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ ''پس اس قاعدے کی رو سے ثابت ہوا کہ آیہ زیر بحث کے جملہ اولیٰ منفیہ میں ایک وہم ہے۔ جو جملہ ثانیہ مثبتہ سے بواسطہ حرف استدراک متضمن معنی استثنا رفع کیا گیا ہے اور وہ وہم یہ ہے کہ نفی قتل بعلت صلب سے نفی وقوع صورت صلب موہوم ہوتی ہے۔ جو مناقض اور مغائر نتیجہ صلب (موت) کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کو حرف استدراک متضمن۔

ل حق بر زبان جاری۔ ۱۲ منہ

معنی استثنا سے یوں ظاہر کیا کہ قتل اور صلب کا نتیجہ واقع نہیں ہوا۔ اور صورت صلب پیش آ گئی۔ پس جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ آیہ شُبِّہَ لَهُمْ میں مشتبہ حضرت مسیح ہے اور مشبہ بہ یہود کا زعمی مصلوب یا وہ مقتول و مصلوب جو بعلت تصلیب معہود فی الذہن ہوتا ہے۔ انتہی

اقول:

یہ دونوں امر بالکل غلط اور ناشی از جہالت ہیں۔ اور ان کا قائل جاہلِ مطلق اور لیاقتِ علمیہ سے بے بہرہ اور علومِ رسمیہ سے بالکل نابلد ہے۔

امر اول یعنی صلب کے معنی سولی پر چڑھا کر مارنا تین وجوہ سے باطل ہے۔

وجہ اوّل:۔ لغت میں صلب کے معنی صرف سولی پر چڑھانا ہیں اسے موت لازم نہیں۔ غیاث اللغات اور صراح میں ہے۔ صلب بردار کردن بلکہ غیاث اللغات میں لفظ صلیب کے ذیل میں کہا ہے ''بمعنی بردار کردہ شدہ۔ وجہش آنکہ چوں عیسٰی علیہ السلام را بر آسماں بردند۔ طرسوں نام شخصے را کہ ہمشکل عیسٰی علیہ السلام بود' بردار کشیدند۔ و بعد ازاں واقعہ ترسایاں آں را عیسٰی پنداشتہ شکل دار با عیسٰی از چوب تراشیدہ در گلو آویختند و تعظیمش کردند۔'' اور سب تراجم اردو فارسی میں صلب کے معنی سولی پر چڑھانا ہی لکھے ہیں۔

ترجمہ: شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم محدث دہلوی جو مسلّم بین العلما و الفضلا ہے۔ ''و نہ کشتند او را و بردار نکردند او را۔''

ترجمہ: رفیع الدین صاحب بن شاہ ولی اللہ صاحب ''اور نہیں مارا اس کو اور نہ سولی دی اس کو۔''

ترجمہ: شاہ عبدالقادر صاحب بن شاہ ولی اللہ صاحب ''اور نہ اس کو مارا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا۔''

ترجمہ: حافظ نذیر احمد صاحب ''نہ تو انہوں نے ان کو سولی چڑھایا۔''

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ صلب کے معنی لغت اور تراجم میں سولی پر چڑھانا لکھے ہیں۔ اور موت اس کے لئے لازم نہیں۔ اگر صلب کے معنی کسی لغت کی کتاب میں یا کسی محاورے میں یا کسی شعر میں سولی پر چڑھا کر مارنا آئے ہیں تو مصنف صاحب پر واجب تھا کہ اس کتاب کی عبارت نقل کر دیتے۔ صرف آپ کا اتنا کہہ دینا کہ عرف لغوی میں فلاں لفظ کے معنی یہ ہیں۔ سند نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ کہیں کہ ص ۱۴ کے حاشیہ میں قاموس اور اقرب الموارد کا نام لکھ دیا ہے۔ بلکہ اس پر وغیرہ کا بھی پشتہ چڑھا دیا ہے۔ تو اس عذر سے شرم چاہئے۔ مولوی صاحب! جہاں قاموس وغیرہ میں آپ کی تائید کی تصریح کی گئی ہے۔ مہربانی کر کے وہ عبارت ہی نقل کر دی ہوتی تا کہ آپ پر دھوکے کا الزام عائد نہ ہوتا۔ مولوی صاحب! یاد رکھیے لغت کی کسی کتاب میں آپ کی تائید نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے۔ اور ہرگز نہیں ہے۔ یہ صرف آپ ہی کا اختراع ہے اور مصنفین گزشتہ پر افترا[1]

اچھا اگر عربی زبان میں صلب کے معنے سولی پر چڑھا کر مارنا اور مصلوب

---

[1] اکمل صاحب نے بہت محنت سے لسان العرب میں سے عبارت تلاش کر کے نکالی والصلب ھذہ القتلة المعروفة الخ اور کہا ہے لسان العرب میں صلب کے معنی قتل کے لکھے ہیں (ص ۱۱) جواب: ہم قادیانی علمیت پر ہنسیں یا کیا کریں' دعویٰ اکملیت کا اور ''قِتْلَة'' کے معنی کرتے ہیں ''قتل'' جناب من! علم صرف کے قواعد جانے آپ کی بلا' فِعلة بالکسر کا وزن عربی زبان میں نوعیت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ شافیہ میں ہے و بکسر الفاء للنوع نحو ضِرْبَة و قِتْلَة ۱۲ پس صلب کے ضمن میں لسان العرب میں جو القتلة المعروفة کے لکھا ہے سو اس کے معنی یہ ہیں کہ صلیب بھی قتل کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ قتل عام ہے چاہے کس طرح مارا جائے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک ان میں سے صلیب بھی ہے۔ اسی لئے قرآن میں ماقتلوہ کے بعد ماصلبوہ کی تصریح کی ضرورت پڑی کہ یہود قتل مسیح کی صورت صلیب پر چڑھا کر مارنا کہتے تھے۔ پس خدا تعالیٰ نے ماقتلوہ سے تو قتل کی نفی کر دی اور ماصلبوہ سے صلیب پر چڑھانے کو رد کر دیا۔ پس ماصَلَبُوْہُ میں فعل صَلَبَ جو منفی ہے۔ وہ صلیب پر چڑھانے کے معنوں میں ہوا نہ کہ صلیب پر مارنے کے معنی میں۔ کیونکہ مارنے کی نفی تو ماقتلوہ میں ہو چکی ہے باقی رہا صلیب پر چڑھانا سو ماصَلَبُوْہُ سے مردود ہو گیا۔ ۱۲ سعادت القرآن

کے معنے سولی پر چڑھایا جا کر مارا ہوا ہیں۔ تو صرف سولی پر چڑھانے اور سولی پر چڑھائے ہوئے کے لئے کیا لفظ ہیں؟ جب آپ نے یہ لکھا تھا کہ جس شخص کی موت صلیب پر واقع نہ ہو اس کو لغت کے رو سے مصلوب کہنا جائز ہے۔'' تو کیا اس وقت ایسے شخص کے لئے جو لفظ اس پاک زبان میں موضوع ہے لکھنا ہی یاد نہ رہا تھا یا خود بدولت کو یاد ہی نہ تھا؟ یا زبان ہی میں کوئی لفظ نہیں؟ مہربانی کر کے وہ لفظ تو لکھ دیا ہوتا تا کہ آپ کی تحریر کچھ تو مفید پڑتی۔ پہلی دو صورتوں میں آپ کا قصور ہے۔ اور تیسری صورت میں زبان کا نقص۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے پر الزام سہ جائیں گے۔ اور زبانِ عرب میں نقص کے قائل نہ بنیں گے۔

وجہ دوم: جو الفاظ افعال کے لئے موضوع ہیں۔ وہ صرف ان کی ابتدائی صورت کے لئے ہیں۔ نتیجہ ان میں داخل نہیں ہوتا۔ نتیجہ پر دلالت ترکیب سے ہوتی ہے۔ یا زیادت سے۔ آپ قواعد فقہ یا علم بیان کی کوئی کتاب پڑھیں۔ پھر معلوم ہو جائے گا اور اس سے پہلے ایسی تحقیق کو چھوڑ دیں اور استاد کے اس شعر کو وردِ زبان بنائے رکھیں

بجائے بزرگاں دلیری مکن چو سر پنجہ ات نیست شیری مکن

وجہ سوم: مثل مشہور ہے۔ دروغگو را حافظہ نباشد۔ رسالہ جواب باصواب کے مصنف صاحب نے صلب کے معنی سولی پر چڑھا کر مارنا کرنے میں اپنی مطلب برآری کے لئے بہت زور مار کر تصرف فی اللغۃ کیا ہے۔ اور بموجب مثل مندرجہ عنوان ان کی اپنی بہت سی عبارات اسی رسالے میں موجود ہیں۔ جن میں صلب بمعنی مطلق صلیب پر چڑھانا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ مواضع حسب ذیل ہیں:

1. حاشیہ صفحہ ۱۴ ''ما قتلوہ یقیناً اے ما وَقَعَ مَوْتُهُ بِقَتْلِهٖ صَلْبًا
''نفی قتل بعلت صلب سے نفی وقوع صورت صلب موہوم ہوتی ہے۔''
2. ص ۱۶ جو مناقض اور مغائر نتیجہ صلب (موت) کی ہے۔
3. ص ۱۷ ''اب اس صورت میں یہ معنی ہوئے کہ مسیح کے صلب کا نتیجہ تو واقع نہیں

ہوا۔"

❹ ص ۱۷ اور دونوں جملوں کے ملانے سے عدم وقوع نتیجہ صلیب کا اثبات۔"

❺ ص ۱۸ پس ان دونوں آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ آیت وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰـكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں مطلق نفی مقصود نہیں بلکہ نتیجہ صلب وقتل کی نفی مقصود ہے اور وقوع صورت صلب کا اثبات مطلوب ہے۔"

ہم ان عبارات پر کچھ زیادہ توضیح نہیں کرتے۔ صرف ناظرین کے فہم رسا اور انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ ان عبارات میں صلب بمعنی سولی پر چڑھانا مستعمل ہوا ہے یا نہیں۔ وَالْاِنْصَافُ اَوْلَى الْاَوْصَافِ (انصاف کرنا سب سے بہتر وصف ہے) اگر مصنف صاحب اس اشارے سے اپنی بے علمی کا اعتراف نہ کریں۔ تو نتیجہ اور سبب کی مغائرت سے سمجھ لیں [1]

الفقیہ تکفیہ الاشارۃ والسفیہ لا تفیدہ العبارۃ.

"دانا کو بس ایک اشارہ ہی کافی ہے اور نادان کو (لمبی) عبارت بھی مفید نہیں۔"

امر دوم: یعنی بحث کلمہ لکن کی نسبت یہ عرض ہے کہ مولوی صاحب خود اس سے وہم میں پڑے ہیں اور عوام کو اوہام میں ڈالتے ہیں۔ فَضَلَّ وَ اَضَلَّ مولوی صاحب نے لٰكِنَّ (مثقلة النون) کے قاعدہ میں دو عبارتیں نقل کی ہیں۔ اور ان عبارات سے مولوی صاحب کو کچھ فائدہ نہیں۔ ہاں اتنا فائدہ ضرور ہے کہ مرزائی پارٹی یہ جانے گی کہ مولوی صاحب علم نحو سے واقف ہیں۔ مگر علم نحو کے ماہرین کے نزدیک یہ امر شاہد ناطق ہے۔ کہ مولوی صاحب علم نحو سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ نے کتب نحو کی عبارات تو نقل کر دیں کہ لٰکن ازالہ وہم کے لئے آتا ہے۔ مگر تعیین وہم کی سند میں کسی تفسیر کی عبارت کیوں نقل نہ کی۔ مخالف پر کسی کتاب کا

---

[1] افسوس اب تو وہ فوت ہو چکے ہیں۔ سعادت الاقران۔

حوالہ دے کر وہ امر آشکارا کیا جاتا ہے۔ جس میں اس کو خلاف ہو۔ کلمہ لٰکن کے ازالۂ اوہام کے لئے موضوع ہونا تو فریقین کے نزدیک مسلم ہے۔ اختلاف تو تعیین وہم میں ہے۔ جو وہم آپ کو ہوا ہے۔ اس کی صحت کے لئے کسی کتاب کی عبارت لکھنی چاہئے تھی۔ یا اسے مدلل طور پر پرزور عبارت میں ثابت کرنا تھا۔ مگر افسوس مولوی صاحب نے غیر ضروری امر ہی پر اپنا سارا زور بل لگا دیا اور جس امر کو دلیل سے ثابت کرنا تھا۔ وہاں پہنچ کر بیدم ہو گئے۔ مولوی صاحب! معاملہ ایسا نہیں جیسا آپ کو وہم ہوا ہے۔ سنیے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے معنی تین طریق سے ہو سکتے ہیں۔ اول اگر نفی قتل کو مفعول پر متصور رکھیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے ''اور یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا۔'' وھذا الوجه هو الحق (''اور یہی وجہ درست ہے'') دوم اگر نفی قتل کو فاعل پر متصور رکھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ مسیح علیہ السلام کو یہود نے قتل نہیں کیا اور نہ اس کو سولی پر چڑھایا۔ اس کے خلاف یہ ہو گا کہ یہود کے سوا کسی اور نے مارا اور یہ وجہ باطل ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔ سوم اگر نفی کو افعال مذکورہ پر متصور کریں۔ تو معنی یہ ہوں گے۔ مسیح کو یہود نے قتل نہیں کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا ہے۔ اس کے خلاف یہ ہو گا کہ کسی اور طرح سے مر گیا اور یہ وجہ بھی باطل ہے۔

ناظرین انصاف سے دیکھیں کہ ان ہر سہ وجوہ میں سے وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کو کس وجہ سے تعلق ہے۔ اگر انصاف سے غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کو ان وجوہ میں صرف پہلی ہی صورت سے مناسبت ہے اور جمیع مفسرین رحمہم اللہ نے بالاتفاق یہی معنی کئے ہیں۔ صورت دوم اس لئے درست نہیں کہ اس صورت میں فعل کی اسناد اس کے فاعل کی طرف نہیں کی گئی۔ اور نیز اس لئے کہ اس صورت میں یہود کا ذکر باسم ظاہر چاہئے تھا یا ضمیر مرفوع منفصل لانی چاہئے تھی۔ صورت سوم اس لئے باطل ہے کہ جب اس صورت کے خلاف یہ تھا کہ وہ کسی اور طرح مر گیا تو پھر فعل کی نفی یہود کی طرف اشارہ کر کے نہ کی جاتی بلکہ عام

طور پر کہا جاتا کہ اس کو کسی نے نہیں مارا وہ تو اپنی موت سے بستر پر مرا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لفظ احد (بمعنے کوئی) بہ سبب معین نہ ہونے کے نکرہ اور عام ہے۔ اور یہود اس کی نسبت خاص اور خاص کی نفی سے عام کی نفی نہیں ہوسکتی۔ باقی رہی صورت اوّل سو اس کو جملہ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے پورا پورا تعلق ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہود نے مسیح کو قتل نہیں کیا۔ اور نہ انہوں نے اسے صلیب پر چڑھایا لیکن کسی ایسے شخص کو صلیب پر چڑھایا جو ان کے لئے ازروئے مکر کے مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ سے مسیح علیہ السلام سے مصلوبیت و مقتولیت کی نفی کر دی تو وہم ہوسکتا تھا۔ اور وہ وہم معقول تھا کہ قتل اور صلب حسی امر ہیں وہمی اور خیالی نہیں۔ اس لئے کوئی نہ کوئی ضرور مصلوب و مقتول ہوا تھا۔ اگر وہ مقتول مسیح نہیں تھا۔ تو اور کون تھا؟ سو ضرور تھا کہ اس کا جواب دے کر ازالۂ وہم کیا جاتا۔ پس وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دفع کیا اور حقیقتِ امر کھول دی کہ وہ کوئی اور شخص تھا جو کہ یہود کے لئے مَکْرًا بِهِمْ مسیح کا ہم شکل بنایا گیا تھا۔

اس میں شاید کوئی کوتاہ نظری سے یہ سوال کرے کہ فعل شبہ کی اسناد کس کی طرف ہے۔ کیونکہ اسے مسیح کی طرف مسند کیا جائے تو مسلمانوں کے اعتقاد میں مسیح مشبہ بہ ہیں۔ اور یہاں ذکر مشبہ کا ہے اور اگر کسی اور مقتول و مصلوب کی طرف اسناد کی جائے تو اس کا اوپر ذکر نہیں۔ ھٰذَا تقریر السوال۔

اس کا ایک جواب باتفاق جمہور مفسرین یہ ہے۔ جو امام رازی علیہ الرحمۃ نے دیا ہے۔

اَنْ يُّسْنَدَ اِلٰى ضَمِيْرِ الْمَقْتُوْلِ لِاَنَّهٗ قَوْلُهٗ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَقَعَ الْقَتْلُ عَلٰى غَيْرِهٖ فَصَارَ ذٰلِكَ الْغَيْرُ مَذْكُوْرًا بِهٰذَا الطَّرِيْقِ فَحَسُنَ اِسْنَادُ شُبِّهَ اِلَيْهِ.

”کہ یہ فعل مسند ہے طرف ضمیر کی۔ جو مقتول کی طرف پھرتی ہے کیونکہ

قول وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی اور شخص پر قتل واقع ہوا۔ پس اس طریق سے وہ مقتول مذکور ہوا اور شُبِّهَ کی اسناد اس کی طرف ٹھیک ہوئی۔"

اور نیز اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ سے بھی اس مقتول کا ذکر سمجھ میں آ سکتا ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی نے فرمایا:۔

اَوْ اِلٰی ضَمِیْرِ الْمَقْتُوْلِ لِدَلَالَةِ اِنَّا قَتَلْنَا عَلٰی اَنْ ثَمَّ قَتِیْلًا۔

"یا اس فعل کی اسناد ضمیر مقتول کی طرف ہے۔ کیونکہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں کوئی تو ضرور مقتول تھا"۔

مولوی صاحب نے شُبِّهَ کی توجیہ میں تفسیر بیضاوی کی عبارت نقل کر کے عوام کو یہ دھوکا دینا چاہا ہے کہ گویا اس توجیہ میں پہلے مفسر بھی ان سے متفق ہیں۔ اچھا مولوی صاحب! اگر قاضی بیضاوی علیہ الرحمۃ کی عبارت آپ کے مفید ہے تو قاضی بیضاوی ہی سے پوچھ لیجئے کہ مسیح علیہ السلام کے رفع کے بارے میں کیا اعتقاد رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب! تفسیر بیضاوی درسی کتاب ہے اور آپ نے نہیں پڑھی[1] تفسیر بیضاوی آپ جیسے ماہروں سے حل نہیں ہو سکتی۔ بندہ آپ کو پھر وہی نصیحت کرتا ہے۔

بجائے بزرگاں دلیری مکن   چو سر پنجہ ات نیست شیری مکن

تفسیر بیضاوی کا حل انہی لوگوں کے سپرد کریں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس

---

[1] مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی جناب مرزا صاحب قادیانی کے استاد مولوی فضل احمد صاحب مرحوم کے بیٹے تھے۔ فقہ وغیرہ کی چند ابتدائی کتابیں حافظ محمد سلطان صاحب سیالکوٹی سے پڑھیں۔ حدیث کی کچھ کتابیں استاد پنجاب حافظ عبدالمنان صاحب محدث وزیر آبادی سے پڑھیں۔ کسی ناگفتہ بہ شرارت پر جناب حافظ صاحب نے سخت سزا دی۔ وہاں سے بھاگ آئے۔ پھر قادیانی ہو گئے۔ مولوی نورالدین صاحب کے بعد لاہور جماعت میں شامل ہوئے۔ آخر گوجرانوالہ میں طاعون سے فوت ہوئے۔ ۱۲ منہ

کے حل کرنے کے لئے پیدا کیا ہے ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

خَلَقَ اللّٰهُ لِلْحُرُوْبِ رِجَالًا وَ رِجَالًا لِقَصْعَةٍ وَ ثَرِيْدٍ

''یعنی خدا تعالیٰ نے بعض آدمیوں کو تو جنگ کے لئے پیدا کیا اور بعض کو صرف پیالے اور ثرید یعنی پیٹ پالنے کے لئے بنایا۔''

مولوی صاحب! آپ مفسرین کے مختلف اقوال سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے مفسرین کے آیت کے ذیل میں کئی اقوال کے نقل کرنے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ کہ وہ اقوال آپس میں متضاد ہیں اور ان سے نتیجہ ایک نہیں نکلتا۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہر صورت میں نتیجہ ایک ہی ہے۔ اس کے اثبات کی کئی صورتیں ہیں اور جس قول سے نتیجہ الٹ نکلتا ہے۔ اسکی تضعیف کر دیتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں کہ اگر شُبِّهَ کی اسناد جار مجرور کی طرف کرنے یا ضمیر مقتول کی طرف کرنے سے نتیجہ ایک نہیں نکلتا تو معاذ اللہ مفسرین پر یہ الزام عائد ہوگا کہ وہ قول راجح اور مرجوح اور ضعیف اور قوی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ صرف مختلف اقوال کا نقل کر دینا جانتے تھے اور ان میں قوت فیصلہ نہ تھی۔ یا یہ نتیجہ نکلے گا کہ معاذ اللہ قرآن شریف ایسی کتاب ہے کہ اس کے مضامین کے بیان میں اتفاق رائے نہیں۔ اگر ان اختلافات کو اس طریق پر جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ سمجھا جائے۔ تو مفسرین کی بھی علو شان ثابت ہوتی ہے اور قرآن کی بھی۔ مفسرین کی اس طرح کہ گویا وہ ایسے وسیع النظر اور ماہر ہیں کہ ایک امر کو کئی وجوہ سے ثابت کر سکتے ہیں۔ اور قرآن کریم کی اس طرح کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے۔ جو اپنے مضامین کے اثبات کے لئے اپنے اندر ہی کئی دلائل رکھتی ہے۔ فَافْهَمْ۔

اب ہم بفضلہ تعالیٰ شُبِّهَ کی اسناد کی نسبت مفسرین کے اقوال نقل کر کے مولوی صاحب کے فہم سے وہم کو دور کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ہر صورت میں نتیجہ یہی ہے کہ کوئی اور شخص مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا اور وہی صلیب پر

کھینچا جا کر مارا گیا تھا۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی میں ہے:۔

وَشُبِّهَ مُسْنَدٌ اِلَى الْجَارِ وَ الْمَجْرُوْرِ كَاَنَّهُ قِيْلَ وَلٰكِنْ وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِيْهُ بَيْنَ عِيْسٰى وَ الْمَقْتُوْلِ.

''شُبِّهَ جار مجرور یعنی لَهُمْ کی طرف مسند ہے گویا یہ کہا گیا لیکن ان کو عیسیٰ علیہ السلام اور اس مقتول میں مشابہت نظر آئی۔''

مولوی صاحب اس توجیہ کی طرف صفحہ ۱۵ کے حاشیہ میں یوں اشارہ کرتے ہیں ''بعض مفسرین نے شبہ کا اسناد جار مجرور کی طرف بھی مانا ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے۔ وَلٰكِنْ وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِيْهُ اَیْ شُبِّهَ عَلَيْهِمُ الْاَمْرُ اَوْ جُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِهًا لَهُمْ. مولوی صاحب نے اس ایک سطر عبارت کے نقل کرنے میں جو خیانت کی ہے وہ ناظرین پر ظاہر ہو گئی ہوگی۔ اگر جار مجرور کی طرف اسناد کرنے سے معنی آپ کے مطلب کے موافق تھے۔ تو آپ نے اگلی عبارت پوری نقل کیوں نہ کی۔ اور بَيْنَ عِيْسٰى وَالْمَقْتُوْلِ کی خیانت کیوں کی اور اپنی طرف سے اس کے معنے شُبِّهَ عَلَيْهِمُ الْاَمْرُ اَوْ جُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِهًا لَهُمْ عربی عبارت و عربی خط میں لکھ کر کیوں عبارت لمبی کی گئی اور کیوں لوگوں کو دھوکا دیا گیا؟ ایمانداری تو یہ تھی کہ آپ کتاب کی عبارت پوری نقل کر دیتے پھر سمجھنے والے خود سمجھ لیتے کہ یہ عبارت آپ کے موافق ہے یا مخالف۔ مولوی صاحب نے وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِيْهُ کے معنی شُبِّهَ عَلَيْهِمُ الْاَمْرُ اَوْجُعِلَ الْاَمْرُ مُشْتَبِهًا لَهُمْ کر کے اپنی لیاقت علمی کا ایک اور نمونہ دکھایا ہے۔ سبحان اللہ! کہاں کی کہاں لگا دی آپ پر تشبیہ اور اشتباہ مشتبہ ہو گئے اور صلہ علی سے نظر ہی عالی پرواز ہو گئی۔ اور صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ پھر یہ فرمایا ''پس بجائے صلہ علی کے صلہ لام کا اختیار کرنا یہ ایک دقیق بلاغت کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لام عربی میں انتفاع کے لئے آتا ہے۔'' ۱۲ مولوی صاحب! آپ کیوں ایسے امور میں دخل انداز ہوتے ہیں۔ جن کے آپ اہل نہیں ہیں۔ آپ ناحق لغت اور نحو کا مسئلہ چھیڑتے ہیں۔ آپ لغت اور نحو نہیں

جانتے۔ آپ کو کسی استاد کے اس مصرعہ سے نصیحت کی جاتی ہے۔ ع نکتہ داں نشود کرم گر کتاب خورد۔ اس عبارت کو بغور پڑھیں[1] اشتباہ اور تشابہ وغیرہ کا صلہ جب علیٰ آئے۔ تب ان کے معنی التباس کے ہوتے ہیں۔ جیسے سورہ بقرہ پ ا میں ہے۔

إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا.

''بیشک موصوفہ گائے مشتبہ ہوگئی ہم پر۔'' (۲:۷)

اور سورہ رعد پ ۱۳ میں ہے۔

فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ.

''پیدائش مشتبہ ہوگئی اوپر ان کے۔'' (۱۳:۱۶)

اور سورہ انعام پ ۷ میں ہے۔

وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ.

''اورالبتہ مشتبہ کرتے ہم اوپر ان کے۔'' (۶:۹)

اور قاموس میں ہے شُبِّهَ عَلَيْهِ الْأَمْرُ تَشْبِيْهًا لُبِّسَ عَلَيْهِ (معاملہ اس پر مشتبہ ہوگیا)

آپ نے ناحق شُبِّهَ عَلَيْهِمُ الْأَمْرُ اور وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِيْهُ کو ایک بنا کر اپنی بے بضاعتی پر ہنسایا۔

پھر مولوی صاحب نے مطولات کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو ضرور جانتے کہ عربی میں لام کئی معنوں کے لئے آتا ہے۔ ایک ان میں ضرار ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے۔

فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا (پ۱۲: یوسف)

یعنی پس وہ تیرے ضرر کی تدبیر کریں گے۔ (۱۲:۵)

ایسے ہی وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں بھی ضرار کے لئے ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ پس یہود کا مکر یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ

---

[1] اب تو وہ فوت ہوچکے ہیں۔ اب کیا پڑھیں گے۔ ۱۲ منہ

السلام کو مصلوب کر کے قتل کر ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ کا مکر ان کے مقابلے میں یہ ہوا کہ انہی میں سے ایک شخص کو مسیح کا ہمشکل بنا کر ان کے اپنے ہاتھ سے مصلوب کرا کے مقتول کرایا۔ جس کا ضرر انہی پر پڑا بحکم آیت۔ سورۂ فاطر

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ الآية. (پ۲۲: فاطر)

"بد اندیشی کا وبال اس کے اہل ہی پر پڑا کرتا ہے۔" (۳۵: ۴۳)

دیکھو دونوں آیتوں میں مکر اور کید کے لفظ ہیں جو آپس میں مترادف ہیں' دیگر یہ کہ جار مجرور کی طرف اسناد کرنے سے اَلْاَمْرُ کہاں سے نکال لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب بے چارے مفسرین کے اقوال سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے تفسیر بیضاوی میں عبارت مذکورۃ الصدر کے آگے لکھا ہے۔

أَوْ فِي الْأَمْرِ عَلَى قَوْلِ مَنْ قَالَ لَمْ يُقْتَلْ أَحَدٌ وَلٰكِنْ أُرْجِفَ بِقَتْلِهِ فَشَاعَ بَيْنَ النَّاسِ.

"یا اس معاملہ میں ان کے لئے تشبیہ واقع ہوئی۔ اس قائل کے قول پر کہ مقتول کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی جھوٹی افواہ اڑ گئی اور لوگوں میں شائع ہو گئی۔"

اس عبارت میں سے فِي الْأَمْرِ کو دیکھ کر پہلی توجیہ سے ملا لیا اور ایک الگ عبارت بنا کر مفسرین علیہم الرحمۃ کے ذمے لگانی چاہی ف واضح ہو کہ مولوی صاحب نے یہ عبارت بھی صفحہ ۷ میں نقل کی ہے۔ اور اس میں یہ خیانت کی ہے کہ فِي الْأَمْرِ کی جگہ اِلَى الْأَمْرِ لکھ کر اپنے مطلب کے موافق معنی گھڑ لئے ہیں۔ زیادہ اطمینان کے لئے تفسیر ارشاد العقل السلیم کا مطالعہ کریں۔ تا کہ آپ کو سمجھ آ جائے کہ صحیح عبارت فِي الْأَمْرِ ہے نہ اِلَى الْأَمْرِ. فَافْهَمْ مطلب اس عبارت کا پہلی عبارت کو ملا کر یہ ہے کہ یہود کے لئے مسیح علیہ السلام اور مقتول میں تشبیہ واقع ہو گئی۔ یعنی ان کی نظر میں وہ مقتول مسیح علیہ السلام نظر آیا یا یہ اس معاملے میں ان کے لئے تشبیہ

لے ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ یہود نے جس شخص کو صلیب پر چڑھا کر قتل کیا۔ انہوں نے ؎

واقع ہوئی۔ اوفی الامر کا عطف عبارت حقدرہ بَيْنَ عِيْسٰى وَالْمَقْتُوْلِ پر ہے۔ گویا عبارت یوں ہے اَوْ وَقَعَ لَهُمُ التَّشْبِيْهُ فِي الْاَمْرِ الخ اور یہ عبارت بعطف تردیدی کوئی نئی ترکیب نہیں جیسا کہ مولوی صاحب نے خوش فہمی سے سمجھا ہے بلکہ شُبِّهَ کی جار مجرور کی طرف اسناد کرنے میں جو دوسرے معنی ہو سکتے تھے وہ ذکر کئے ہیں اور ان معنوں کے ضعف کی طرف بھی عَلٰى قَوْلِ مَنْ قَالَ سے اشارہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو تفاسیر کے مطالعہ اور تدریس کی توفیق بخشی ہے۔ وہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ قول شاذ ہے اور پھر بھی اس میں مسیح کی عدم مصلوبیت کی تصریح ہے اور رفع جسمی کی نفی نہیں۔

مفسرین کا دوسرا قول شُبِّهَ کی اسناد کی نسبت وہ ہے جو پہلے امام رازیؒ اور قاضی بیضاویؒ کی تفاسیر سے گزر چکا ہے۔

ناظرین ان دونوں قولوں کو سامنے رکھ کر انصاف سے نظر کریں کہ دونوں ترکیبوں سے نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یا الگ الگ؟ اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کے سوا کوئی اور شخص مصلوب ہو کر مقتول ہوا۔ یہ سارا بیان مولوی صاحب کی وجہ پر رد ہے۔ جو ضمناً کیا گیا:۔

مفسرین کی یہ ترکیب کہ شُبِّهَ کی اسناد ضمیر مقتول کی طرف ہے نہایت ٹھیک اور قواعد لسان کے بالکل مطابق ہے۔

لِمَا قَالَ ابْنَ هِشَامٍ مُعْزِيًا اِلَى ابْنِ مَالِكٍ اِنَّهُ لٰكِنْ غَيْرُ عَاطِفَةٍ وَالْوَاوُ عَاطِفَةٌ بِجُمْلَةٍ حُذِفَ بَعْضُهَا عَلٰى جُمْلَةٍ صُرِّحَ بِجَمِيْعِهَا قَالَ فَالتَّقْدِيْرُ فِيْ نَحْوِمَا قَامَ زَيْدٌ وَلٰكِنْ عَمْرٌو وَلٰكِنْ قَامَ عَمْرٌو وَ فِيْ وَلٰكِنْ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ.

(مغنی جلد دوم)

"چنانچہ امام ابن ہشام نحوی نے ابن مالک نحوی کی طرف نسبت کر کے کہا

لہ اس کی نسبت یہ گمان کیا کہ وہ حضرت مسیح ہے۔ حالانکہ وہ کوئی اور تھا۔ منہ سعادت الاقران۔

کہ ولکن میں لکن غیر عاطفہ ہوتا ہے۔ اور واؤ ایسے جملہ کو جس میں سے کچھ محذوف ہو ایسے جملہ پر جو پورا مصرح ہے عطف کرتی ہے۔
پس مثال قام زید الخ میں تقدیر یہ ہے۔ ولٰکِنْ قَامَ عَمْرٌو اور آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ میں تقدیر عبارت یوں ہے وَلٰکِنْ کَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

مولوی صاحب بے چارے علم نحو میں ایسے کم فہم ہیں کہ کسی کتاب کی عبارت نقل کرتے وقت امر مقصود اور غیر مقصود میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ لٰکِنَّ مشددۃ النون کا قاعدہ لکھا اور چونکہ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں لٰکِنْ مخففۃ النون مع الواؤ تھا۔ اس لئے اعتراض سے بچنے کے لئے ایک عبارت کے پیچھے اتنا دنبالہ اور لگا دیا۔ يجوز معها اى لكن مشددة او مخففة الواو وهى امّا لعطف جملة على جملة وامّا اعتراضية[1] اور اس دنبالہ نے آپ کی سخت تفضیح کی۔ کیونکہ لکن پر واؤ کے داخل ہونے میں تو کوئی خلاف و نزاع نہیں۔ نزاع تو اس میں ہے کہ جس لکن مخففۃ النون پر واؤ داخل ہو اس کا حکم کیا ہے؟ آپ اتنا تو سوچ لیتے کہ جب آیت میں لکن مخففۃ النون مع واؤ کے ہے تو اس کا بھی کسی کتاب سے قاعدہ دیکھ لیں۔ مبادا اس میں خصم کے مذہب کی کوئی تائید ہو اور پھر ندامت اٹھانی پڑے۔ اور مزید برآں نہایت جرأت سے مولوی صاحب نے آیت سورۃ احزاب وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ کی ترکیب لکھ دی۔ اور خیال نہ فرمایا کہ آئمہ نحو نے اس کی ترکیب کس طرح کی ہے؟ شاید وہ ترکیب خصم کے مذہب کی مؤید ہو۔ مولوی صاحب! اب تو خوب دیکھ لیا یا نہیں؟ کہ جس طرح ما قام زید ولکن عمرو میں قام محذوف ہے۔ اور آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں کان محذوف ہے۔ اور کانَ اور قامَ وہی افعال ہیں جو پہلے جملوں میں نفیاً مذکور ہیں اسی طرح مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں تقدیر عبارت کو یوں

---

[1] شرح جامی۔ ۱۲ منہ (سعادت)

ہے۔ وَلٰكِنْ قَتَلُوْا وَصَلَبُوْا مَنْ شُبِّهَ لَهُمْ "لیکن اس نے اس شخص کو قتل کیا اور صلیب پر چڑھایا۔ جو ان کے لئے مسیح کے مشابہ بنایا گیا تھا۔"

تفسیر کشاف جو قرآن شریف کی عربیت اور فصاحت و بلاغت کے ذکر کرنے میں سب تفسیروں کی استاد ہے۔ اس میں یوں لکھا ہے:۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ مَنْ قَتَلُوْهُ۔

"لیکن شبیہ بنایا گیا واسطے ان کے جس کو قتل کیا انہوں نے۔"

اور یہی الفاظ بعینھا تفسیر مدارک میں بھی ہیں اور تفسیر رحمانی جو نکات و معارف قرآنیہ میں لاثانی ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

وَلٰكِنْ قَتَلُوْا وَصَلَبُوْا مَنْ اُلْقِيَ عَلَيْهِ شِبْهُهٗ۔

"لیکن انہوں نے اس کو قتل کیا اور صلیب دی جس پر مسیح کی شباہت ڈالی گئی تھی۔"

اس قاعدہ کی دوسری مثال:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔

(پ ۳: آل عمران ۳: ۷۸)

"کسی بشر کو جسے خدا کتاب اور فہم شریعت اور نبوت عطا کرے لائق نہیں کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ خدا کے سوائے میرے بندے بن جاؤ لیکن (یہ کہتا ہے) کہ رب کے بندے بنو۔"

اس میں تقدیر عبارت یوں ہے وَلٰكِنْ يَّقُوْلُ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ. اسی طرح اس قاعدہ کی مثالیں قرآن و حدیث و کتب ادب میں بکثرت ہیں۔ دیکھو تفسیر جلالین و جامع البیان۔ بیضاوی۔ مدارک۔ خازن۔ سراج منیر۔ کبیر۔ ابوالسعود۔ رحمانی۔ کشاف۔ فتح البیان۔ ابن کثیر[1]

---

[1] مولوی محمد علی صاحب ایم اے لاہوری نے اس قاعدہ کا انکار کیا ہے چونکہ وہ عربی زبان سے ناواقف ہیں اس لئے ان کا انکار غیر جائز ہے۔ ۱۲ سعادت۔

اب آپ برائے خدا اپنی ہی پیش کردہ آیت سورۂ احزاب کی مثال سے اس آیت کو سمجھیں اور امام ابن مالک اور ابن ہشام اور علامہ نسفی اور علامہ علی مہائمی اور فارس میدان فصاحت علامہ جار اللہ زمخشری کی ترکیب کو تسلیم کر کے حزب اللہ میں داخل ہو جائیں اور قادیانی کے عقائد سے جلد توبہ کر کے اس کے مکائد سے بچ جائیں۔ کیونکہ آیت سورۂ احزاب ختم نبوت و رسالت پر نص قطعی ہے اور کادیانی مدعی رسالت ہے اور آپ اس کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی نظم دلچسپ میں سے ایک شعر پیش کیا جاتا ہے

ہے مقتداء امام و رسول خدا ہے وہ!
صادق ہے اور امین ہے عالی خطاب ہے[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ "جواب باصواب" کے باقی بعض قابل اعتراض مقامات پر بھی بنظر تحقیق نقض کیا جائے اور مجیب صاحب کو جتلا دیا جائے کہ ان کا فخریہ مصرعہ "اس کا ہر ایک نکتہ مکرلا جواب ہے۔" کہاں تک درست اور بجا ہے۔

قولہ ص ۱۹ ان کے اپنے اقرار سے ثابت ہو گیا کہ صلیب پر ضرور کوئی ایسا شخص چڑھایا گیا ہے۔ جس کے ناک۔ کان۔ آنکھ وغیرہ تمام اعضا مسیح کے اعضاء کے مشابہ تھے۔ گویا ہو بہو وہی تھا۔ انتہی

اقول۔ اس نامعقول قول سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ مجیب

---

[1] حیرانی ہے کہ مولوی مبارک علی صاحب نے یہ شعر مرزا صاحب کی زندگی میں لکھا اور ان کی زندگی بھر اس پر قائم رہے۔ پھر مولوی نور الدین صاحب کی خلافت کے زمانہ میں بھی اس پر قائم رہے لیکن لاہوری پارٹی قادیان دارالامان سے بدر کی گئی۔ اور انہوں نے لاہور میں اپنا الگ شاخسانہ بنا لیا اور مولوی مبارک علی صاحب ان کے ہاں مدرسہ میں ملازم ہو گئے۔ تو محمد علی صاحب ایم۔ اے کی موافقت میں جو عربی زبان سے ناواقف ہیں۔ قادیانی رسالت سے تائب ہو گئے اور اپنا شعر کہہ بھول گئے اور اسی حالت میں طاعون سے مر گئے۔ ۱۲ منہ

صاحب کا دماغ سمجھ سے خالی ہے۔ کیونکہ مشابہت صوری سے اتحادِ ذوات لازم نہیں آتا جیسے کہ حضرت مریم کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بصورت بشری آنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (پ۱۶ مریم) یعنی پس وہ (جبرئیل) اس (مریم) کے پاس پورے (توانا) بشری شکل میں آیا پھر حضرت جبرئیل کا جواب ذکر کیا: إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ یعنی ''میں تو تیرے رب کا فرشتہ ہوں'' اس سے ظاہر ہو گیا کہ باوجود بشری صورت میں ہونے کے حقیقتِ ملکیت ان سے منتزع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ فرشتے کے فرشتے ہی تھے۔ اسی طرح جو شخص حضرت مسیح کا ہم شکل بنایا گیا تھا۔ اس کی ذات اور حقیقت وہی رہی تھی۔ جو شباہت پڑنے سے پیشتر تھی۔ گو حضرت مسیح کی صورت اس پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے نظائر و امثال کتب حدیث و واقعات اولیائے عظام میں بکثرت ہیں۔ اور اصطلاح صوفیائے کرام میں اسے خلع کہتے ہیں۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بارہا بصورت بشری[1] آنا صحیح بخاری۔ صحیح مسلم اور سنن نسائی وغیرہ کتب حدیث میں مصرح ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس جو فرشتے بصورت بشری آئے تھے۔ ان کا ذکر بھی قرآن شریف میں متعدد مقامات میں مذکور ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں ان سے حکایت کیا کہ انہوں نے کہا۔ يَا لُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ ''اے لوط! ہم تیرے رب کے فرشتے ہیں''۔ اس بیان و تفصیل سے صاف معلوم ہو گیا۔ کہ القائے شبہ سے ذات مُلقٰی علیہ متغیر نہیں ہو جاتی۔ بلکہ حقیقت بر حال قائم رہتی ہے کیونکہ حلیہ اور شکل مثل لباس کے عوارض میں سے ہے داخلِ حقیقت نہیں۔ فَافْهَمْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَاصِرِيْنَ۔

قولہ۔ دنیا کی دو کثیر التعداد قومیں یہود و نصاریٰ تواترِ قومی کے طور پر اس بات پر اتفاق رکھتی ہیں کہ مسیح کو صلیب پر ضرور لٹکایا گیا۔

---

[1] خصوصاً آنحضرت ﷺ کے اصحاب میں سے حضرت دحیہ کلبی کی شکل میں آنا۔ ۱۲ منہ

اقول۔ جناب! یہود کے قول کو تو اللہ عزیز ذوانتقام نے وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ سے باطل کر دیا۔ اور انہیں اس قول زور کے سبب ملعون قرار دیا۔ اور آپ ابھی تک ان کے تواتر پر اترا رہے ہیں۔ اور نصاریٰ کے مذہبی اختلافات کی بابت آپ کو کیا معلوم ہے۔ یہ کس جاہل سے سیکھا تھا کہ نصاریٰ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر اتفاق رکھتے ہیں۔ آپ ان کی کتب خلافیات کا مطالعہ کریں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ نصاریٰ کے قدیم فرقے یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک اور شخص صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل ڈالی گئی تھی [1] چنانچہ جارج سیل صاحب قرآن شریف کے ترجمہ انگریزی میں بذیل آیت وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ جو لکھتے ہیں۔ وہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ ناظرین انصاف سے غور کریں اور رائے دیں۔ کہ کیا حضرت روح اللہ علیہ السلام کا مصلوب ہونا عیسائیوں کا اتفاقی اعتقاد ہے؟

خلاصہ مطلب عبارت انگریزی جارج سیل صاحب:

یہود کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ مکر تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور آپ کی شباہت ایک اور شخص پر ڈال دی۔ جو آپ کی بجائے گرفتار کر کے صلیب دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا متواتر مسئلہ ہے۔ بعض (عیسائی) لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قصہ القائے شباہت کا (معاذ اللہ) محمد رسول اللہ ﷺ کی اپنی اختراع ہے۔ مگر وہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیونکہ پیغمبر صاحب کے زمانے سے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے فرقوں کا یہی اعتقاد تھا۔ چنانچہ فرقہ بے سی لی ڈین جو عیسائیت کے نہایت شروع میں تھا۔ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے سے انکار

---

[1] حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا تو پولوس نے گھڑا۔ جس نے منافقت سے آپ کا دین بگاڑا۔ دیکھو اس کے خطوط رومیوں۔ قرنتیوں وغیرہ کے نام۔ پھر اس پر کفارہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۲ منہ۔ سعادت۔

شہادت القرآن

کرتا تھا۔ اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ سائمن آپ کی جگہ صلیب پر لٹکایا گیا تھا ایسے ہی فرقہ سیر نتھیین جو ان سے بھی پیشتر تھا اور کارپا کریشن جو مسیح علیہ السلام کو صرف انسان ہی مانتے ہیں۔ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص کو جو آپ کا ہم شکل تھا۔ صلیب دیا گیا۔ مصنف فوٹین کہتا ہے۔ کہ میں نے ایک کتاب بنام رسولوں کے سفرنامے پڑھی۔ جس میں پطرس۔ یوحنا۔ اندریاس۔ طامس اور پولوس کے اعمال مندرج تھے اور منجملہ دیگر امور کے ایک امر یہ بھی تھا کہ "مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے۔ بلکہ آپ کی بجائے کوئی اور شخص صلیب دیا گیا تھا اور اس لئے حضرت مسیح ان لوگوں پر ہنسے جنہوں نے اپنے زعم میں آپ کو صلیب پر چڑھایا تھا۔"

اس کے بعد سیل صاحب نے انجیل برنباس کی عبارت نقل کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہود بے بہود حضرت مسیح علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے جا رہے تھے۔ آپ بوساطت چار فرشتگان حضرت جبرئیل۔ میکائیل۔ اسرافیل۔ اور یوریل تیسرے آسمان پر اٹھا لئے گئے کہ آپ آخر دنیا تک نہ مریں گے اور آپ کی بجائے یہودا اسکریوطی صلیب دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مکار کو یہود کی نظروں میں حضرت مسیح کا ایسا ہم شکل کر دیا کہ یہود اس کو پکڑ کر پلاطوس کے پاس لے گئے۔ یہ مشابہت صوری ایسی عجیب تھی کہ اس سے حضرت مریم اور حواری بھی بھول گئے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کر ان کو تسلی دینے کے لئے پھر نازل ہوئے۔ اس پر برنباس جو عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری تھا۔ اس نے آپ سے پوچھا کہ آپ نے ہم کو اور اپنی والدہ ماجدہ کو کیوں غم اور تکلیف میں رکھا۔ کہ آپ ایسی بری موت سے مرے۔ گو یہ تھوڑی دیر کے لئے تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس پر یہ جواب دیا کہ "اے برنباس۔ سچ جانیو! کہ گناہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت سزا کے لائق ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ گناہ سے ناراض ہے۔ میری والدہ ماجدہ اور مومن حواریوں نے مجھے نفسانی پیار کی آمیزش سے محبت کی۔ اس لئے

اللہ تعالیٰ نے ان کو اس موجودہ غم سے سزا دی۔ تاکہ ان کو پھر دوزخ کی سزا نہ ہو اور میری تو یہ بات ہے کہ اگرچہ میں دنیا میں بے عیب رہا ہوں۔ مگر چونکہ اور لوگوں نے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہ میں قیامت کے دن شیطانوں سے مضحکہ نہ کیا جاؤں' یہودہ اسکریوطی کی موت سے مجھ پر یہ مضحکہ کرا دیا کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر مارا گیا اور دیکھ یہ مضحکہ محمد رسول اللہ ﷺ کے آنے تک رہے گا۔ وہ دنیا میں آکر ہر اس شخص کو اس غلطی سے نکالیں گے جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کا متبع ہو گا۔'' انتہیٰ

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام کی عدم مصلوبیت کا اعتقاد نصاریٰ کے قدیم فرقوں میں مسلم تھا۔ اور ان کی قدیم تصانیف بھی اس امر کی شہادت دیتی ہیں اگرچہ وہ کسی غرض سے ان کو مخفی رکھیں مگر بحکم شعر

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد
خمیر مایہ دکان شیشہ گر سنگیست

اور بمحوائے حدیث صحیح مسلم

إِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ هٰذَا الدِّيْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ.

''خدا اس دین اسلام کی مدد فاجر آدمی سے بھی کرا لیتا ہے''۔۱۲

اللہ تعالیٰ نے اعدائے اسلام سے بھی اسلام کی تائید کرائی۔ جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرعون کے گھر میں کرائی۔

انجیل برنباس کے متعلق ایک اور نکتہ ہے کہ مرزا صاحب قادیانی وغیرہ مسیحیت سے پیشتر عیسائیوں کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے ثابت کرنے میں اسی انجیل برنباس سے انہیں ملزم کیا کرتے تھے۔ اب ان کے اپنے ہی الزام سے ہم ان کو ملزم کرتے ہیں کہ یہ عبارت جو وہ عیسائیوں کو سناتے تھے۔ خود پڑھیں۔ وَلَنِعْمَ مَا قَالَ الشِّيرَازِيُّ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ ع

''بہ بند و طمع دیدۂ ہوشمند۔'' مرزا صاحب قادیانی نے اپنی مسیحیت

کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اثبات نبوت کو بھی جھٹلا دیا۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ. "خدا ان کو غارت کرے کدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

قولہ بحکم اِحَالَةُ العادة تواطئهم عَلَى الكذب. "عادۃً ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو۔"

اقول۔ جناب مولوی صاحب! آپ کتب درسیہ کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ لہٰذا نقل عبارات سے اپنی تفضیح نہ کرایا کریں۔ شرح نخبہ میں سے یہ عبارت تو دیکھ لی۔ مگر تواتر کے افادہ یقین کی شروط کے لئے اگلے صفحہ کو الٹ کر نہ دیکھا۔ اگر تواتر کا مدار صرف کثرت پر ہے۔ تو افواہ اور اخبار بے سرو پا کس کا نام ہے؟ پھر تو آپ کے نزدیک عوام ہندوؤں کا یہ قول کہ راون کے دس سر تھے۔ اور ہنومان نے پہاڑ اٹھالیا اور ایسے ایسے مزخرفات جو ان میں ذائع وشائع ہیں سب متواترات میں سے ہوں گے۔ کیونکہ ان امور کو ہزاروں لوگ روایت کرتے چلے آئے ہیں۔ جناب من! تواتر کے افادہ یقین کے لئے ایک یہ شرط ہے کہ منتہیٰ۔ اس کا حس ہو دیکھئے۔ شرح نخبہ کے اگلے صفحہ پر ہے:۔

فَاِذَا جُمِعَ هٰذِهِ الشُّرُوطُ الْاَرْبَعَةُ وَهِيَ عَدَدٌ كَثِيْرٌ اَحَالَتِ الْعَادَةُ تَوَاطُئَهُمْ وَتَوَافُقَهُمْ عَلَى الْكِذْبِ وَرَوَوْا ذٰلِكَ عَنْ مِّثْلِهِمْ مِّنَ الْاِبْتِدَاءِ اِلَى الْاِنْتِهَاءِ وَكَانَ مُسْتَنَدُ اِنْتِهَائِهِمُ الْحِسُّ وَ انْضَافَ اِلٰى ذٰلِكَ اَنْ يَّصْحَبَ خَبَرُهُمْ اِفَادَةَ الْعِلْمِ لِسَامِعِهٖ فَهٰذَا هُوَ الْمُتَوَاتِرُ. (ص ۸ مطبوعہ دہلی ۱۹۱۴)

"پس جب یہ چاروں شرطیں پوری ہو جائیں۔ ❶ یہ کہ اتنی بڑی جماعت روایت کرے۔ کہ عادت کی رو سے ان کا جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال سمجھا جائے۔ ❷ یہ کہ ابتدا سے انتہا تک سارا سلسلہ عادل ضابطہ راویوں کا ہو۔ ❸ یہ کہ ان کے انتہا کی استناد امر حسی پر ہو ❹ یہ کہ ان کا خبر دینا سامع کو یقین کا فائدہ دیوے تو اسے متواتر کہتے

ہیں۔"

اور اسی طرح علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں بعد ذکر دیگر شروط کے فرمایا:

هٰذَا كُلُّهُ مَعَ كَوْنِ مُسْتَنَدِ اِنْتِهَائِهِ الْحِسَّ مِنْ مُشَاهَدَةٍ اَوْ سَمَاعٍ لِاَنَّ مَالَا يَكُوْنُ كَذَالِكَ يَحْتَمِلُ دُخُوْلُ الْغَلَطِ فِيْهِ.

"یہ سب باتیں تب معتبر ہیں کہ اس خبر کا انتہا حس ہو یعنی اگر مشاہدہ کے متعلق ہے تو مشاہدہ ہو اور اگر سماع کے متعلق ہے تو سماع ہو۔ کیونکہ جو اس طرح پر نہ ہو اس میں غلطی کے داخل ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے"۔

پس اگر آپ عقیدہ مردودہ صلیبیہ کے زعمی تواتر کو حسب ہدایات تو عبارات مذکورہ تحقیق کریں گے۔ تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ حضرت روح اللہ کی نسبت یہود و نصاریٰ کا قول صلیب بالکل غلط اور مردود ہے۔ پس اس وقت آپ پر یہ آیت پڑھنی ٹھیک پھبے گی۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآئَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ.

"پس ہم نے تیرا پردہ کھول دیا ہے۔ پس آج تیری نظر تیز ہو گئی ہے۔" (پ۲۶:پ)(۵۰:۲۲)

شرح عقائد نسفی میں اس امر کی تصریح ہے کہ مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام کا تواتر ممنوع ہے[1]

قولہ: "مرے مسیح تو کیا مسیح سے بھی عالی درجت انبیاء آنحضرت ﷺ کے خدام کی منزلت نہیں رکھتے اور نیز کہا مسیح تو ایک معمولی انسان ہے اور اس قابل بھی نہیں کہ آنحضرتؐ کے خدام کی برابری کر سکے۔"

---

[1] کیونکہ صدر اول میں اس کی بابت چشم دید شہادت دینے والا ایک شخص بھی نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے وقت آپ کے سب حواری بھاگ گئے تھے۔ ملاحظہ ہو انجیل متی ۲۶:۵۶ اور انجیل مرقس ۱۴:۴۹۔ پس عہد واقعہ میں واقعہ کا گواہ ہی کوئی نہیں تو زمانہ مابعد کی کثرت کسی کام کی نہ رہی۔ ۱۲ منہ سعادت۔

اقول۔ رسول اللہ ﷺ کے امتی غایت مافی الباب ولایت کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ نبی نہیں ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آیت وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ مانع ہے اور ولی کو نبی پر فضیلت دینی اہل سنت کے نزدیک کفر و ضلالت ہے۔ نبی اللہ متبوع و مطاع ہوتا ہے اور امتی تابع و مطیع۔ تابع متبوع سے کس طرح بڑھ سکتا ہے؟ اور مطیع مطاع سے کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ عجیب صاحب علم اسلامی سے ایسے بے خبر ہیں کہ اہل سنت کے مشہور عقائد بھی آپ کو معلوم نہیں قصیدہ امالی میں ہے۔

وَلَمْ یَفْضُلْ وَ لِیٌّ قَطُّ دَهْرًا ۔۔۔ نَبِیًّا اَوْ رَسُوْلًا فِی انْتِحَالِ

یعنی ولی کبھی بھی کسی نبی یا رسول سے افضل نہیں ہو سکتا۔"

اور ملا علی قاریؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

وَذٰلِکَ لِاَنَّ الْوَلِیَّ تَابِعٌ لِلنَّبِیِّ وَلَا یَکُوْنُ التَّابِعُ بِاَعْلٰی مَرْتَبَةٍ مِنَ الْمَتْبُوْعِ وَلِاَنَّ النَّبِیَّ مَعْصُوْمٌ مَامُوْنُ الْعَاقِبَةِ وَالْوَلِیُّ یَجِبُ اَنْ یَکُوْنَ خَائِفًا عَنِ الْخَاتِمَةِ وَلِاَنَّ النَّبِیَّ مُکَرَّمٌ بِالْوَحْیِ وَ مُشَاهَدَةِ الْمَلَائِکَةِ الْکِرَامِ وَالرَّسُوْلُ مَامُوْرٌ بِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ وَ اِرْشَادِ الْاَنَامِ بَعْدَ اِتِّصَافِهٖ بِکَمَالَاتِ الْوَلِیِّ فِی الْمَقَامَاتِ الْفِخَامِ فَمَا نُقِلَ عَنْ بَعْضِ الْکَرَامِیَّةِ مِنْ جَوَازِ کَوْنِ الْوَلِیِّ اَفْضَلَ مِنَ النَّبِیِّ کُفْرٌ وَّ ضَلَالَةٌ وَ عِبَارَةُ النَّسَفِیِّ فِیْ عَقَائِدِهٖ وَلَا یَبْلُغُ وَلِیٌّ دَرَجَةَ الْاَنْبِیَاءِ اَوْلٰی مِنْ عِبَارَةِ النَّاظِمِ لِاِفَادَتِهَا نَفْیَ الْمُسَاوَاتِ اَیْضًا۔ انتهی۔

"اس کا سبب یہ ہے کہ ولی نبی کے تابع ہوتا ہے اور کوئی پیرو اپنے پیشوا سے افضل رتبہ پر نہیں ہو سکتا۔ نیز اس لئے کہ نبی معصوم ہے اور خاتمہ سے امن میں ہے اور ولی کے لئے ضروری ہے کہ خاتمہ سے ڈرتا رہے نیز اس لئے کہ نبی وحی سے اور ملائکہ مقربین کے مشاہدے سے مشرف ہوتا ہے اور رسول احکام آگہی کی تبلیغ اور خلقت کے ارشاد کا مامور ہوتا ہے۔ بعد

ازاں کہ ولی کے کمالات سے بھی نہایت عالی مقامات پر موصوف ہو۔ پس بعض کرامیہ سے جو نقل کیا گیا ہے کہ جائز ہے کہ کوئی ولی کسی نبی سے افضل ہو سو کفر اور ضلالت ہے اور امام نسفی کی یہ عبارت کہ "کوئی ولی انبیا کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس ناظم کی عبارت سے اولی ہے کیونکہ اس میں مساوات کی بھی نفی کا فائدہ ہے۔"

اسی طرح تمہید ابی الشکور سالمی میں ہے۔

قَالَ اَهْلُ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ اِنَّ النَّبِيَّ اَفْضَلُ مِنْ وَلِيٍّ وَ اِنْ كَانَتْ دَرَجَتُهُ اَدْوَنَ مِنْ دَرَجَاتِ النُّبُوَّةِ وَقَالَ الْمُنَقْشِفَةُ مِنَ الْكَرَامِيَّةِ اِنَّهُ يَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ الْوَلِيُّ اَفْضَلَ مِنَ النَّبِيِّ وَ هٰذَا كُفْرٌ. انتهى.

"اہل سنت والجماعت کا قول یہ ہے۔ کہ ہر نبی ہر ولی سے افضل ہوتا ہے خواہ وہ نبی درجات نبوت کے کسی ادنیٰ درجے پر ہو اور کرامیہ میں سے منقشفہ کہتے ہیں کہ ولی کا نبی سے افضل ہونا جائز ہے اور یہ کفر ہے۔"

اسی طرح دیگر کتب عقائد میں بھی مذکور ہے۔ پس مولوی صاحب کا اس کے خلاف لکھنا ان کی جہالت اور ضعف ایمان پر دلیل بین ہے۔

قولہ: ص ۱۸ اگر وہ بقول مشتہر صاحب صلیب پر چڑھا ہی نہیں سکے تو پھر مکر کون سا ہوا۔ جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ان کی طرف منسوب کیا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے بلا وقوع کسی امر کے اس کا وقوع ان کی طرف منسوب کر دیا ہے؟

اقول ع سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست۔ یہ امر بھی مجیب صاحب کی بے لیاقتی ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ مکر کہتے ہیں تدبیر محکم کو۔ جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے یہود نے حضرت روح اللہ کو صلیب پر چڑھانے کی صرف تدبیر ہی کی تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس ارادہ بد کو ان کی طرف منسوب کیا اور جس شخص کو علوم دربیہ میں

ادنیٰ سی ممارست بھی ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ارادۂ انسانی کو وقوع فعل لازم نہیں پس یہ ضرور نہیں کہ جب تک فعلِ صلب کا وقوع نہ ہو تب تک یہود کی طرف ارادہ و تدبیر ایصالِ شر منسوب نہ کرسکیں۔ فافہم۔

مجیب صاحب اگر اپنی ہی عبارت کو محفوظ رکھتے۔ تو ایسی فاش خطا اور ذہلی غلطی نہ کرتے۔ چنانچہ آپ اسی صفحہ کی سطر دوم میں فرماتے ہیں کہ یہود نے ایک منصوبہ بنایا۔'' اور تیسری سطر میں ''چاہا'' لکھتے ہیں اور سطر ششم میں پھر منصوبہ تحریر کرتے ہیں۔ آپ غور کریں اور انصاف سے کہیں کہ کیا منصوبہ بنانے اور چاہنے کے یہی معنی ہوا کرتے ہیں کہ وہ امر بالضرور واقع بھی ہو جائے۔ جنابِ من! ارادہ امر دیگر ہے اور صدورِ فعل امر دیگر۔

قولہ: ص ۱۱ '' لیکن دعویٰ کی تکذیب نہیں کی۔''

اقول: حضرت! اس آیت اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا. ''تو کیا یہ لوگ قرآن کو تدبر سے نہیں پڑھتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں''۔ کے مصداق بھی تو پائے جانے چاہئیں۔ اگر آپ کو یہود کے دعوائے قتلِ مسیح کی تردید و تکذیب معلوم نہیں ہوئی۔ تو اس میں قصور کس کا ہے؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اللہ تعالیٰ نے یہود کی لاف قتلِ مسیح کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ) (پ۶:نساء)

ہم نے ضرور عیسیٰ مسیح بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا ہے۔'' (۱۵۷:۴)

اس میں دو امر ملحوظ ہیں۔ اول دعوائے قتل مسیح کو بطور مفاخرت ذکر کرنا۔ کیونکہ نفسِ قتل امرِ فخر نہیں تھا۔ بلکہ ان کے زعم میں قتل محل خاص میں واقع ہوا اس لئے مقتول یعنی المسیح کو موصوف ذکر کیا۔ اور یہی مفاخرتِ یہود اس امر کی مؤید ہے۔ کہ مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ میں نفی قتل و صلب کو مقصور علی المفعول کیا جائے۔ دوم لفظِ اِنَّا سے اس زعم پر یہود کا جزم۔ سو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امر اول کی

تکذیب وتردید مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ سے کر دی۔ اور ان کے فخر کو خاک میں ملا دیا۔ اور امر دوم یعنی ان کے جرم کا ابطال وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا سے فرمایا۔ اور حقیقت امر کو وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ سے کھول دیا کہ کوئی اور شخص مصلوب ہو کر مارا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔" سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا اَحْكَمَ كَلَامَهٗ۔

دوسری وجہ جس سے آیت وَ قَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ یعنی اور ان کے اس قول کے سبب بھی (ہم نے ان پر لعنت کی) کہ "انہوں نے کہا کہ ہم نے ضرور مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا۔" عقیدۂ ملعونہ صلیبیہ کی تردید کرتی ہے۔ یہ ہے کہ جن جرائم کے سبب اللہ تعالیٰ جبار قہار نے یہود پر لعنت کی منجملہ ان کے ان کا قول بہ قتل و صلب[1] مسیح ہے۔ ان جرائم میں سے بعض تو محض اقوال ہیں اور بعض افعال جیسا کہ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ سے وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا تک غور کرنے سے واضح ہوتا ہے۔ افعال یہ ہیں۔ اول نقض میثاق کیونکہ خلاف میثاق فعل سے صادر ہوتا ہے۔ دوم کفر بآیات اللہ کیونکہ یہ فعل تحریف کلمات اللہ و قتل انبیا و اخذ رشوت وسود جیسے افعال قبیحہ کی طرف کھینچنے والا ہوا۔ سوم قتل انبیا۔ یہ اگرچہ کفر ہی کا نتیجہ ہے۔ مگر چونکہ باصلہ ایک مستقل کفر ہے اس لئے علیحدہ ذکر کیا گیا اور اقوال یہ ہیں۔ اول ان کا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کہنا۔ دوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے پدر پیدا ہونے پر قدرت قادر عزیز سے انکار کرنا اور چونکہ ان کا کفر دو زمانوں میں ہوا۔ اول قبل بعثت عیسیٰ علیہ السلام۔ پھر بعد آپ کی ولادت اور بعثت کے۔ اس لئے کفر کو مکرر ذکر کیا۔ اور اسی نکتہ کے لئے اعادہ جار بھی کیا۔ سوم مریم صفیۃ اللہ

---

[1] اکمل صاحب اس پر کہتے ہیں "یہ صلب آپ نے کہاں سے ملایا؟"
جواب: ۔ ما قتلوہ کے بعد ما صلبوہ سے۔ یعنی قتل کی نفی کے بعد صلب کی نفی کرنے سے معلوم ہوا کہ یہود اس امر کے مدعی تھے کہ ہم نے حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھا کر مار دیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی الگ الگ نفی کر دی۔ قاسم ۱۲ منہ۔

علیھما السلام پر بہتان لگانا۔ چہارم ان کا یہ کہنا کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مار ڈالا ہے۔

ناظرین قرآن کریم کی فصاحت اور حسن بیان پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اقوال و افعال میں کس طرح فرق کیا ہے۔ جملہ افعال کو نسبت صدوری وقوعی سے ذکر کیا۔ کہ بیشک ان سے یہ افعال قبیحہ سرزد ہوئے۔ كَمَا يَشْهَدُ بِذٰلِكَ طَرِيْقُ الْبَيَانِ ''جیسا کہ طریق بیان اس کی شہادت دیتا ہے۔'' اور جملہ اقوال کو مردود و مکذوب فرمایا۔ چنانچہ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ كو بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ سے رد کیا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے بارے میں جو اقوال مردودہ آپ پر اور حضرت صفیۃ اللہ پر کہے تھے ان کو لفظ بہتان سے اور نیز اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (بیشک عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ خدا کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے) سے اور نیز قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ (پ ۱۶: مریم) (کہا میں خدا کا کامل بندہ ہوں) سے اور نیز وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (پ ۱۷: انبیاء) سے رد فرمایا۔ اور دعوائے قتل کو وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (اور نہیں قتل کیا انہوں نے اس کو اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا) سے مکذوب کیا۔

اس بیان و تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اگر فعل صلب صورت فعلیہ میں صادر ہوا ہوتا۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ فعل کو سبب لعنت قرار دیتا نہ مجرد قول کو اور پھر عبارت وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ کی بجائے وَبِصَلْبِهِمُ الْمَسِيْحَ ہوتی کیونکہ صلیب پر چڑھانا اور معاذ اللہ رسول برحق کے پاک ہاتھوں میں میخیں لگانا وغیرہ وغیرہ زیادہ سخت جرم ہے۔ مجرد افترا و بہتان سے۔ اس قول بقتل المسیح کے سبب یہود کو ملعون و مردود گردانے سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر مرفوع کیا اور اس وقت تک زندہ رکھا اور پھر آخری زمانے میں دنیا میں نازل کرے گا۔ اس قول مردود سے اس حکمت کا ابطال و بطلان لازم آتا ہے۔ پس اگر اب بھی کوئی شخص حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھائے جانے اور ان کی موت قبل

النزول کا قائل ہو تو چونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کو باطل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کا حکم بھی یہود بے بہبود کا حکم ہے۔ اس آیت مبارکہ طیبہ میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ چونکہ اس ذکر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کے بعض انبیا کو قتل کرنے کا ذکر کیا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت بھی یہود و بعض فرق نصاریٰ کا یہی قول تھا کہ وہ مصلوب ہو کر مقتول ہوئے۔ اور حقیقت الامر اس کے خلاف تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل و صلب کی نفی علیحدہ طور پر کر دی۔ تاکہ کوئی حقیقت ناشناس آپ کو بھی ان انبیا کے زمرہ میں شمار نہ کر لے۔ جو یہود کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ اور اس طرز بیان کو التخصیص بعد التعمیم لاخراج الخاص عن حکم العام کہتے ہیں۔ پس اس آیت سے ملحدین کی صلیب بالکل منہزم و منکسر ہو گئی۔ والحمدللّٰہ علیٰ ذالک۔

کسر صلیب کی تیسری آیت:

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (پ ۷: مائدہ) یعنی (''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمائے گا۔ کہ میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ) جب تم بنی اسرائیل کے پاس معجزات لائے اور انہوں نے ان معجزات کو جادو کہا (اور تم پر دست درازی کرنی چاہی) تو ہم نے ان کا ہاتھ تم سے (دور) روکے رکھا'' (۵:۱۱۰) یعنی تمہارے پاس تک نہ آنے دیا۔ یہ آیت بالصراحت صلیب ملحدین کو توڑ رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہود کو حضرت عیسیٰؑ سے روکنے کو حضرت عیسیٰؑ پر نعمت فرماتا ہے۔ اور آپ کو احسان یاد کراتا ہے۔ معاذ اللہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام یہود کے ہاتھ سے صلیب پر چڑھ جائیں تو اس صورت میں اس احسان سے کذب باری سبحانہٗ لازم آتا ہے۔ ایسا اعتقاد کفر ہے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذالک۔ اسی سورت مائدہ میں صحابہؓ کو بھی ایسے ہی کلمات طیبات سے نعمت یاد کرائی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ. الآية (پ ۶: مائدہ)

"یعنی اے مسلمانو! تم اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی۔ جب قوم کفار نے تم پر دست درازی کرنی چاہی تو ہم نے ان کے ہاتھ تم سے روکے رکھے۔" (۵:۱۱)

جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں کفار یہود نے مکر ایصال شر کیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو آپ تک نہ پہنچنے دیا۔ اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ حبیب خدا اشرف انبیاء ﷺ کے حق میں بھی طائفہ یہود بنی نضیر نے ارادہ کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو ان کے شر سے بالکل محفوظ رکھا[1] اور الٹا ان ہی پر وبالِ جلاوطنی نازل کیا[2] یہ آیت اس نعمت عظمیٰ کی تذکیر و یاددہانی کے لئے ہے۔

سبحان اللہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کو خطاب يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ فرمایا اسی طرح اپنے حبیب ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب ؓ کو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ سے خطاب کیا اور جس طرح حضرت عیسیٰ کو وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ سے نعمت یاد دلائی اسی طرح اپنے حبیب ﷺ اور آپ ؐ کے اصحاب ؓ کو اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ سے انعام یاد کرایا۔ پس جس طرح سے اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کو کوئی گزند اور آسیب نہیں پہنچا۔ اسی طرح حضرت مسیح کو بھی ہرگز صلیب کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ کَفّ کے متعلق ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ یعنی اور جب ہٹا رکھا میں نے تجھ سے

---

1. ابن کثیر سورت مائدہ۔ ۱۲ منہ
2. ابن کثیر سورت حشر۔ ۱۲ منہ

بنی اسرائیل کو۔ اور یہ نہیں فرمایا وَاِذْ نَجَّیْنٰکَ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ یعنی جب بچایا تجھ کو الخ جیسے کہ دوسرے مقام پر بنی اسرائیل کو اپنی نعمت یاد کرائی۔

وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ.

(پ۱: بقرہ)

''اور جب بچایا ہم نے تم کو آل فرعون سے پہنچاتے تھے تم کو بہت برا عذاب''(۴۹:۲)

کیونکہ اس صورت میں وہم پڑ سکتا ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا ہوگا۔ اور آپ کو کچھ اذیت بھی پہنچائی ہوگی۔ مگر آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے ہاتھ سے بچا لیا ہوگا۔ جیسا کہ عقیدۂ ملعونہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ بنی اسرائیل فرعون کے ملک میں غلام تھے۔ اور وہ ان کو ہر طرح کی تکلیف پہنچاتا تھا۔ مگر آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے ظلم سے نجات دی۔ لیکن پہلی صورت میں یعنی قرآن شریف کے الفاظ میں اس وہم کی سراسر تردید ہے۔ یعنی اوّل تو لفظ نجات بچانا کی بجائے لفظ کَفّ (ہٹا رکھا) استعمال کیا۔ دوم یہ کہ کف کا مفعول بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو کیا نہ کہ ضمیر مخاطب کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا کَفَفْتُکَ عَنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (ہٹا رکھا تجھ کو بنی اسرائیل سے) کیونکہ ارادہ ضرر پہنچانے کا یہودیوں کا تھا۔ پس انہی کو ہٹا رکھنے کا ذکر مناسب ہے۔ سوم یہ کہ کف کا صلہ عَنْ ذکر کیا جو بُعد (دوری) کے لئے آتا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول برحق سے دشمنوں کو بالکل دور ہٹائے رکھا۔ اور آپ کے پاس تک بھی پھٹکنے نہ دیا۔ تو پھر وہ کس طرح آپ کو کوئی اذیت پہنچا سکتے ہیں اور کیسے صلیب پر کھینچ سکتے ہیں[1]؟

---

[1] اکمل صاحب فرماتے ہیں۔ باوجود وعدہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ کے حضرت رسول کریم کا دانت مبارک شہید ہوا...... کَفَفْتُ کا لفظ یَعْصِمُکَ سے زیادہ نہیں۔ جواب اولاً تو یہ ہے کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ دانت مبارک شہید ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ ثانیاً یہ کہ عصمت کا لفظ اس موقع پر بولا جاتا ہے۔ جب کوئی گرفتار مصیبت ہو اور پھر اس سے بچا لو

یہی آیت یعنی وَ اِذْ کَفَفْتُ دوسری آیت وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (کافروں سے تجھے پاک رکھنے والا ہوں) کی صحیح تفسیر ہے کہ اس میں بھی تطہیر سے مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کے ہاتھ سے پاک رہیں گے۔ جملہ معتبر تفاسیر میں اس آیت وَ اِذْ کَفَفْتُ کے ذیل میں ایسا ہی مذکور ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک رسول حضرت روح اللہ علیہ السلام کو یہود کے ہاتھ میں گرفتار نہیں ہونے دیا۔ اور کوئی گزند پہنچنے نہیں دیا۔ بلکہ مبسوط تفاسیر میں رَفْعِ اِلَی السَّمَآءِ کی بھی تصریح ہے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں ہے۔

وَلَمَّآ اَتٰی عِیْسٰی بِهٰذِهِ الْاٰيَاتِ الْبَيِّنَاتِ قَصَدَ الْيَهُوْدُ بِقَتْلِهٖ فَخَلَّصَهُ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَرَفَعَهٗ اِلَی السَّمَآءِ. (فتح البیان جلد۲)

"اور جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ روشن نشانات (معجزات) دکھلائے تو یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ سو خدا تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے صاف نکال لیا' اور آسمان کی طرف اٹھا لیا۔"

اور اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں یہ لکھا ہے۔

اَیْ وَاذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ فِیْ کَفِّیْ اِیَّاهُمْ عَنْکَ حِیْنَ جِئْتَهُمْ بِالْبَرَاهِیْنِ وَالْحُجَجِ الْقَاطِعَةِ عَلٰی نُبُوَّتِکَ وَرِسَالَتِکَ مِنَ اللّٰهِ اِلَیْهِمْ فَکَذَّبُوْکَ وَاتَّهَمُوْکَ بِاَنَّکَ سَاحِرٌ وَّ سَعَوْا فِیْ قَتْلِکَ وَصَلْبِکَ فَنَجَّیْتُکَ مِنْهُمْ وَرَفَعْتُکَ اِلَیَّ وَطَهَّرْتُکَ

لیا جائے۔ دیکھو سورۂ ھود میں ہے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے نے طوفان میں مبتلا ہونے کے وقت کہا۔ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ اور حضرت نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ پس کف کا لفظ عصمت کی نسبت زیادہ وسیع ہوا۔ ۱۲ منہ

[1] تفاسیر میں سے اس موقع پر جو عاصمہ اللہ وغیرہ الفاظ نقل کیے گئے تو ہمارے اکمل صاحب نہایت بھولے پن سے کہتے ہیں کہ پس ہمارا مدعا ثابت ہو گیا کہ کففت اور نجیت مترادف ہیں'' ص ۱۸'۱۹۔ جواب: (آپ نے ان تفسیروں میں نجیتک وغیرہ دیکھ لیا اور تصریح رفع الی السماء نہ دیکھی حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء۔ ۱۲ منہ

مِنْ دَنَسِهِمْ وَكَفَيْتُكَ شَرَّهُمْ. انتہی (ابن کثیر زیر آیت ہذا)

"یعنی اے مسیح تو وہ نعمت یاد کر جو ان یہود کو تجھ سے دور ہٹا رکھنے کے بارے میں کی جب تو ان کے پاس یقینی دلائل اور قطعی ثبوت اپنی نبوت اور رسالت کے لایا۔ تو انہوں نے تیری تکذیب کی اور تجھے تہمت لگائی کہ تو جادوگر ہے۔ اور تیرے قتل وعذاب میں سعی کرنے لگے۔ تو ہم نے تجھ کو ان میں سے نکال لیا اور اپنی طرف اٹھا لیا اور تجھے ان کی میل سے پاک رکھا۔ اور ان کی شرارت سے بچا لیا۔"

اور اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے۔

رُوِيَ أَنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لَمَّا أَظْهَرَ هٰذِهِ الْمُعْجِزَاتِ الْعَجِيبَةَ قَصَدَ الْيَهُوْدُ قَتْلَهُ فَخَلَّصَهُ اللّٰهُ مِنْهُمْ حَيْثُ رَفَعَهُ إِلَى السَّمَآءِ. انتہی

"مروی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے یہ معجزات مذکورہ دکھلائے تو یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ تو خدا تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے اس طرح صاف نکال لیا۔ کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا۔"

اور اسی طرح تفسیر خازن میں ہے۔

وَذٰلِكَ أَنَّ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا أَتٰى بِهٰذِهِ الْمُعْجِزَاتِ الْعَجِيبَةِ الْبَاهِرَةِ قَصَدَ الْيَهُوْدُ قَتْلَهُ فَخَلَّصَهُ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَرَفَعَهُ إِلَى السَّمَآءِ.

"اور اس کا سبب یہ تھا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام ایسے عجیب اور روشن معجزات لے کر آئے۔ تو یہود نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں سے صاف ہی نکال لیا اور آسمان پر اٹھا لیا۔"

مرزا صاحب قادیانی نے اپنے رسالہ ازالہ اوہام میں ان آیات تذکیر

انعامات میں کہا ہے۔ کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے ہیں۔ تو ایسا بھی انعام ان نعمتوں میں کیوں معدود نہیں ہوا۔ جواباً معروض ہے کہ اگر چشم حق میں سے دیکھیں تو وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اسی نعمت جلیلہ کی تذکیر کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ جب بیان قرآنی کی رہنمائی سے مفسرینؒ نے صورت واقعہ کو ملحوظ رکھ کر اس آیت سے سمجھ لیا۔ تو جس شخص پر یہ انعام وارد ہوا۔ وہ کیوں نہ سمجھے گا۔ فَتَدَبَّرْ لَعَلَّكَ تَرْشُدُ۔

سوال:۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کفار نے آگ میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس آگ سے بچا لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہود نے حضرت روح اللہ کو صلیب پر چڑھا دیا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ رکھا اور ان کے ہاتھ سے مرنے نہ دیا۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟

جواب:۔ مصنف رسالہ "جواب باصواب" کو بھی ص ۱۰ میں یہی خبط ہوا ہے۔ جناب! وقائع اور امور تاریخیہ میں قیاس کو بالکل دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا مدار صرف روایت وشہادت ہی پر ہوتا ہے۔ وقائع میں قیاسات کے مفید نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وقوع حوادث کی صورت واحد دون آخر نہیں ہوتی۔ پس حضرت روح اللہ کے واقعہ کو قیاس محض سے واقعہ حضرت خلیل اللہ کا ہمرنگ بنانا جہالت و سفاہت ہے۔ کیونکہ صورت نجات اسی ایک طریق میں منحصر نہیں ہے۔ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى مَنْ لَّهٗ اَدْنٰى تَاَمُّلٍ دیگر یہ کہ ہمارا دین سماعی ہے قیاسی نہیں۔ یعنی جو امر جس طرح قرآن وحدیث میں وارد ہے۔ اسے اسی طرح تسلیم کرتے ہیں اور اپنے قیاسات خفیہ اور خیالات ضعیفہ پر مدار نہیں رکھتے' چونکہ قرآن مجید میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا آگ میں پڑنا اور پھر سلامت رہنا ذکر کیا گیا ہے اس لئے اس واقعہ کو اسی طرح مانتے ہیں اور چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام کا صلیب پر نہ چڑھایا جانا اور یہود کا آپ کو مس تک بھی نہ کر سکنا مذکور ہے۔ اسی لئے اسی طرح یقین رکھتے ہیں۔ اپنے خیال وقیاس سے کچھ نہیں کہتے۔

حضرت خلیل اللہ کے واقعۂ نار کی بابت سورۂ انبیاء میں فرمایا:۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَ أَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْأَخْسَرِيْنَ. (پ۱۷:انبیاء)

''ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا اور انہوں نے ابراہیمؑ سے داؤ کرنا چاہا تھا پس ہم نے انہی کو نہایت زیاںکار کر دیا۔'' (۲۱:۶۹،۷۰)

اور سورت صافات میں اَلْاَسْفَلِيْنَ ''نہایت پست'' فرمایا۔ سوان آیات میں امر يَا نَارُ كُوْنِي بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰى إِبْرَاهِيمَ. مشعر اس امر کا ہے۔ کہ آپ آگ میں ڈالے گئے تھے۔ کیونکہ امر يَا نَارُ كُوْنِي بَرْدًا وَّ سَلَامًا نہیں ہو سکتا۔ جب تک آگ موجود نہ ہو[1] اور عَلٰى إِبْرَاهِيمَ صادق نہیں ہو سکتا۔ جب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں واقع نہ ہوں۔ علاوہ اس کے حدیث میں رفعاً وارد ہوا۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا أُلْقِيَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي النَّارِ قَالَ اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ وَاحِدٌ فِي السَّمَآءِ وَأَنَا فِي الْأَرْضِ وَاحِدٌ أَعْبُدُكَ (ابن کثیر جلد ۶ ۲۸۵) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے۔ تو آپ نے کہا اے خدا! تو آسمان میں واحد (لاشریک) ہے اور (اس وقت) زمین میں صرف میں اکیلا تیری (خالص) عبادت کرتا ہوں الخ نیز صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً وارد ہے۔ عن ابن عباسٍ قَالَ كَانَ اٰخِرَ قَوْلِ ابراهيمَ حِيْنَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (کتاب التفسیر سورہ آل عمران) یعنی حضرت

---

[1] وجود خارجی بھی ہوتا ہے۔ اور ذہنی بھی۔ خدا کے امر میں دونو برابر ہیں۔ صورت اس کی یہ ہے کہ اگر خدا کے امر کے وقت مامور خارج میں موجود نہ ہو بلکہ خدا کے علم میں ہو تو خدا تعالیٰ اس صورت علمیہ کو امر کرتا ہے تو فوراً خارج میں اس کا وجود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (پ۲۳:یٰس)(۳۶:۸۲)

ابراہیمؑ جب آگ میں ڈالے گئے' تو آخری بات جو آپ نے کی وہ یہ تھی "حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ" یعنی "مجھے صرف اللہ ہی کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔" پس اس سے آگ کا واقعہ صاف ثابت ہوگیا۔

نیز یہ کہ کفار کو اَخْسَرِیْنَ اور اَسْفَلِیْنَ کر دینا فرمایا اور خَاسِرِیْنَ وسَافِلِیْنَ نہ فرمایا۔ کیونکہ اسم تفضیل میں اسم فاعل پر ازروئے معنی زیادتی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ پس کفار اَلْاَخْسَرِیْنَ یعنی سخت زیانکار اور الاَسْفَلِیْنَ یعنی نہایت پست اور ذلیل تب ہی ہو سکتے ہیں۔ جب اپنا سارا زور بل لگا چکیں۔ اور اپنے اسباب کو استعمال میں لا چکیں۔ اور پھر اپنے ارادے میں ناکام رہیں۔

جیسا کہ سورۂ کہف کے اخیر میں فرمایا۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالاً اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا. ترجمہ: (اے پیغمبر! ان سے) "کہو کیا ہم تم کو بتائیں کہ اپنے اعمال میں کون نہایت زیانکار رہتے ہیں؟ ایسے وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن کی سعی اسی زندگی میں اکارت جائے۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نیک کام کرتے ہیں۔" (۱۶ کہف) (۱۸: ۱۰۳، ۱۰۴)

اس سے ظاہر ہے کہ اخسر اس کو کہتے ہیں۔ جس کی سعی اکارت جائے نیز فرمایا۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (پ ۲۰: عنکبوت) یعنی "ان کی قوم سے کوئی جواب اس کے سوائے بن نہ آیا کہ وہ کہنے لگے۔ کہ اسے قتل کر ڈالو یا اسے آگ میں جلا دو۔ پس خدا نے اسے اس آگ سے نجات دی"۔ (۲۹: ۲۴) اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کے خلاف آپ کی قوم کی دو تجویزیں ذکر کی گئی ہیں۔ قتل یا آگ میں جلانا۔ پھر آگ سے بچا لینے کا ذکر کیا ہے' اس سے معلوم ہوگیا کہ کفار آگ میں ڈالنے کی تجویز کو عمل میں لا رہے تھے۔ لیکن خدائے قہار نے آپ کو اس کے گزند سے محفوظ رکھا۔ دیگر یہ لفظ

شہادت القرآن

نجات جو اس آیت میں وارد ہے اس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کوئی مبتلائے مصیبت ہو اور پھر اس سے بچ جائے۔ چنانچہ فرمایا قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ الآیہ (پ ۷: انعام) (۶۳:۶) میر سیالکوٹی۔ اور نیز یہی وجوہات مذکورہ اس امر کی مؤید ہیں کہ کفار کا کید حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے خلاف صرف تدبیر تک ہی نہ رہا تھا۔ بلکہ صورتِ فعلیہ میں سرزد ہوا تھا اور پھر وہ اس میں ناکام رہے۔ بخلاف حضرت مسیح علیہ السلام کے کہ کفار یہود کا مکر صورتِ فعلیہ میں صادر نہیں ہوا۔ جیسا کہ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اور وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ سے ظاہر ہے۔

سوال:- جب اللہ تعالیٰ دیگر رسولوں کو انہی اسبابِ ارضیہ سے اسی زمین میں مکائدِ کفار سے نجات دیتا رہا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کو ارضِ مقدسہ کی طرف اور اپنے حبیب ﷺ کو مدینہ طیبہ میں ہجرت کرائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں آسمان پر اٹھا لیا کیا زمین پر نہیں بچا سکتا تھا؟''

جواب:- مصنف رسالہ ''جواب باصواب'' کو بھی یہی خبط ہوا ہے چنانچہ بڑے مبہوت ہو کر صفحہ ۱۰ میں یہی سوال کرتے ہیں اور نیز صفحہ ۱۳ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں۔ چونکہ آنحضرت ﷺ کی اس محصوریت سے نجات اس عالم میں ارضی اسباب اور قدرتی تائیدات سے ہو گئی تھی'' الخ سوال کا جواب بالتحقیق والتفصیل بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی تفسیر میں ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ (دیکھو ص ۱۸۷)

کسرِ صلیب کی چوتھی آیت:

وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۴۵:۳) ترجمہ ''صاحب وجاہت ہو گا دنیا و آخرت میں'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صفت وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ سے موصوف کیا۔ اس لئے آپ مصلوب نہیں ہو سکتے کیونکہ مصلوبیت اس عالم دنیوی میں لحوقِ ذلت و خزی کا سبب ہے۔ اور خزی و خذلان منافی وجاہت ہے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں بعد ذکر تصلیب وغیرہ کے

فرمایا۔(سورہ مائدہ پ ۶)(۳۳:۶)۔

ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا.

"یہ ان کے لئے اس زندگی میں خواری ہے۔"

معاذ اللہ اگر حضرت روح اللہ علیہ السلام صلیب پر لٹکائے جائیں تو وجاہت باقی نہیں رہتی خواہ صلیب سے زندہ اتارے جائیں۔ کیونکہ لحوقِ خزی کے لئے مجرد صلیب پر لٹکایا جانا کافی ہے۔ موت بالصلیب ضروری نہیں وَحَاشَا شَانُ رُوْحِ اللّٰهِ الْوَجِیْهِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ عَنْ ذٰلِکَ. پس عقیدۂ ملعونۂ صلیب بالکل مردود ہے۔

سوال:۔حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں یہود بے بہبود نے کیسے کیسے ناشائستہ کلمات کہے کیا یہ امر منافیٔ وجاہت نہیں؟

جواب:۔جھوٹے طعن اور بہتان سے شانِ بری میں کوئی قدح واقع نہیں ہوتا کیونکہ اذی بالقول اور وجاہت میں منافات نہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں فرمایا۔ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِیْهًا (پ۲۲: احزاب ۳۳:۶۹) یعنی "پس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو اس سے جو انہوں نے کہا تھا' بری کیا اور وہ خدا کے نزدیک صاحبِ وجاہت تھا۔" پس جس طرح حضرت کلیم اللہ کو مضمونِ مقولۂ یہود سے بری کیا۔ اور آپ کی وجاہت میں کوئی نقص نہ آیا۔ اسی طرح حضرت روح اللہ اور کلمۃ اللہ کو معجزۂ تکلم فی المہد سے طعنِ یہود سے بری کیا۔ پس آپ کی وجاہت میں بھی کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ.

---

۱ حضرت روح اللہ جو دنیا اور آخرت میں وجاہت والے ہیں ان کی شان اس سے پاک ہے۔عبدالقیوم مہیر

فصلِ ثانی

دراثباتِ حیات ورفعِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع الی السماء

فصلِ ثانی

در اثباتِ حیات ورفعِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع الی السماء

بنصوص قطعیہ ثابت ہے۔ چنانچہ پہلی آیت یہ ہے:۔

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (الآیۃ پ۳: آل عمران)(۵۵:۳)

"جب کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں ہوں تیرا بھر لینے والا اور اٹھانے والا تجھ کو اپنی طرف اور پاک رکھنے والا تجھ کو کافروں سے۔"

اس آیتِ معنونہ کا آیتِ مقدمہ سے ارتباط اس طرح ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے مکر (تدبیر محکم) کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس مکر کے وقت وقوع اور صورتِ وقوع کا ذکر کیا۔ نیز یہ کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ فرمائی تھی۔ اس آیت میں مکر (تدبیر محکم وکامل) کی ایک مثال ذکر کی جو اسی قصہ کے متعلق تھی۔ چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ تعالٰی ظَرْفٌ لِخَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ اَوْ مَکْرَ اللّٰہِ.

اِذْ قَالَ اللّٰہُ ظرف ہے خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ کا یا مَکْرَ اللّٰہِ کا۔

اسی طرح دیگر تفاسیر میں بھی ہے۔ مثلاً بیضاوی۔ سراج منیر وغیرہ۔ غرض مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت جملہ مَکْرَ اللّٰہِ کی تفسیر کرتی ہے۔ اور واضح طور پر کیفیت اور صورتِ مکر یعنی تدبیر الٰہی کو بیان کرتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ فرمائی۔ اس لئے لامحالہ اس کی تدبیر رسول برحق کی

شان میں خیر ہونی چاہیئے۔ اور اعداء الرسول کے حق میں مضر۔ ظاہر ہے کہ کفار نابکار کے ناپاک ہاتھوں سے صلیب پر چڑھایا جانا رسول مؤید بالمعجزات کی شان میں خیر نہیں ہے۔ بلکہ رَفَعَ اِلَى السَّمَآءِ خیر الخیرات واحسن التدبیرات سے ہے۔

وقوع مکر یعنی رفع الی السماء سے پیشتر یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ الآیہ کی یہ ضرورت تھی۔ کہ چونکہ کفار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل و صلب میں از حد کوششیں کیں۔ اور آپس میں منصوبے باندھے اور آپ کے منزل مہبط رحمت الٰہیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس لئے ایسے نازک وقت میں تسلی کے لئے بشارت تخلیص از مکر اعداءؔ ضروری تھی۔ کہ اے عیسیٰ میں ان کافروں کو ان کے مکر میں کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ بلکہ تجھ کو اپنی طرف پورا پورا اٹھا لوں گا۔ ایسا کہ ان کے ہاتھ میں تیرا ایک بال بھی نہ آئے۔ چنانچہ تفسیر رحمانی میں ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِعْلَامًا لَهٗ بِمَكْرِهٖ بِالْاَعْدَآءِ وَ تَخْلِيْصِهٖ عَنْ مَكْرِهِمْ. ۱۲

”جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی اس تدبیر پر واقف کرنے کے لئے کہا۔ جو اس نے آپ کے دشمنوں سے کرنی تھی اور ان کے مکر سے آپ کو سلامت نکال لینے کے متعلق تھی“۔

تحقیق لفظ توفیؔ:

واضح ہو کہ توفی کی نسبت مرزا صاحب قادیانی کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ یہ لفظ صرف موت اور قبض روح کے لئے موضوع ہے اور یہ امر اس کے علوم رسمیہ اور لیاقت علمیہ سے بالکل بے بہرہ اور عاری ہونے پر دلیل بین ہے۔ کیونکہ لفظ توفی لفظ وفا سے ماخوذ ہے۔ اور وفا کے معنی ہیں پورا کرنا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔ اَلْوَفَاءُ ضِدُّ الْغَدْرِ يُقَالُ وَفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اَوْفٰى بمعنى (جلد بستم) یعنی وفا غدر کی ضد ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ کہ فلاں شخص نے اپنا عہد پورا کیا اور اوفی

(باب افعال) اسی کا ہم معنی ہے۔" پس توفی باب تفعل ہے اسی مادۂ وفا سے۔
اس کے معنی ہوئے اخذ الشیء وافیًا. یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ چنانچہ
تفسیر کبیر۔ خازن۔ جامع البیان۔ بیضاوی۔ سراج منیر۔ ابی السعود اور فتح البیان
ان سب تفاسیر میں اس امر کی تصریح موجود ہے اور دیگر ابواب جو مادۂ وفا سے
آئے ہیں۔ ان سب میں بھی یہی معنی ملحوظ ہیں۔ اور جس طرح سے مادہ کے حروف
ہر صیغہ میں باقی رہتے ہیں۔ اسی طرح مادہ کے معنی بھی ہر باب و صیغہ میں باقی
رہتے ہیں۔

علم صرف میں ادنٰی مہارت رکھنے والا بھی اسے بخوبی جانتا ہے۔ چنانچہ ہم
ناظرین کی سہولت اور مزید تسلی کے لئے اس مادہ وَفَی سے جو جو باب زبانِ عرب
میں مستعمل ہیں۔ ان سب کا نقشہ مع مثالوں کے لکھتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہو جائے
گا کہ ہر باب کے ہر معنی میں اس کے مادی معنی یعنی "پورا کرنا" ملحوظ ہے۔

باب	مادہ وفا سے مصدر	معنے مصدری	امثـــــــال
مجرد ثلاثی	وَفَاء	پورا کرنا۔ نبھانا	(۱) اَمَّا ابْنُ طَوْقٍ فَقَدْ اُوْفٰی بِذِمَّتِهٖ كَمَا وَفٰی بِقِلَاصِ النَّجْمِ حَادِیْهَا یعنی ابن طوق نے تو اپنا ذمہ پورا کر دیا۔ الخ لسان العرب اور مصباح میں زیر لفظ وفی اس شعر کو اس نے ذکر کیا ہے کہ مجرد وفی اور مزید فیہ اوفی دونوں ہم معنی ہیں۔
باب	مادہ وفا سے مصدر	معنے مصدری	امثـــــــال
ثلاثی مجرد	وَفَاء	پورا کرنا۔ نبھانا	(۲) لسان العرب۔ میں یہ بھی ہے۔ وَفٰی الْحَدِیْثُ فَمَرَّتْ

باب	مصدر	معنی	مثال
			بِقَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ كُلَّمَا قُرِضَتْ وَفَتْ اى تمت وطالت. یعنی حدیث میں آیا ہے میں دوزخیوں کی ایک قوم پر گزرا۔ جن کے ہونٹ کاٹے جاتے تھے جب جب کاٹے جاتے تھے۔ پھر "پورے" ہو جاتے تھے۔
افعال مزید فیہ	ایفاء	پورا کرنا۔ پورا دینا۔	(۱) اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ پ۱) (اے بنی اسرائیل تم میرا عہد (جو مجھ سے کیا ہے) پورا کرو۔ میں تمہارا عہد (جو تم سے کیا ہے) پورا کروں گا۔ (۴:۲) (۲) وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ. (پ۸: انعام) اور پیمانے اور ترازو کو عدل سے "پورا کرو" یعنی پورا پورا ماپ کر اور تول کرو۔ (۱۵۳:۶) (۳) اِذَا غَدَرَتْ حَسْنَآءُ اَوْفَتْ بِعَهْدِهَا وَمِنْ عَهْدِهَا اَنْ لَّا يَدُوْمَ لَهَا عَهْدٌ (متنبی) ترجمہ: جب خوبصورت محبوبہ عہد شکنی کرے۔ تو وہ اپنے عہد کو "پورا" ہی کرتی ہے کیونکہ اس کے عہد میں سے یہ بھی

			ہے کہ اس کا عہد ادائی نہ ہو۔
باب	مادہ وفا سے مصدر	معنے مصدری	امثـــــــــال
تفعیل	توفیہ	پورا دینا	(۱) فَيُوَفِّيهِمْ أُجُوْرَهُمْ (آل عمران پ۳) (اسی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ سے تھوڑا آگے) ترجمہ پس خدا تعالیٰ ان کو ان کے اجر پورے دے گا۔ (۳:۵۶) (۲) وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران پ۴) ترجمہ: سوائے اس کے نہیں کہ تمہارے اجر پورے پورے تم کو قیامت کے دن دیئے جائیں گے۔ (۳:۱۵۴) (۳) وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (النجم پ۲۷) اور ابراہیم علیہ السلام (کے صحیفوں میں) جس نے پورا کر دکھایا" لسان العرب میں یہ بھی لکھا ہے وَفٰی بِالشَّیْءِ وَ اَوْفٰی وَوَفّٰی بمعنی وَاحِدٍ یعنی اس کا مجرد اور باب افعال اور باب تفعیل (تینوں) ہم معنی ہیں۔
استفعال	استیفاء	پورا پورا لے	(۱) اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (تطفیف پ۳۰)

		لینا(۱)	جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں۔ تو پورا پورا لیتے ہیں۔(۲:۸۳) (۲) تَوَفَّيْتُ مِنْهُ دَرَاهِمِی. ترجمہ میں نے اس سے اپنے درہم پورے وصول پائے۔ یہ محاورہ تفسیر کبیر۔خازن۔سراج منیر۔ میں زیر آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ لکھا ہے۔"
تفعّل	توفّی	(۲) موافقت باب استفعال یعنی توفّی و استیفاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں کامل اور پورا لے لینا	(۱) اِسْتَوْفَاهُ وَ تَوَفَّاهُ اِسْتَكْمَلَهٗ (اساس البلاغہ) ترجمہ: اِسْتَوْفَاهُ اور تَوَفَّاهُ کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اسے کامل اور پورا لے لیا' (۲) تَوَفَّيْتُ الْمَالَ مِنْهُ وَ اسْتَوْفَيْتُهٗ اِذَا اَخَذْتَهٗ كُلَّهٗ (لسان العرب جلد ۲۰) یعنی تَوَفَّيْتُ الْمَالَ اور اِسْتَوْفَيْتُهٗ دونوں کے یہ معنی ہیں کہ اس نے پورا پورا لے لیا اور اس سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ (۳) وَتَوَفَّاهُ هُوَ مِنْهُ وَاسْتَوْفَاهُ لَمْ يَدَعْ مِنْهُ شَيْئًا (لسان العرب جلد ۲۰) تَوَفَّاهُ اور استوفاہ دونوں کے یہ معنی ہیں کہ اس نے

پورا پورا لے لیا اور اس سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ (۳) تَوَفَّيْتُهٗ وَاسْتَوْفَيْتُهٗ بِمَعْنًى یعنی تَوَفَّیْتُ اور اِسْتَوْفَیْتُ دونوں ہم معنی ہیں۔ (مصباح المنیر للعلامۃ الفیومی) (۴) اِسْتِيفَاءٌ تَوَفِّی تمام گرفتن حق یعنی دونوں کے معنی ہیں حق پورا لے لینا۔			
(۱) تَوَفَّيْتُ عَدَدَ الْقَوْمِ اِذَا عَدَدْتُهُمْ كُلَّهُمْ (لسان العرب جلد ۲۰) یعنی میں نے سب قوم کی گنتی پوری لے لی۔ اس کی شہادت کے لیے لسان العرب میں یہ شعر لکھا ہے (۲) اِنَّ بَنِى الْاَدْرَدِ لَيْسُوْا مِنْ اَحَدٍ وَلَا تَوَفَّاهُمْ قُرَيْشٌ فِى الْعَدَدِ. تحقیق بنی اَدرد کسی میں سے نہیں ہیں اور قریش نے ان کی گنتی پوری نہیں کی۔	پورا پورا گن لینا	توفی	تفعّل
(۱) وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ (انعام پ ۷) "خدا ایسی ذات ہے کہ تم کو رات کے وقت پورا لیتا ہے	(مجازاً) سلا دینا بقرینہ لیل		

شہادت القرآن

تفعل	توفی	(رات) اور منام و کری (نیند) وغیرہ	یعنی سلا دیتا ہے۔" (۶:۶۰) (۲) اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا (زمر پ۲۴) "خدا ہی پورا پکڑتا ہے۔ جانوں کو ان کی موت (جسم اور روح کی مفارقت) کے وقت اور جو (ابھی) نہیں مریں (ان کو پورا پکڑتا ہے) ان کی نیند کے وقت یعنی سلا کر۔" (۳۹:۴۲) (۳) فَلَمَّا تَوَفَّاہُ رَسُوْلُ الْکَرٰی وَدَیَّبَ الْعَیْنَانِ فِی الْجَفْنِ ۔ترجمہ: جب اسے نیند کے فرشتے نے پکڑ لیا الخ یعنی وہ سو گیا۔ (۴) لسان العرب میں کہا ہے وَاَمَّا تَوَفِّی النَّائِمِ فَهٰذَا اِسْتِیْفَاءُ وَقْتِ عَقْلِهٖ وَ تَمْیِیْزِهٖ اِلٰی اَنْ نَامَ
باب	مادہ ولی سے مزید فیہ	معنے مصدری	امثال
تفعل	توفی	(مجازاً) مار لینا بقرینہ موت و	(۱) اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا (زمر پ۲۴) یعنی خدا ہی جانوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت' یعنی مارتا ہے' (۳۹:۴۲) (۲) قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَلَکُ الْمَوْتِ

		ملک الموت وغیرہ	(الم سجدہ پ۲۱) (اے پیغمبران سے) کہو تم کو قبض کرے گا ملک الموت یعنی تم کو مارے گا (۱۱:۳۲) (۳) حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ (النسآء پ۴) یعنی حتیٰ کہ قبض کرے ان کو موت یعنی وہ مر جائیں۔ (۱۵:۴) نوٹ:۔ ان سب آیات میں توفی سے موت مراد لینے کے لئے موت اور ملک الموت قرائن ہیں۔ اور یہ معنی مجازی ہیں۔ چنانچہ آئندہ واضح ہو گا۔ ان شاء اللہ

تنبیہ:۔

واضح ہو کہ توفی بمعنی موت مجازاً ہے نہ حقیقۃً ووضعاً جیسا کہ اساس البلاغۃ میں ہے۔ومن المجاز[1]...... تُوُفِّيَ فُلَانٌ وَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَ اَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ یعنی یہ مجازات ہیں اور لسان العرب میں اس کی وجہ میں کہا ہے تَوَفِّي الْمَيِّتِ اِسْتِيْفَاءُ مُدَّتِهِ الَّتِيْ وُفِّيَتْ لَهٗ وَعَدَدِ اَيَّامِهٖ وَشُهُوْرِهٖ وَاَعْوَامِهٖ فِي الدُّنْيَا.

---

[1] اکمل صاحب اپنی شہادت کے ص ۲۰ میں خاکسار کو الزاماً کہتے ہیں "موت کے معنی کو مجاز کہنا آپ ہی کی ایجاد ہے۔۱۲۔ جواب! مرزا صاحب خود اور ان کی جماعت بھی علوم عربیہ سے بالکل بے بہرہ ہے میں تو علامہ زمخشری کا حوالہ دیتا ہوں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آپ ہی کی ایجاد ہے۔ چہ خوش۔۱۲ منہ سعادت۔

ترجمہ: میت کی توفی سے مراد ہے اس کی مقررہ مدت اور اس کے دنیا میں رہنے کے دنوں، مہینوں اور سالوں کی گنتی کو پورا کرنا۔

ائمہ لغت اور ائمہ تفسیر بلا خلاف مادہ وفا کے باب تفعل و استفعال کو ہم معنی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ فیومی مصباح میں فرماتے ہیں۔

تَوَفَّيْتُهٗ وَاسْتَوْفَيْتُهٗ بمعنی ترجمہ **تَوَفَّيْتُهٗ** اور **اِسْتَوْفَيْتُهٗ** ہم معنی ہیں یعنی دونوں کے معنی ہیں۔ میں نے اسے پورا لے لیا۔

وَاَسْتَوْفَاهُ و تَوَفَّاهُ اِسْتَكْمَلَهٗ:

اسی طرح تفسیر کبیر اور تفسیر خازن اور تفسیر معالم میں بھی ان کو ہم معنی ذکر کیا گیا ہے۔ اور صراح اور قاموس میں بھی ایسا ہی بیان ہے اور اساس البلاغۃ میں لکھا ہے کہ اَسْتَوْفَاهُ اور تَوَفَّاهُ دونوں کے معنی ہیں اس نے اسے کامل لے لیا۔

مرزا صاحب قادیانی نے اپنے آئینہ وساوس[1] کے ص ۵۶۴ میں جہاں اپنے آپ کو خدا بنایا ہے۔ اِسْتَوْفَانِیْ لکھا ہے اور اس جگہ فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اور مفعول خود مرزا صاحب ذی روح۔ اور اس سے مراد موت نہیں ہے۔ پس مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ لفظ توفی سوائے قبض روح کے کسی اور معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ بالکل غلط اور مردود ٹھہرا۔ کیونکہ جب بتصریح ائمہ لغت و تفسیر ثابت ہو چکا ہے کہ توفی اور استیفاء ہم معنی ہیں۔ تو جس طرح استیفاء سوائے معنی موت کے مستعمل ہوتا ہے۔ اسی طرح توفی کے سوائے معنی موت کے استعمال کو کون مانع ہے؟ خصوصاً جب محاورہ **تَوَفَّيْتُ مِنْهُ دَرَاهِمِیْ** مندرجہ تفسیر کبیر جلد دوم ص ۴۸۱ ''یعنی میں نے اس سے اپنے درہم پورے بھر پائے۔'' زبان عرب میں ذائع و

---

[1] یہ کتاب مرزا صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کے دو نام ہیں آئینہ کمالات اسلام اور دافع الوساوس ہم نے دونوں کو ترکیب امتزاجی سے ایک کر کے لکھا ہے۔ ۱۲ منہ

شائع ہو۔

پس جب آئمہ لغت و تفسیر بالاتفاق لکھتے ہیں کہ اس مادہ کے باب تفعل اور استفعال کے معنی ایک ہی ہیں۔ اور قرآن مجید اور لغت میں سے استیفاء کے معنی پورا پورا لے لینا ثابت کیا گیا ہے۔ تو اب توفی کے معنی پورا پورا لینا کرنے میں کیا تردد باقی رہا۔ علاوہ بریں جب علم اشتقاق و تصریف سے بھی واضح ہو گیا کہ یہ لفظ توفی مادہ وفا کا مزید فیہ ہے اور وفا کے معنی بحسب الوضع موت نہیں۔ بلکہ پورا کے ہیں۔ تو پھر بھی باوجود اتنی تصریحات کے کوئی شخص اپنی ضد نہ چھوڑے۔ اور بے تکی ہانکتا جائے۔ کہ توفی موت اور قبض روح کے لئے موضوع ہے۔ تو کیا اس کی لیاقت علمی ہنسی کے قابل نہیں ہو گی؟

باقی رہا یہ امر کہ یہ لفظ قرآن شریف میں بمعنی موت مستعمل ہوا ہے۔ سو ہم اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ معنی مستعمل فیہ اور موضوع لہ میں فرق ہوتا ہے۔ استعمال سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ اصل میں موت کے لئے وضع کیا گیا تھا اور اس کے حقیقی معنی بس قبض روح ہی کے ہیں۔ جس قدر محاورات میں لفظ توفی جن معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی کوئی مدعی علم و فضل ہم کو اس کے وضعی اور حقیقی معنوں ''پورا پورا لے لینا۔'' سے باہر ثابت کر دے تو بے شک ہم اس کے بے دام غلام ہیں اس لفظ کا اطلاق موت کے معنی پر بھی صرف اس لئے ہے کہ موت بھی ایک قسم کی توفی یعنی پوری پوری گرفت ہوتی ہے۔ نہ اس

ل اکمل صاحب قادیانی علمی باتوں کے نہ سمجھنے میں بہت کامل ہیں۔ ہم نے جو تفاسیر معتبرہ کی عبارات سے موت کو توفی کی ایک نوع ثابت کر کے ظاہر کر دیا کہ توفی موت کے لئے موضوع نہیں تو ہمارے اکمل صاحب ایسی بات کو بھی نہ سمجھ کر اس پر لکھتے ہیں۔ ''جب موت توفی کی قسم ہے۔ تو بھی وضعی معنی ہوئے نہ کہ مجازی۔'' (ص ۲۰) جواب: بریں اکملیت بیا ید گریست' جناب من قسم اور مقسم کی وضع ایک نہیں ہوتی لہٰذا کوئی لفظ اپنے مفہوم کلی اور اس کی انواع ہر دو کے لئے موضوع نہیں ہوتا۔ فافہم ۱۲ سعادت۔ منہ

شہادت القرآن

اعتبار سے کہ یہ لفظ بمعنی موت موضوع ہے۔

چنانچہ تفسیر بیضاوی میں زیر آیت فلما توفیتنی لکھا ہے:۔

اَلتَّوَفِّی اَخْذُ الشَّیْئِ وَافِیًا وَالْمَوْتُ نَوْعٌ (منہ ۱۲)

"توفی کے معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا لینا اور موت اس کی ایک نوع ہے۔"

اسی طرح توفی کا اطلاق قرآن شریف میں نیند پر بھی آیا ہے۔ یہ بھی اسی لئے ہے کہ نیند بھی ایک قسم کی توفی یعنی پوری پوری گرفت ہوتی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے مقدمہ میں جو توفی کے معنی رفع الی السماء لئے جاتے ہیں۔ تو اسی اعتبار سے کہ یہ بھی ایک قسم کی توفی یعنی پوری پوری گرفت ہے۔ اور قرض وصول کر لینے پر بھی اس کا اطلاق محاورۂ زبان عرب میں پایا گیا ہے' تو وہ بھی اسی لحاظ سے کہ قرض پورا پورا لے لیا جاتا ہے۔ الغرض توفی کے جس قدر محاورات و استعمالات ہیں۔ خواہ وہ قرآن مجید میں ہیں۔ خواہ حدیث شریف میں خواہ دواوین عرب میں' ان سب میں اس کے وضعی اور حقیقی معنی اخذ الشیء وافیا یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہی ملحوظ ہیں۔ اور بس..... اور ظاہر ہے کہ جس لفظ کے کئی معنی یا کئی استعمالات ہوں۔ اس کو ایک معنی میں معین کرنے کے لئے ضرور ضرور کوئی قرینہ موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ متکلم کی مراد ایک وقت میں اس لفظ سے ایک ہی ہے۔ پس توفی کے ساتھ اگر موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہوگا۔ تو اس کے معنی موت ہوں گے۔ اور اگر نیند اور اس کے مقتضیات مذکور ہوں گے' تو توفی کے معنی سلا دینا ہوں گے۔ اور اگر اس کے ساتھ ذکر رفع کا ہوگا۔ تو اس سے مراد رفع ہوگی اور اگر اس کے ساتھ درہم و دینار وغیرہ اشیا کا ذکر ہوگا۔ تو اس کے معنی ان کا قبض کرنا ہوں گے۔ اور اگر اس کے ساتھ عدد اور گنتی کا ذکر ہوگا۔ تو اس کے معنی پورا پورا گن لینا ہوں گے۔

ثانیاً براہین اثبات جہالت قادیانی:

سورۂ زمر میں ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى الآيه (زمر پ۲۴۔۳۹:۴۲)

اللہ ہی پورا پکڑتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور جو ابھی نہیں مریں ان کو (پورا پکڑتا ہے) ان کی نیند کے وقت پس اس جان کو بند رکھتا ہے۔ جس پر موت کا حکم جاری کیا اور دوسری کو چھوڑ دیتا ہے۔ "بمقررہ مدت تک۔"

سورۂ انعام میں فرمایا:۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى الآيه (پ۷ انعام)

"اللہ وہ ہے جو تم کو رات کے وقت پوری گرفت کرتا ہے اور جو کچھ تم دن کو کرتے ہو جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں اٹھا کھڑا کرتا ہے تاکہ اجل مسمیٰ پوری کی جائے۔" (۶:۶۰)

ان آیتوں میں توفی کی دو انواع' موت اور منام' مذکور ہوئی ہیں' توفی بالموت کی صورت قبضِ روح مع الامساک ذکر کی گئی ہے اور توفی بالنوم کی صورت قبضِ روح مع الارسال بیان کی گئی ہے۔ پس قبضِ روح جو دونوں میں مشترک ہے جنس ہے امساک اور ارسال فصل ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُمَيِّزُ الشَّيْءَ عَمَّا يُشَارِكُهُ فِي الْجِنْسِ (کتب منطق)

"یعنی فصل اسے کہتے ہیں۔ جو کسی چیز کو اس چیز سے تمیز کرے جو جنس میں اس کی شریک ہو۔"

پس بموجب مذہب مرزا صاحب توفی صرف قبضِ روح کے لئے موضوع چاہیے۔ نہ موت اور قبضِ روح ہر دو کے لئے۔ کیونکہ ان دونوں میں نسبت عموم و خصوص ہے۔ اور کوئی لفظ معنی اعم و اخص ہر دو کے لئے موضوع[1] نہیں ہوتا۔ فافہم۔

ثالثاً:

اگر مرزا صاحب صرف قبضِ روح ہی کو مدلول وضعی قرار دیں تو یہ بھی ان کی بے علمی و بے استعدادی پر دلیل ظاہر ہوگی کیونکہ توفی لفظ مفرد ہے۔ اور قبضِ روح مرکب۔ زیرا کہ ثانی میں جزءِ لفظ جزءِ معنی پر دال ہے۔ یعنی قبض دال ہے اخذ پر اور روح دال ہے شئے مقبوض پر بخلاف اول کے کہ اس میں جزءِ لفظ جزءِ معنی پر دلالت نہیں کرتی۔ لہٰذا لفظ توفی مفرد کا مدلول قبضِ روح جو مرکب ہے۔ درست نہیں اسی لئے سورۂ زمر کی آیت میں صرف یتوفی نہیں کہا بلکہ یتوفی الانفس کہا ہے۔ تا کہ توفی دلالت کرے اخذ پر اور انفس کہ مدلول اس کا ارواح ہے دلالت کرے شئے مقبوض پر اور بعد ترکیب کے معنی مرکب پیدا ہوں اگر توفی (مفرد) کے معنی قبضِ روح (مرکب) ہیں تو لفظ نفس کی کیا ضرورت تھی۔ پس ثابت ہوا کہ توفی کے حقیقی معنی مطلق قبض کے ہیں۔ نہ قبضِ روح کے۔ وَھٰذَا ھُوَ الْمُرَاد

رابعاً:

بالفرض اگر مان بھی لیں کہ توفی کے حقیقی معنی قبضِ روح ہیں۔ تو پھر بھی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت نہیں

---

[1] اکمل صاحب نے اس عموم و خصوص کے متعلق ایک خاص علمی کمال دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں "حالانکہ قبضِ روح عین موت کا مترادف ہے۔" (ص ۲۱) ۱۲۔ بندۂ خدا! عام و خاص میں ترادف کہاں؟ ترادف میں تو اتحاد و مساوات کا لحاظ ہوتا ہے اور عام و خاص میں کمی بیشی ہوتی ہے پس ان میں ترادف کا ادعا باطل ہے۔ ۱۲ سعادت۔ منہ۔

ہو سکتی۔ کیونکہ جب قبضِ روح کی کیفیتیں دو ہیں۔ ایک مع الامساک اور دوسری مع الارسال تو آیت اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ میں توفی بقرینہ رَافِعُکَ اِلَیَّ جو رفع جسمی پر روزِ روشن کی طرح دلالت کر رہی ہے۔ بمعنی نیند معین ہو گی۔ کیونکہ منام اور رفعِ جسمی میں منافاۃ نہیں بلکہ ان میں جمع ممکن ہے۔ جیسا کہ ایک جماعتِ مفسرین علیہم الرحمۃ اس طرف بھی گئی ہے۔ چنانچہ خازن میں ہے:-

(الثانی) المراد بالتوفی النوم و منه قوله تعالیٰ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فجعل النوم وفاة و کان عیسٰی قد نام فرفعه الله وهو نائم لئلا يلحقه خوف. (تفسیر خازن)

''(اس جگہ) توفی سے مراد نیند ہے۔ اور اسی سے ہے آیت الله یتوفی الْاَنفس الخ پس اس میں خدا تعالیٰ نے نیند کو بھی وفات کہا ہے۔ پس انی متوفیک سے مراد یہ ہوئی کہ حضرت عیسیٰ سو گئے تھے۔ پس خدا نے آپ کو نیند ہی میں اوپر اٹھا لیا تا کہ آپ کو خوف لاحق نہ ہو۔''

اور اسی طرح دیگر تفاسیر مثل درمنثور۔ ابن کثیر۔ فتح البیان معالم۔ تفسیر کبیر میں بھی اس امر کی تصریح موجود ہے۔

پس اب تو مرزا صاحب کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اور ان کے ہاتھوں میں سوائے ابلہ فریبی وتاویلاتِ باطلہ وتحریفات کاسدہ کے اور کچھ نہ رہا۔ کیونکہ صاف ثابت ہو گیا کہ توفی کے معنی اَخْذُ الشَّيْءِ وَافِيًا ہیں۔ اس پر زیادۃ بالنظر الی المتعلق والقرائن کی جائے گی۔ نہ بحسب الوضع۔ پس توفی کا متعلق یا تو صرف جسم ہو گا۔ یا صرف روح یا جسم مع روح۔ پھر اگر روح ہے تو یا تو مقبوض مع الامساک ہو گا۔ اسے موت کہیں گے۔ یا مع الارسال اسے (نیند) بولیں گے۔ ان ہر دو میں

دو دو امر علاوہ مفہوم توفی کے اعتبار سے کیے گئے۔ موت میں روح اور امساک۔ اور منام میں روح اور ارسال۔ پس مرکب معانی کے لئے ترکیب الفاظ بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس ترکیب کے لئے ضروری ہوا کہ متعلق توفی اور قرائن کی طرف نظر کی جائے:۔

❶ قبضِ روح مع الامساک اور قبضِ روح مع الارسال کی مثال سورۂ زمر کی وہ آیت ہے۔ جو اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ یعنی:۔

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی الآیه (زمر پ۲۴)

اللہ ہی روحوں کو قبض کرتا ہے۔ ان کی موت (مفارقتِ روح و بدن) کے وقت اور جو روحیں ابھی نہیں مریں۔ ان کو قبض کرتا ہے ان کی نیند میں پس جس روح پر موت کا حکم جاری کیا ہے۔ اس کو تو روک رکھتا ہے۔ اور دوسری (نیند والی) کو مدتِ مقرر (موت) تک بھیجتا رہتا ہے۔" (۴۲:۳۹)

اس آیت میں ہر معنی کے لئے ایک لفظ مذکور ہے۔ یعنی قبض کے لئے یتوفی اور روح کے لئے اَلْاَنْفُس اور مرنے کے لئے مَوْت اور امساک کے لئے یُمسِکُ اور نیند کے لیے منام اور ارسال کے لئے یرسل۔

❷ صرف قبضِ جسم کی مثال محاورہ عرب شائعہ فی اللسان مندرجہ تفسیر کبیر۔ خازن وغیرہ: تَوَفَّیْتُ مِنْهُ دَرَاهِمِیْ (میں نے اس سے اپنے درہم پورے لئے۔)

❸ قبضِ جسم مع روح یعنی زندہ چیز کو اخذ کرنے کی مثال آیات اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ اور فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ بقرینہ رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ. فَافْهَمْ وَ تَدَبَّرْ.

سوال:- بیشک علم تصریف اور علمی تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ توفی کے معنی پورا پورا لے لینا ہیں۔ لیکن لغت کی بعض کتابوں میں جو توفی بمعنی موت کہا ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

جواب:- کتب لغت میں حقیقی۔ منقولی اور مجازی ہر طرح کے معنی لکھے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تعیین حسب قرائن حالیہ و مقالیہ سلسلۂ عبارت سے مفہوم ہوتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ابتدا میں لفظ جس معنی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ اسے اس کے حقیقی اور وضعی معنی کہتے ہیں۔ پھر یا تو لفظ کا ایک ہی معنی ہوگا یا زیادہ۔ پھر زیادہ یا تو بحسب الوضع ہوں گے۔ اسے مشترک کہتے ہیں۔ مثلاً عین جو بمعنی زر۔ زانو۔ چشمۂ آب اور آنکھ ہے یا وضع میں تو ایک معنی تھا۔ مگر اس کے مفہوم میں کئی چیزیں پائی گئیں۔ اسے جنس کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کی نوع کہتے ہیں۔ مثلاً حیوان کہ جنس ہے اور گھوڑا اور گدھا اس کی انواع ہیں صرف اس اعتبار سے کہ وہ جاندار ہیں۔ نہ اس لئے کہ حیوان بحسب الوضع ان سب کے لئے موضوع ہے۔ اور یا کثرت بہ سبب دیگر معانی میں منقول ہونے کے ہوگی۔ پھر اگر عرف عام نے نقل کیا ہے۔ تو اسے منقول عرفی کہتے ہیں مثلاً دابہ کہ اصل میں موضوع ہے ہر جاندار کے لئے جو زمین پر چلے اور غالب معنی اس کے سواری کے جانور ہیں' اور اگر اس کی ناقل شرع ہے تو اسے منقول شرعی کہتے ہیں۔ مثلاً صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج کہ لغت میں ان کے وضعی معنی اور ہیں۔ مگر شریعت میں یہ الفاظ اور معانی میں مخصوص ہیں۔ اور اگر اس کا ناقل کوئی خاص طائفہ ہے۔ تو اسے منقول اصطلاحی کہیں گے مثلاً مصطلحات علمیہ و کتب منطق۔ قطبی وغیرہ۔ اب ظاہر ہے کہ توفی بحسب الوضع بمعنی موت موضوع نہیں۔ کیونکہ اس کا ماخذ و مادہ وفا ہے اور نہ یہ لفظ مشترک المعنی ہے کہ اس کے معانی متعددہ میں سے ایک موت بھی ہو اور نہ منقول شرعی ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ میں تصرف کرنے سے شریعت کو کچھ تعلق نہیں اور نہ منقول اصطلاحی ہے۔ کیونکہ یہ کسی علم

اور فن کی اصطلاح نہیں۔ اگر ہے تو یہی کہ یہ لفظ بروئے علم اشتقاق وفا سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے حقیقی اور وضعی معنی اَخذُ الشَّیءِ وافیًا یعنی کسی چیز کو پورا پورا پکڑ لینا" ہیں اور چونکہ اس کے مفہوم میں رفع اور موت اور نیند بھی داخل ہیں۔ کیونکہ یہ بھی پوری پوری گرفت ہیں۔ اس لئے اس لفظ کا اطلاق رفع اور موت اور نیند پر بھی درست ہوگا۔ صرف اس اعتبار سے کہ توفی جنس ہے اور رفع اور موت اور نوم اس کی انواع ہیں۔ نہ اس لئے کہ یہ لفظ بحسب الوضع موت کے لئے موضوع ہے۔ توفی کے جنس اور رفع اور موت اور نیند کے انواع ہونے پر تفاسیر معتبرہ شاہد ہیں چنانچہ تفسیر کبیر میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:-

قَوْلُهُ إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ يَدُلُّ عَلٰى حُصُوْلِ التَّوَفِّيْ وَهُوَ جِنْسٌ تَحْتَهٗ اَنْوَاعٌ بَعْضُهَا بِالْمَوْتِ وَ بَعْضُهَا بِالْاِصْعَادِ إِلَى السَّمَآءِ فَلَمَّا قَالَ بَعْدَهٗ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ كَانَ هٰذَا تَعْيِيْنًا لِلنَّوْعِ وَلَمْ يَكُنْ تَكْرَارًا۔

"خدا تعالیٰ کا قول إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ صرف حصول توفی پر دلالت کرتا ہے۔ اور وہ جنس ہے۔ جس کے تحت کئی انواع ہیں۔ کوئی بالموت اور کوئی بالرفع الی السماء۔ پس جب خدائے تعالیٰ نے اس کے بعد وَرَافِعُكَ إِلَيَّ فرمادیا تو یہ نوع کی تعیین کے لئے ہوا نہ کہ تکرار۔"[1]

اسی طرح تفسیر بیضاوی وسراج منیر میں بذیل آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ لکھا ہے:-

---

[1] اکمل صاحب نے تفسیر کبیر کے اس حوالہ پر بہت غضب ڈھایا ہے کہ امام رازیؒ کی شان میں حقارت آمیز طریق بیان اختیار کیا ہے۔ افسوس اکمل صاحب نے یہ کتاب مرزا صاحب آنجہانی کی وفات کے بعد لکھی اگر وہ ان کی زندگی میں لکھتے تو ہم امام رازیؒ کی کسی کتاب کا کوئی ورق جناب مرزا صاحب کے سامنے رکھ کر کہتے کہ جناب اسے حل کیجئے۔ پھر اگر وہ اپنے مددگاروں سمیت اسے حل فرمادیتے تو جانتے۔ اگرچہ امام رازیؒ کی تصنیف کا امتحان کے لئے بھی مرزا صاحب کے سامنے پیش کرنا امام رازیؒ کی تصانیف کی بےقدری ہے۔ سبحان اللہ! کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں!!۔ ۱۲ سعادت منہ

تَوَفَّیْتَنِیْ بِالرَّفْعِ اِلَی السَّمَآءِ لِقَوْلِہٖ تعالیٰ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَالتَّوَفِّیْ اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا وَّالْمَوْتُ نَوْعٌ مِنْہُ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا (بیضاوی و السراج المنیر)

فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کے معنی یہ ہیں کہ خدایا جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھا لیا بدلیل اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کیونکہ توفی کے معنی ہیں کسی شی کو پورا پورا لے لینا اور موت اس کی ایک نوع ہے۔ چنانچہ خدا تو نے فرمایا اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ الآیۃ (زمر: پ۲۴) (۴۲:۳۹)

حاصل مطلب یہ کہ لفظ توفی بحسب الوضع موت کے لئے موضوع نہیں ہے۔ صرف اس کا استعمال اس نسبت سے جو جنس اور نوع میں ہوا کرتی ہے بمعنی موت ہے اور بس۔ اور چونکہ تعیین نوع کے لئے حاجت قرینہ کی پڑا کرتی ہے۔ لہٰذا سلسلۂ عبارت میں قرائن حالیہ و مقالیہ پر نظر کریں گے۔ جیسے کہ عَیْنٌ کہ یہ موضوع ہے۔ معانی متعددہ مثل زر۔ چشم۔ زانو اور چشمۂ آب کے لئے (بالاوضاع المختلفہ) تو اب ہر جگہ اس کا ایک ہی معنی نہ ہوگا۔ اور نہ ایک جگہ سارے معنی مراد ہوں گے بلکہ حسب حال مضمون عبارت و الفاظ عبارت جس معنی کو اس جگہ مناسبت ہوگی وہ اس جگہ معین ہو جائے گا۔ چنانچہ آیت فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا میں عین کے معنی چشمۂ آب ہیں۔ کیونکہ اس جگہ استسقاء یعنی طلب آب اور انفجار یعنی پانی کا پھوٹ پڑنا اور مشرب یعنی پانی کے گھاٹ کا ذکر ہے۔ ان قرائن حالیہ و مقالیہ نے اسے اس جگہ چشمۂ آب کے معنوں میں کر دیا اور آیت فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ میں قرینہ حمۃ نے اس سے چشمۂ آب مراد ہونے پر دلالت کی اور آیت اَمْ لَہُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِہَا وَ اَمْثَالِہَا میں قرینہ بصارت نے جارحہ[1] یعنی آنکھ پر دلالت کی۔ اسی طرح جنس کو اس کی کسی نوع میں معین کرنے کے لئے حاجت قرینہ کی ہوتی ہے۔ ورنہ

[1] بمعنی عضو۔ عبدالقیوم مہر

مضمون ومفہوم میں خلل پڑتا ہے۔ پس چونکہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کو رَافِعُکَ اِلَیَّ کے ساتھ ضم کیا۔ اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کی توفی بِالرَّفْعِ اِلَی السَّمَآءِ ہوئی۔ مزید تفصیل لفظ توفی کی اس وقت کی جائے گی۔ جب آیاتِ قرآنیہ جن میں لفظ توفی کے مشتقات آئے ہیں۔ ان کا ایک نقشہ کھینچ کر ہر ایک کے ساتھ اس کے قرینۂ صارفہ کا ذکر کیا جائے گا۔ اور عنقریب آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کسی لفظ کے کسی معنی میں زیادہ مستعمل ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ ان معنوں سے مخصوص ہو گیا ہے۔ اور اس کے دیگر معانی واطلاقات متروک ومہجور ہو گئے ہیں۔

مثلاً قاموس میں دابہ کی نسبت لکھا ہے کہ

وَالدَّآبَّةُ مَا دَبَّ مِنَ الْحَیَوَانِ وَغَلَبَ عَلٰی مَا یُرْکَبُ.

دابہ اصل میں ہر جاندار چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے۔ اور غالب استعمال اس کا سواری والے جانوروں پر ہوتا ہے۔ تو قاموس کے لکھنے سے آیت:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (پ۱۲:ہود)

یعنے ''زمین میں کوئی جانور نہیں جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو۔'' (۱۱:۶)

اس کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ صرف سواری کے جانوروں کا رازق ہے۔ بلکہ یہ لفظ اپنے اصلی وسیع معنوں میں لیا جائے گا کہ جو چیز زمین پر حرکت کرنے والی ہے۔ ان سب کا رزق حسب وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اسی طرح اگر کتب لغت میں توفی کا استعمال بمعنی موت لکھا ہوا ہے۔ تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ انہی معنوں کے لئے موضوع ہے۔ یا انہی معنوں میں محصور ہے۔ بلکہ کتب لغت میں ہر قسم کے معانی وضعی۔ مجازی اور منقولی خواہ منقول شرعی ہوں۔ خواہ عرفی خواہ اصطلاحی سب لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی خاص مقام پر معانی مخصوصہ کا چسپاں ہونا سلسلۂ عبارت اور قرائن حالیہ ومقالیہ پر موقوف ہے

اور یہ ضروری نہیں کہ جملہ قرائن کتب لغت میں مصرح ہوں۔ کیونکہ قرائن محصور نہیں ہو سکتے بلکہ حسب مقام سلسلہ عبارت و مفہوم کلام میں قرائن مختلف ہوتے ہیں۔

چنانچہ حصول المامول جو امام شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول کا اختصار ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

وَلَا يُشْتَرَطُ النَّقْلُ فِيْ اٰحَادِ الْمَجَازِ بَلِ الْعَلَاقَةُ كَافِيَةٌ وَالْمُعْتَبَرُ نَوْعُهَا وَاِلَيْهِ ذَهَبَ الْجُمْهُوْرُ وَهُوَ الْحَقُّ وَلَمْ يَاْتِ مَنِ اشْتَرَطَ ذَالِكَ بِحُجَّةٍ يَصْلُحُ لِذِكْرِهَا وَ تَسْتَدْعِي التَّعَرُّضَ لِدَفْعِهَا وَكُلُّ مَنْ لَهُ عِلْمٌ وَفَهْمٌ يَعْلَمُ اَنَّ اَهْلَ الْعَرَبِيَّةِ مَازَالُوْا يَخْتَرِعُوْنَ الْمَجَازَاتِ عِنْدَ وُجُوْدِ الْعَلَاقَةِ وَنَصْبِ الْقَرِيْنَةِ وَهٰكَذَا مَنْ جَآءَ بَعْدَهُمْ مِنْ اَهْلِ الْبَلَاغَةِ فِيْ فَنَّيِ النَّظْمِ وَالنَّثْرِ وَ يَتَمَا دَحُوْنَ بِاِخْتِرَاعِ الشَّيْءِ الْغَرِيْبِ مِنَ الْمَجَازَاتِ عِنْدَ وُجُوْدِ الْمُصَحِّحِ لِلتَّجَوُّزِ انتهى.

"اور مجاز کے افراد میں (اہل لغت سے) نقل ضروری نہیں۔ بلکہ صرف علاقہ کافی ہے۔ اور (زیادہ تر) اس کی نوع کا اعتبار ہے۔ اور جمہور حکما کا یہی مذہب ہے اور یہی حق ہے۔ اور جس نے اس کے (نقل کو) ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے ایسی حجت کوئی بھی پیش نہیں کی۔ جو ذکر اور پھر اس کی تردید کے لائق ہو یعنی بالکل قابل التفات نہیں اور جو شخص علم اور فہم رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اہل عربیت ہمیشہ علاقہ کے پائے جانے پر مجازات اور قرائن کا مقرر کرنا اختراع کرتے رہے ہیں۔ اور اسی طرح نظم اور نثر کے علمائے بلاغت جو ان سے بعد ہوتے آئے ہیں (وہ بھی اس بارہ میں اختراعات کرتے رہے ہیں) اور صحت مجاز کے قرینہ کے وقت کسی نادر مجاز کے اختراع کے سبب ایک دوسرے پر فخر کرتے رہے ہیں"۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ جس جگہ توفی کے ساتھ موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہو۔ اس جگہ توفی کی تعیین نوع موت میں ہو گی۔ اور جہاں نیند اور اس کے مقتضیات موجود ہوں گے۔ وہاں اس کی تعیین نوع نوم میں ہو گی اور جس مقام پر قرینہ رفع مذکور ہو۔ اس جگہ یہ لفظ نوع رفع میں متعین ہو گا۔ جیسا کہ عنقریب نقشہ آیات توفی سے ظاہر ہو گا۔ ان شاء اللہ غرض کتب لغت میں توفی بمعنی موت لکھا ہونے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ لفظ موت کے لئے موضوع ہے۔ کیونکہ علم تصریف اس کا برملا انکار کر رہا ہے اور نہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ اپنے اصلی معنوں سے ہٹ کر بمعنی موت مخصوص ہو گیا ہے۔ کیونکہ اہل لغت کا اس کو مجاز لکھنا اس کی صریح تردید کر رہا ہے۔ چنانچہ تاج العروس شرح قاموس میں ہے:۔

وَمِنَ الْمَجَازِ اَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ اَيِ الْمَوْتُ وَالْمَنِيَّةُ وَ تُوُفِّيَ فُلَانٌ اِذَا مَاتَ وَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِذَا قَبَضَ رُوْحَهُ (سیف)

''اور مجاز میں سے ایک یہ ہے۔ اَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ یعنی اسے موت نے پا لیا یا پکڑ لیا اور تُوُفِّيَ فُلَانٌ وہ پورا ہو گیا کے معنی ہیں وہ مر گیا تو تَوَفَّاهُ اللّٰهُ (خدا نے اسے پورا کر لیا) کے معنی ہیں خدا نے اس کی روح قبض کر لی۔''

اور اسی طرح اساس البلاغۃ زمخشری میں لکھا ہے:۔

ومن المجاز تُوُفِّيَ فُلَانٌ وَ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ وَاَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ.

''تُوُفِّيَ فُلَانٌ اور تَوَفَّاهُ اللّٰهُ اور اَدْرَكَتْهُ الْوَفَاةُ سب مجازی ہیں''[1]

اور مجاز بولنا تب ہی درست ہے۔ جب حقیقی معنی متروک نہ ہوں چنانچہ قطبی میں بعد تقسیم لفظ باعتبار معانی جو اوپر گزر چکی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ:۔

---

[1] اکمل صاحب بھی عجب کمال کے پتلے ہیں کہ باوجود ائمہ لغت کی تصریح کے کہ توفی بمعنی موت مجاز آیا ہے الزاماً لکھتے ہیں:۔ ''موت کے معنی کو مجاز کہنا آپ کی ہی ایجاد ہے (ص ۲۰) کیا تاج العروس اور اساس البلاغۃ بھی میری تصانیف ہیں؟'' سعادت'' منہ

وَاِنْ لَّمْ يُتْرَكِ الْاَوَّلُ بَلْ يُسْتَعْمَلُ فِيْهِ اَيْضًا سُمِّيَ حَقِيْقَةً اِنِ اسْتُعْمِلَ فِي الْاَوَّلِ وَهُوَ الْمَنْقُوْلُ عَنْهُ وَ مَجَازٌ اِنِ اسْتُعْمِلَ فِي الثَّانِيْ وَهُوَ الْمَنْقُوْلُ اِلَيْهِ. (قطبی ص ۲۴ مطبع رحیمیہ دیوبند)

''اگر معنی اوّل متروک نہ ہوں بلکہ اس میں بھی اس لفظ کا استعمال ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔ جب پہلے معنوں میں مستعمل ہو اور وہ اس کا معنی منقول عنہ (جس سے نقل کر کے مجازی معنی لئے گئے ہیں) ہے۔ اور اگر دوسرے معنوں میں مستعمل ہو تو اسے مجاز کہتے۔ اور وہ معنی منقول الیہ ہے (نقل کر کے جو معنی مراد لئے گئے ہیں)''

آئمہ لغت کے توفی کو مجازاً بمعنی موت لکھنے سے صاف ثابت ہو گیا کہ توفی کے اپنے وضعی معنی اَخْذُ الشَّيْءِ وَافِيًا متروک نہ ہوں گے۔ آسان طریق جو جلدی راہ راست پر لا دے وہ یہ ہے کہ توفی کو کتب لغت سے تلاش کرو۔ اگر یہ لفظ وفا کے ضمن میں مذکور ہو تو اسے وفا سے ماخوذ سمجھو۔ ورنہ نہیں اور پھر جملہ تعریفات وفا پر نظر کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس کے معنی پورا کرنے کے'' ہیں۔ اور جو معنی مجازی ہوں گے۔ وہ باعتبار اس علاقہ کے ہوں گے۔ جو حقیقت اور مجاز میں ضروری ہے۔ چنانچہ حصول المامول میں ہے:-

لَابُدَّ مِنَ الْعِلَاقَةِ فِيْ كُلِّ مَجَازٍ فِيْ مَا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْحَقِيْقَةِ وَ الْعِلَاقَةُ هِيَ اتِّصَالُ الْمَعْنَى الْمُسْتَعْمَلِ فِيْهِ بِالْمَوْضُوْعِ لَهٗ.

(حصول ص ۳۰ مصری)

''ہر مجاز میں اس علاقہ کا ہونا ضروری ہے۔ جو اس میں اور حقیقت میں ہوتا ہے۔ اور علاقہ اس اتصال (معنوی) کو کہتے ہیں جو معنی مستعمل فیہ (مجازی) اور معنی موضوع لہ (حقیقی) میں ہوتا ہے۔''

اور چونکہ علاقات اور اتصالات معنی مستعمل فیہ اور موضوع لہ میں حسب اقتضائے مقام مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی تقریر کتب لغت میں ضروری

نہیں۔ چنانچہ حصول المامول ...... میں گزر چکا ہے کہ علاقات مقتضیہ مجاز کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی کتاب میں مذکور ہوں بلکہ وہ علاقہ جس سے معنی مستعمل فیہ و موضوع لہ میں نسبت پیدا ہو سکے کافی ہے۔ پس کتب لغت میں سے وضعی اور منقول اور مجازی معنی میں تمیز کرنے کے لئے ان قواعد و بلاغت میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ فافہم۔

پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ توفی کے معنی اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا ہیں اور یہ بھی محقق ہو چکا ہے کہ توفی جنس ہے۔ اور رفع اور موت اور نیند اس کی انواع ہیں۔ اور یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ تعیین نوع کے لئے وجود قرینہ یا تعذر حقیقت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے مرادِ متکلم (کہ ان معانی و انواع میں سے کون سی نوع اس کی مراد ہے) معین نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا قرآن شریف کی وہ سب آیات جن میں مشتقات توفی (باب تفعل) وارد ہوئے ہیں لکھ کر ناظرین کے پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی قرائن صارفہ پر بھی اشارات کرتے جاتے ہیں۔

نقشہ آیات توفی مع بیان قرینہ

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
۱	(۱) وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا. (بقرپ۲_۲:۲۳۴)	تم میں سے جو قبض کئے جاتے ہیں۔ اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں (دوسرے نکاح کے لئے) چار مہینے اور دس دن رات انتظار کریں۔	ان ہر دو آیات میں عورتیں بیوہ چھوڑنا اور عدت حالتِ بیوگی اور وصیتِ توفی سے موت مراد لینے کے قرینے ہیں۔

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
۲	(۲) وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ. (بقرہ پ۲۔۲:۲۴۱)	تم میں سے جو لوگ قبض کئے جاتے ہیں۔ یعنی مر جاتے ہیں اور (پیچھے) بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی بیویوں کے لئے ایک سال کے گزارے اور سکونت کی وصیت کر جائیں۔	
۳	(۱) حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ (نساء پ۴)	حتی کہ قبض کرے ان کو موت (۴:۱۵)	نمبر ۳ سے ۵ تک ان تو آیات میں توفی سے
۴	(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ. (نساء پ۵) (۴:۹۷)	جن کو فرشتے قبض کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ (فرشتے) ان (کفار) کی جانوں پر سختی کرتے ہیں۔	موت مراد لینے کے لئے ملائکہ موت اور جان کندن کے وقت کفار کو عذاب کرنا اور مومنوں کو سلام اور
۵	(۳) حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا. (انعام پ۷) (۶:۶۱)	حتی کہ جب تم میں سے ایک کی موت آجاتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کو قبض کر لیتے ہیں۔	بشارت جنت سنانا صاف اور صریح قرینے ہیں۔ احادیث میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
۶	(۴) حَتّٰى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ (پ۸: اعراف) (۳۷:۷)	حتیٰ کہ جب ان کے پاس ہمارے فرشتے آ جاتے ہیں۔ تو ان کو قبض کر لیتے ہیں۔	
۷	(۵) وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (انفال پ۱۰)	کاش تو دیکھے جب قبض کرتے ہیں فرشتے کفار کو مارتے ہیں ان کے چہروں پر اور پشتوں پر۔ (۸:۵۰)	
۸	(۶) فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ. (محمد پ۲۶)	پس کس طرح ہو گا جب قبض کریں گے۔ ان کو فرشتے مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پشتوں پر۔	
۹	(۷) اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (پ۱۴ نحل) (۱۶:۲۸)	جن کو قبض کرتے ہیں۔ فرشتے ظلم کرتے ہوئے ان کی جانوں پر۔	
۱۰	(۸) اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ	جن کو قبض کرتے	

نمبر	آیت	ترجمہ	کیفیت
	الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ. (پ۱۴ نحل)	ہیں فرشتے خوشحالی میں۔ (۳۲:۱۶)	
۱۱	(۹) قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ. (الم سجدہ پ۲۱) (۱۱:۳۲)	اے پیغمبرؐ! ان سے کہو تم کو قبض کرے گا ملک الموت جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔	
۱۲	(۱) وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ. (یونس پ۱۱)(۴۶:۱۰)	اگر ہم تجھ کو اپنے وعدے کے ایک حصہ کی باتیں دکھا دیں۔ یا تجھ کو قبض کر لیں۔	ان تین آیات میں توفی بمقابلہ نُرِيَنَّكَ آئی ہے۔ جو معنی موت کے لئے قوی قرینہ ہے۔ کیونکہ کہ وعدہ نُرِيَنَّكَ زندگی چاہتا ہے۔ پس نَتَوَفَّيَنَّكَ ضرور اس کی ضد یعنی موت ہونا چاہئے۔ دیگر یہ کہ مضمون میں سورت زخرف پ۲۵ (۴۳: ۴۲) میں نَتَوَفَّيَنَّكَ کی بجائے نَذْهَبَنَّ بِكَ وارد
۱۳	(۲) وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (رعد پ۱۳)	(۴۰:۱۳)	
۱۴	(۳) فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ (مومن پ۲۴) (۷۷:۴۰)		

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
			ہے جو کنایہ ہے فنا سے۔
۱۵	(۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَىْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا. (نحل پ۱۴) (۱۶:۷۰)	خدا نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو قبض کرے گا اور بعض تم میں سے اس لئے ارزل عمر تک پہنچائے جاتے ہیں کہ بعد جاننے کے کچھ بھی نہ جانیں۔	ان آیات میں جس جس موقع پر لفظ توفی وارد ہوا ہے۔ سورت مومنون پ ۱۸ ع۱ میں اس موقعہ پر لفظ میتون (۲۳: ۱۵) وارد ہوا ہے۔ پس
۱۶	يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ	اے لوگو! اگر تم (دوبارہ) جی اٹھنے سے شک میں ہو۔تو (خیال کرو کہ) ہم نے (پہلے) تو تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے خون سے پھر پورے بنے ہوئے اور نہ بنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے سے۔ تاکہ تم کو بتائیں اور	صاف معلوم ہو گیا کہ یہ آیت توفی کی تفسیر موت سے کرتی ہے۔ علاوہ بریں یہ کہ قبل پیدائش سے موت تک جس قدر مختلف قدرتی استحالات انسان پر وارد ہوتے ہیں۔ ان آیات میں ان سب کا بالتفصیل ذکر ہے۔ مثلاً پہلے مٹی پھر نطفہ پھر علقہ پھر

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
	لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا. (حج پ ۱۷۔۲۲:۵)	ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ ہم رحموں میں جو چاہیں۔ مدت مقرر تک پھر تم کو بچے کی صورت میں باہر نکالتے ہیں۔ پھر (تم کو زندہ رکھتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور بعض تم میں سے (پہلے) قبض کیے جاتے ہیں۔ اور بعض ارذل عمر تک پہنچائے جاتے ہیں۔ تا کہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہ جانیں۔	مضغہ (گوشت کا ٹکڑا) پھر ہڈی پر گوشت پھر مدت حمل تک رحم میں رہنا' پھر طفل ہو کر پیدا ہونا۔ پھر بڑھنا پھر جوان ہونا۔ پھر بوڑھا ہونا۔ پھر اجل مقرر تک پہنچ کر مرنا۔ یہ سب حالتیں اس بات کے قرائن ہیں کہ ان مقامات پر توفی سے مراد موت ہے۔ کیونکہ موت بھی ایک حالت ہے۔ پچھلی آیت (سورۂ مومن پ۲۴) میں ایک اور نکتہ ہے کہ چونکہ جملہ معللہ لتبلغوا اشدکم کا عطف خبریہ یخرجکم پر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
۱۷	هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَ مِنكُم مَّن يُتَوَفَّى مِن قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى. (مومن پ۲۴) (۴۰:۶۷)	پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے خون سے پھر تم کو بچے کی صورت میں نکالتا ہے پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ پھر تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ۔ اور بعض تم میں سے (پہلے) ہی قبض کر لئے جاتے ہیں۔ اور تا کہ تم (اپنی) اجل مقررہ کو پہنچو۔	لا محالہ يُتَوَفِّيكُمْ مقدر نکالنا پڑے گا (جامع البیان زیر آیت ہذا) لہٰذا بقا کے مقابلے میں جو توفی ہو گی۔ ضرور اس سے مراد فنا یعنی موت ہو گی۔
۱۸	رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ○ (آل عمران پ۴) (۳:۱۹۳)	خداوندا! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیاں دور کر دے۔ اور ہم کو نیکوں کے ساتھ قبض کرنا۔	ان آیات میں قرینہ صارفہ موجود ہے۔ اور وہ دعائے لحوق بالصالحین والابرار ہے کیونکہ یہ الفاظ
۱۹	رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ. (اعراف پ۹) (۷:۱۲۶)	خداوندا! ہم پر فضل انڈیل دے اور قبض کرنا ہم کو مسلمان کر کے	کنایہ ہیں موت سے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اَوْلٰكِنْ

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
۲۰	(۲) اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ. (یوسف پ۱۳ ۱۲:۱۰۱)	تو ہی میرا مددگار ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ قبض کرنا مجھے مسلمان کر کے اور ملانا مجھے صالحین سے۔	لَحُوْقًا بِيْ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا۔ اور نیز صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرض الموت میں مع الذین انعم اللہ علیہم الآیہ پڑھا اور نیز اللھم ا غفرلی وارحمنی والحقنی بالرفیق اور نیز آخر کلمہ آپؐ کا اللھم الرفیق الاعلی تھا۔ ان سب احادیث سے ثابت ہوا۔ کہ دعائے لحوق بالصالحین والابرار والرفیق الاعلیٰ سے موت بخاتمۂ حسنہ مراد ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ آیات بھی قرینہ سے خالی نہیں۔
۲۱	(۱) وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى. (انعام پ۷)	خدا وہ ذات ہے جو تم کو رات کو قبض کرتا ہے۔ اور جانتا ہے جو تم دن کو کرتے ہو۔ پھر تم کو دن کے وقت اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ تاکہ زندگی	ان آیتوں میں بھی قرائن موجود ہیں۔ پہلی آیت میں توفی سے مراد نیند ہے کیونکہ قرینہ لیل (رات) موجود ہے اور پھر ساتھ ہی پھر دن کو اٹھ کھڑے ہونے اور کام کاج کرنے کا ذکر ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مراد اس توفی سے جو رات کے وقت ہو اور پھر اس کے بعد دن کو کھڑے ہوں'

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
	(۶:۶۰)	کی مدت مقرر پوری کی جائے۔	نیند ہے۔اسی طرح دوسری آیت میں پہلے موقع پر توفی سے مراد
۲۲	(۲) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى. (زمر پ۲۴) (۳۹:۴۲)	خدا ہی قبض کرتا ہے جانوں کو موت (روح اور جسم کی مفارقت) کے وقت اور جو ابھی نہیں مریں ان کو (قبض کرتا ہے) ان کی نیند میں) پس جس پر موت (کا حکم) جاری کیا ہے۔اس کو تو بند رکھتا ہے۔ اور دوسری (نیند والی) کو مدت مقرر (موت) تک بھیجتا رہتا ہے۔	موت ہے بقرینہ حین موتھا دوسرے موقع پر جو بقاعدۂ عطف محذوف ہے اس سے مراد نیند ہے بقرینہ منامھا اس پچھلی آیت میں ایک اور نکتہ ہے۔کہ جس نفس کی توفی بالموت ہوتی ہے۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ فرمایا۔جس سے معلوم ہوا کہ توفی کے وضعی معنی صرف اخذ الشیء وافیا ہیں۔کیونکہ امساک سے مراد ابقاء ہے۔اسی حالت ماخوذہ پر نہ تجدد۔ اور اسی لئے لفظا بالموت کی تصریح ضروری ہوئی۔ اس آیت کی دوسری شق میں جہاں توفی سے مراد نیند ہے۔ علاوہ قرینہ فی منامھا کے يُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى قرینہ ہے۔توفی سے نیند مراد لینے ہے۔

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
			کیونکہ اس کے معنی وہی ہیں جو پہلی آیت سورت انعام میں ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضٰى أَجَلٌ مُّسَمًّى کے ہیں۔ غرض ان آیات میں حسب قرائن لیل و منام و بعثہ فی النہار (دن کو اٹھا کھڑا ہونا) توفی سے مراد نیند ہے اور یہ توفی کی دوسری نوع ہے۔ گذشتہ آیات میں توفی کی ایک نوع موت آئی تھی بقرائن موجب معنی موت اور اس جگہ بقرائن موجبہ معنی نیند توفی کی دوسری نوع نیند ثابت ہوئی کیا اب بھی توفی کے جنس اور موت اور نیند کے انواع ہونے میں شک باقی رہا ہے۔

لے تنبیہ:۔ واضح ہو کہ نیند کے موقع پر قبض روح کا لفظ بولنے سے کسی کو یہ دھوکا نہ لگ جائے۔ کہ نیند موت ہوتی ہے نفی کے لئے اسی آیت سورہ زمر میں والتی لم تمت موجود ہے مرزا صاحب قادیانی نے اس آیت میں لفظ لم تمت چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ کسی کو یہ خبر نہ ہو جائے کہ سوئے ہوئے کا حکم لم تمت ہے یعنی یہ کہ وہ مردہ نہیں اور حدیث شریف میں جو احیانا بعد ما اماتنا آیا ہے۔ وہ اس آیت کے معارض نہیں۔ کیونکہ قرآن شریف میں نفی حقیقت موت کی گئی ہے اور حدیث میں نیند کو

موت مجازاً کہا گیا ہے۔ بموجب اس تحقیق کے جو ہم نے ذکر کی نہ مطابق زعم مرزا صاحب قادیانی کے۔

اور اہلِ علم پر روشن ہے کہ حقیقت و مجاز کی رو سے نفی و اثبات کا فرق ہو تو ان میں تعارض و تناقض نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر دو میں ذوات مختلف ہیں۔

نمبر	آیت	ترجمہ	بیانِ قرینہ
٢٣	(٢) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (یونس پ١١) (١٠:١٠٤)	(اے پیغمبر!) کہو اے لوگو! اگر تم میرے دین سے شک میں ہو۔ تو (سن رکھو کہ) میں تو ان کو جن کو تم پوجتے ہو کبھی نہیں پوجوں گا۔ ہاں میں تو صرف اللہ کی عبادت کروں گا جو تم کو قبض کرتا ہے۔ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ ایمانداروں میں سے ہوں۔	مراد اس آیت سے یہ ہے کہ میں تو اپنا معبود صرف اس ذاتِ برحق کو بناتا ہوں۔ جس کے قبضہ و اختیار میں تمہارا ایجاد و ابقا اور اعدام و افنا اور ارجاع ہے جیسا کہ آیت كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (٢:٢٨) و امثالہا سے ظاہر ہے اور صرف اعدام و افنا کے ذکر پر اکتفا کی یہ وجہ ہے کہ علومِ عقلیہ میں ثابت شدہ ہے کہ ذکرِ احد الضدین کا استلزاما ضد آخر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے نور کہ اس کے ذکر سے اس کی ضد ظلمت کا بھی تصور حاصل ہوتا ہے اور اسی طرح سواد سے بیاض۔ پس اسی طرح ذکر اعدام استلزاما ایجاد کا

بیان قرینہ	ترجمہ	آیت	نمبر
بھی مشعر ہے۔ قرآن شریف میں اس کی نظائر بہت ہیں۔ دیکھو تفسیر کبیر و کشاف و ابی السعود تحت آیت سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ کہ بجر دگرمی کے ذکر سے اس کی ضد سردی بھی معلوم ہو سکتی ہے اور نیز فتح الباری شرح صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ میں تحت ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ مسطور ہے۔ کہ اس سے اَلَّذِيْنَ ظَلُّوْا پر بھی دلالت ہو سکتی ہے۔ پس ثانی کو استغناء حذف کیا۔ لِاَنَّ ذِكْرَا اَحَدِ الضِّدَّيْنِ تَنْبِيْهٌ عَلَى الضِّدِّ الْاٰخِرِ. نیز اس لئے کہ تحقیق افناء و اعدام بغیر تحقیق ایجاد کے متصور نہیں ہو سکتا۔ پس جو توفی بمقابلہ ایجاد مذکور ہو لا بد اس سے مراد اعدام ہو گی وَهُوَ الْمَوْتُ اور باوجود ہر شے کے قبضۂ قدرت باری عزاسمہٗ میں ہونے کے جیسا کہ فَسُبْحَانَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ سے ثابت			

بیان قرینہ	ترجمہ	آیت	نمبر
ہے۔ صرف مخاطبین یعنی کفار ہی کو متعلق توفی گردانے میں تہدید کفار ملحوظ ہے۔ جیسا کہ سباق سے ظاہر ہے۔ اور یہی امر موید ہے تخصیص ذکر توفی کا دُوْنَ ذِكْرِ نِعْمَةِ الْاِيْجَادِ لِاَنَّ الْمَقَامَ مَقَامُ تَخْوِيْفٍ وَّ تَهْدِيْدٍ یعنی ایجاد و خلق کی نعمت کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ یہ مقام تخویف وتہدید کا ہے۔ اور اصل بلاغت یہی ہے کہ مقتضائے حال کا لحاظ کیا جائے۔ اور نیز چونکہ اس آیت فَمَا نَحْنُ فِيْهَا سے پہلے اہلاک کفار اور انجاء رسل اللہ و مومنین کا ذکر ہے۔ اس لئے مراد اس پارۂ آیت سے یہ ہوگی کہ میں اسی ایک معبود برحق کی پرستش کرتا ہوں جس نے مجھ سے تمہاری ہلاکت اور میرے بقا کا وعدہ کیا ہے۔ پس اس طریق سے بھی توفی بمقابلہ ابقا مذکور ہوئی۔ فَثَبَتَ الْقَرِيْنَةُ وَ انْدَفَعَتِ الرِّيْبَةُ. مضمون مذکور			

نمبر	آیت	ترجمہ	بیان قرینہ
			تفاسیر معتبرہ مثل تفسیر کبیر۔ ابن کثیر۔ فتح البیان۔ ابی السعود۔ رحمانی۔ کشاف وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ فتامک و لاتعجل۔
۴۴	(۲) یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا. (آل عمران پ۳ ع۶)	اے عیسیٰ! میں ہوں تیرا بھر لینے والا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لینے والا اور کافروں سے تجھے پاک رکھنے والا۔ (۳:۵۴)	ان ہر دو آیات میں توفی سے مراد رفع جسمی ہے۔ بقرینہ صریحہ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (اٹھا لینے والا ہوں تجھ کو اپنی طرف) اور آیت وَالیه بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (پ۶ نساء) (بلکہ اٹھا لیا خدا نے اس کو طرف اپنی) (۴: ۱۵۸) اور بموجب حدیث نزول کے بتصریح مِنَ السَّمَآءِ (کتاب الاسماء و الصفات للبیہقیؒ و نیز کنز العمال) کما سیجیء ذکر ذلک مستوفی انشاء اللہ تعالی۔

بس اب قرآن شریف کی جملہ آیات توفی کا پورا بیان ہو چکا۔ اور ایک نیک باطن' پاک طینت' صاحب بصیرت کے لئے کوئی گنجائش انکار باقی نہ رہی۔ اور مرزا صاحب قادیانی کے طعن کا جواب جس میں انہوں نے اپنے ازالہ میں ۳۲۵ میں کل علمائے سلف و خلف کو ملحد و محرف قرار دیا ہے کافی طور پر ہو چکا کہ دیگر مواقع پر توفی سے موت اور نیند مراد لینے کی یہ وجوہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے بارے میں توفی سے رفع مراد لینے کی یہ وجہ ہے۔ لہٰذا مرزا صاحب قادیانی کو کوئی حق نہیں کہ ناحق علمائے اسلام کی شان میں بدزبانی کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرے [1]

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنۂ پاکاں کند

اگر کوئی لفظ کئی معنوں میں اطلاق پذیر ہے۔ خواہ وہ معنی حقیقی ہوں خواہ منقولی یا قسامحا تو قرآن شریف میں اس کے مواضع کثیرہ میں ایک ہی معنی میں مستعمل ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ دیگر مواضع میں بھی اس کے یہی معنی لگیں گے۔ کیونکہ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ سارے قرآن شریف میں کسی لفظ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور صرف ایک جگہ پر اس لفظ کے اور معنی ہیں۔ یہاں صرف پانچ مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ زیادہ تحقیقات کے لئے تفسیر اتقان کو ملاحظہ فرما دیں۔

اوّل:- لفظ اَصْحَابُ النَّارِ (قرآن مجید میں جس جگہ آیا ہے اس کے معنی دوزخ میں جلنے والے کفار و فساق ہیں۔ سوائے سورت مدثر کے کہ اس میں اس کے معنی وہ فرشتے ہیں جو دوزخ پر مقرر ہیں۔

دوم:- بعل کے معنی سورہ بقرہ اور نساء میں شوہر ہیں اور سورہ صافات میں نام ہے اس بت کا جسے وہ قوم پوجتی تھی۔ جن کی طرف حضرت الیاسؑ بھیجے گئے تھے۔

سوم:- عود اور عادۃ کے معنی سارے قرآن شریف میں تکرار فعل کے ہیں۔ بجز آیت وَالَّذِيْنَ يُظَاهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (پ ۲۸ مجادلہ) (۵۸:۳) کے کہ اس میں توبہ اور پشیمانی مراد ہے۔

چہارم:- ریب کے معنی ہر جگہ شک ہیں۔ مگر آیت ریب المنون

[1] اب تو برزخ میں اس بدزبانی کا مزہ چکھ رہے ہوں گے۔ ۱۲ منہ

(پ ۲۷ الطور ۔۳۰:۵۲) میں حوادثِ زمانہ مراد ہے۔

پنجم:۔ بروج سے مراد ہر جگہ کواکب ہیں۔ مگر بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (پ ۵ نساء ۔۷۸:۴) میں اونچے اور محکم محل مراد ہیں۔

وَرَافِعُكَ اِلَیَّ

وَرَافِعُکَ اِلَیَّ

لفظ توفی کی نسبت کافی طور پر تحقیق ہو چکی اور علم تصریف اور کتب لغت اور تفاسیر معتبرہ سے بہ بسط محقق ہو چکا کہ لفظ تَوَفِّیْ اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا یعنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینے کے لئے موضوع ہے۔ اور موت اور نیند اور رفع اس کے انواع ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کسی ایک نوع کی تعیین کے لئے حاجت قرینہ کی ہوتی ہے۔ جب کہ نقشہ آیات توفی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ پس قولِ الٰہی یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ سے رفع جسد اِلَی السَّمَآءِ مراد لینے کے لئے پہلا قرینہ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ ہے۔ اور رَافِعُکَ اِلَیَّ سے رفعِ روح اور عزت کی موت مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ مرزا صاحب قادیانی کہتے ہیں۔ بلکہ مراد اس سے رفعِ جسم الی السمآء ہے لاغیر۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ صراح میں لکھا ہے رفع برداشتن وَهُوَ خِلَافُ الْوَضْعِ یعنی رفع کے معنی اوپر کے طرف اٹھانا ہیں۔ برخلاف لفظ وضع کے کہ اس کے معنی ''نیچے رکھنا'' ہیں۔ اسی طرح المصباح المنیر میں لکھا ہے۔ رَفَعْتُهٗ رَفْعًا خِلَافُ خَفَضْتُهٗ۔

لغت کی کسی کتاب میں رفع کے معنی ''عزت کی موت'' نہیں لکھے۔ اور نہ کسی محاورہ میں اس کا استعمال اس معنی میں پایا گیا ہے۔ یہ صرف مرزا صاحب کا تصرف فی اللغۃ ہے۔ جس طرح چاہتے ہیں قرآن و حدیث اور لغت کو اپنی مرضی کے تابع کر لیتے ہیں۔[1]

---

[1] اکمل صاحب قادیانی نے اس موقع پر عجیب کمال دکھایا ہے آپ رفع الی اللہ سے ''عزت کی موت'' مراد لینے کی وجہ میں فرماتے ہیں: اگر کہیں عزت کی موت (مرزا صاحب کو

اگر کہا جائے کہ جب رفع کا صلہ الی آتا ہے۔ تو یہ کنایہ ہوتا ہے اعزاز و اکرام سے۔ جیسا کہ محاورہ رَفَعْتُہٗ اِلَی السُّلْطَانِ صراح میں موجود ہے[1] تو اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ اس محاورے سے تمسک کرنے سے مرزا صاحب کو کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو رفع الی اللّٰہ سے ''عزت کی موت'' مراد لیتے ہیں۔ پس جب تک محاورہ رفعتہ الی السلطان میں بھی عزت کی موت مراد نہ ہو۔ تب تک اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں۔

ثانیاً یہ کہ محاورہ رفعتہٗ اِلَی السلطان کو رفعِ جسمی کے انکار میں پیش کرنا استعدادِ علمی سے عاری ہونے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ صراح کی پوری عبارت یوں ہے۔ ''ونزدیک گردانیدن کسے را بکسے صِلَتُہٗ بِاِلٰی وَمِنْ ذٰلِکَ قَوْلُھُمْ رَفَعْتُہٗ اِلَی السُّلْطَانِ۔ جب عبارت'' نزدیک گردانیدن کسے را بکسے۔'' موجود ہے تو اس سے ذی علم و فہم کو یہ وہم نہیں ہوسکتا۔ کہ اس جگہ رفع سے مراد صرف رفعتِ منزلت ہے۔ کیونکہ کسی کو کسی کے نزدیک کرنے میں قربِ جسمی ملحوظ ہوتا ہے۔ پس محاورہ رَفَعْتُہٗ اِلَی السُّلْطَانِ کے معنی یہ نہیں کہ اس شخص کو گھر بیٹھے بٹھائے عزت دلا دی بلکہ معنی تو یہ ہیں کہ میں اس کو بادشاہ کے حضور لے گیا۔ عزت اور ذلت سے اس میں کوئی بحث نہیں اگر وہ شخص منظورِ نظر شاہی ہے۔ تو حضورِ شاہی میں اس کی عزت ہوگی اور اگر کوئی مجرم ہے۔ تو موردِ عتابِ شاہی ہوگا۔ کیونکہ بادشاہ اور حاکم کی حضوری میں عزت و ذلت اپنی حیثیت اور استعداد کے لحاظ سے ہے۔ نہ

نے) لکھا ہے تو اس کی یہ وجہ ہے کہ توفی کے معنی موت اور رفع الی اللّٰہ سے مراد عزت دونوں ملا کر حاصل ''میں نے اس کو اوپر اٹھایا'' برخلاف میں نے اسے نیچے رکھا کیے۔ عبدالقیوم میر۔

مطلب عزت کی موت ہوا۔ ۱۲ (ص ۲۷) جواب سبحان اللّٰہ! دو اور دو چار روٹیاں اسی کو کہتے ہیں۔ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت توفی اور رفع الی اللّٰہ ہر دو مستقل بالمفہوم ہیں اور متفاوت ہیں۔ ایک کو دوسرے کا ضمیمہ بنا کر معجون مرکب نہیں بنا سکتے۔

[1] جیسا کہ مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی احمدی نے اپنے رسالہ القول الجمیل میں لکھا ہے۔ ۱۲ منہ

باعتبار بادشاہ کے قریب جانے کے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری جزء ۹ ص ۴۳۱ میں محاورہ رَفَعَهُ اِلَى الْحَاكِم کے معنی جو ہر طرح سے رَفَعْتُهُ اِلَى السُّلْطَانِ کا ہم پلہ ہے۔ اَحْضَرَهُ لِلشَّكْوىٰ یعنی شکایت کے لئے حاکم کے حضور میں لے جانا لکھے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ صراح کی عبارت کا مطلب عند ارادۃ الاعزاز یہ ہے کہ بر تقدیر ارادۂ معنی اعزاز و مرتبہ رفع کا صلہ الیٰ آنا چاہیے۔ نہ یہ کہ جس جگہ رفع کا صلہ الیٰ ہو۔ اس سے بغیر اعزاز و اکرام کے اور کچھ ارادہ ہی نہیں کر سکتے۔ تا کہ رفع جسمی ممنوع خیال کیا جائے اور مخالف کو کامیابی ہو۔ بلکہ اِلیٰ کے صلہ ہونے کے وقت نظر بر اصل واقعہ کہیں رفع جسمی اور اعزاز دونوں مجتمع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ رَفَعْتُهُ اِلَى السُّلْطَانِ میں جس صورت میں کہ متکلم نے مفعول کو اصالۃً یا وکالۃً بجسمہٖ لے جا کر سلطان کے ہاں معزز بنایا ہو اور ظاہر ہے کہ معنی وضعی اور معنی کنائی کا اجتماع ممتنع نہیں بخلاف حقیقی اور مجازی کے۔ كَمَا سيجيئى۔ (دیکھو صفحہ ۲۴۶ کتاب)

اور کسی جگہ صرف رفع جسمی بغیر ارادۂ اعزاز کے پایا جاتا ہے جیسا کہ امثلہ ذیل اس امر کی مشعر ہیں:-

المثال الاوّل:-

المصباح المنیر میں بذیل لفظ رفع لکھا ہے رَفَعْتُ الزَّرْعَ اِلَى الْبَيْدَرِ اور اس کے معنے صراح میں یوں کئے ہیں "برداشتم غلہ دروده و بخرمن گاه آوردم" یعنی "میں کھیت کو کاٹ کر اور غلہ اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آیا۔" ایسا ہی قاموس میں ہے:-

وَ الزَّرْعَ حَمَلْوُهُ بَعْدَ الْحِصَادِ اِلَى الْبَيْدَرِ۔

"رفعوا الزرع کے یہ معنی ہیں کہ کسان کھیت کاٹنے کے بعد اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آئے۔"

اسی طرح اساس البلاغۃ میں بھی ہے۔

المثال الثاني:۔

صحیح بخاری باب اِذَا وَکَّلَ رَجُلًا فَتَرَکَ الْوَکِیْلُ شَیْئًا میں حدیث وکالة ابی هریرة بحفظ زکوة رمضان میں الفاظ لَاَرْفَعَنَّکَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وسلّم وارد ہیں۔ اور فتح الباری شرح صحیح بخاری باب الوکالۃ جزء ۹ ص ۴۳۱ میں لَاَرْفَعَنَّکَ کے ذیل میں لکھا ہے آئے لَاَذْھَبَنَّ بِکَ اَشْکُوْکَ یُقَالُ رَفَعَہٗ اِلَی الْحَاکِمِ اِذَا اَحْضَرَہٗ لِلشَّکْوٰی یعنی ابو ہریرہؓ نے (شیطان لعین سارقِ غلہ صدقات کو کہا کہ) ''آج تو میں تجھے ضرور ضرور رسول اللہ ﷺ کی جناب میں تیری (بدعملی) کی شکایت کے لئے لے چلوں گا۔''

اور اسی طرح یہ محاورہ ہے۔ رَفَعَہٗ اِلَی الْحَاکِمِ یعنے وہ اس کو حاکم کے حضور میں اس کی (بدعملی کی) شکایت کے لئے لے گیا۔ اگر رفع کے معنی بوقت صلہ اِلٰی صرف اعزاز و اکرام ہوتے ہیں تو کیا معاذ اللہ حضرت ابو ہریرہؓ نے شیطان سارق (چور) کو عزت دلانی چاہی تھی؟ اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی جناب پاک میں؟ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔

المثال الثالث:۔

صحیح بخاری باب فَضْلِ الْکَھْفِ وَ نُزُوْلِ السَّکِیْنَۃِ و نیز مشکوٰۃ المصابیح ص ۱۷۶ حدیث قراۃ اسید بن حضیرؓ سورۃ الکھف میں رَفَعَ رَاْسَہٗ اِلَی السَّمَآءِ یعنی اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور نیز فَرَفَعْتُ رَاْسِیْ اِلَی السَّمَآءِ یعنی ''پس میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا۔'' وارد ہے۔ اس حدیث میں بھی دو دفعہ رفع کے ساتھ صلہ اِلٰی آیا ہے اور دونوں جگہ رفع جسمی مراد ہے بغیر ارادۂ رفع منزلت کے۔

شہادت القرآن

المثال الرابع:۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم ونیز مشکوٰۃ کتاب الجنائز' باب البکاء علی المیت ص ۱۴۲ میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی زینبؓ کے فرزند ارجمندؓ کے فوت ہونے کی حدیث میں فَرُفِعَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللّٰہِ علیہ وسلّم الصَّبِیُّ یعنی ''وہ لڑکا (رسول اللہ ﷺ کا نواسہ) آپؐ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ سبحان اللہ! رفع جسمی کے لئے کیا عمدہ مثال ہے۔ موت کا وقت بھی ہے اور پھر یہاں عزت کی موت مراد نہیں''

المثال الخامس:۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ فاطر میں فرمایا:۔

اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔ (فاطر پ۲۲)

''کلمہ طیب خدا ہی کی طرف چڑھتا ہے اور نیک عمل کو خدا بلند کرتا ہے۔'' (۳۵:۱۰)

تفسیر فتح البیان میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:۔

(اِلَیْہِ) تَعَالٰی لَآ اِلٰی غَیْرِہٖ (یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ) الصُّعُوْدُ ھُوَ الْحَرْکَۃُ اِلٰی فَوْقٍ وَھُوَ الْعُرُوْجُ ایضًا وَ مَوْضَعُ الثَّوَابِ فَوْقٌ وَ مَوْضَعُ الْعَذَابِ اَسْفَلُ وَ مَعْنٰی صُعُوْدِہٖ اِلَیْہِ قُبُوْلُہٗ لَہٗ اَوْ صُعُوْدُ الْکَتَبَۃِ مِنَ الْمَلَآئِکَۃِ بِمَا یَکْتُبُوْنَہٗ مِنَ الصُّحُفِ. انتہٰی

''کلمہ طیب صرف خدا ہی کی طرف چڑھتا ہے اور صعود اس حرکت کو کہتے ہیں۔ جو اوپر کی جانب ہو اور اسے عروج بھی کہتے ہیں۔ اور ثواب کی جگہ اوپر کو ہے اور عذاب کی جگہ نیچے کو ہے اور خدا کی طرف کلمہ کے صعود کے معنی ہیں۔ خدا کا اس کو قبول کر لینا۔ یا اس کے معنی ہیں۔ کراماً کاتبین فرشتوں کا ان صحیفوں کو لے کر چڑھنا جو وہ لکھتے ہیں۔''

فائدہ:-

صورت ثانیہ یعنی ملائکہ کا اعمال عباد کو کتابت میں لا کر صعود الی السماء کرنا حدیث شریف کے بالکل موافق ہے۔ جیسا کہ اسی تفسیر میں آگے بروایت ابن مسعودؓ ذکر کیا ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ الْمُسْلِمَ إِذَا قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَ تَبَارَكَ اللّٰهُ قَبَضَ عَلَيْهِنَّ مَلَكٌ فَضَمَّهُنَّ تَحْتَ جَنَاحِهٖ ثُمَّ يَصْعَدُ بِهِنَّ إِلَى السَّمَآءِ فَلَا يَمُرُّ بِهِنَّ عَلٰى جَمْعٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا اسْتَغْفَرَ لِقَائِلِهِنَّ حَتّٰى يُحَيَّ بِهِنَّ وَجْهُ الرَّحْمٰنِ ثُمَّ قَرَءَ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ الآية

یعنی "جس وقت کوئی مسلمان سبحان اللہ وبحمدہ الخ پڑھتا ہے۔ تو ایک فرشتہ (جو ان کلمات پر مؤکل ہوتا ہے) ان کلمات کو لے لیتا ہے۔ اور اپنے بازوؤں کے نیچے لگا کر آسمان پر لے چڑھتا ہے۔ پس فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے وہ گزرتا ہے۔ وہ سب اس کے قائل کے لئے دعائے استغفار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جناب پاک میں تحفۂ پیش کیے جاتے ہیں (عبداللہ بن مسعودؓ نے یہ حدیث سنا کر) پھر یہ آیت إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ پڑھی۔"

اور اسی طرح تفسیر ابن کثیر میں بھی اس آیت کے ذیل میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اور یہ معنی دیگر کئی احادیث سے بھی ثابت ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ میں کراماً کاتبین کی نسبت ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ (پھر وہ جو رات کو تم میں رہے خدا کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں) وارد ہے۔ نیز معلوم رہے کہ اس جگہ بھی عروج جو صعود کا مترادف ہے۔ اس کا صلہ الی آیا ہے۔ اور مراد عروج حقیقی ہے۔ نہ کنائی نہ مجازی۔

دیگر یہ کہ صُعُوْد إِلَى اللّٰهِ سے قبولیت مراد رکھنا بنا بر ارادہ معنی لازمی کے

ہے۔اور ممارسِ کتب فن پر ظاہر ہے کہ لازمی معنوں کے ساتھ حقیقی معنوں کا ارادہ جائز ہے۔جیسا کہ آگے بحث کنایہ میں مفصل طور پر مطول سے نقل کیا جائے گا ان شاء اللہ۔کیونکہ کلمات طیبات مکتوب ہو کر آسمان کی طرف مرفوع ہوتے اور جناب خدا میں قبول ہوتے ہیں۔فَافْهَمْ۔

المثال السادس:-

صحیح مسلم میں ہے:-

يُرْفَعُ اِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ (الحدیث)

رات کا عمل خدا کی طرف مرفوع ہو جاتا ہے۔پیشتر اس کے کہ دن کا عمل صادر ہو۔

اس میں بھی رفع کا صلہ الیٰ آیا ہے اور صورت صعودِ اعمال کی اوپر کی مثال میں گذر چکی۔گویا یہ حدیث من وجہ تفسیر ہے آیت اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ کی۔ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح یوں فرماتے ہیں:-يُرْفَعُ اِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ یعنی برداشتہ میشود و بالا بردہ میشود بسوئے درگاہ وے عملہائے بندگان کہ در شب مے کنند پیش از عملہائے کہ در روزے کنند وَ عَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ و برداشتہ میشود عملِ روز پیش از عملِ شب یعنی ہنوز روز نشدہ و عملے در آں واقع نشدہ کہ عملِ شب بالا می برند و شب نرسیدہ کہ عمل روز ببرند و دریں مبالغہ است در مسارعت ملائکہ موکل با عمال عباد و امتثالِ امر و سرعت عروجِ ایشاں بحالِ عرض و مصاعدِ سمٰوٰت ایشاں برفعِ اعمال در ادنیٰ ساعت' چہ فرق میانِ روز و شب جز آنی وجزو لا یتجزی نبود انتہٰی۔

ایسا ہی امام نوویؒ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا:-

فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ الْحَفَظَةَ يَصْعَدُوْنَ بِاَعْمَالِ اللَّيْلِ بَعْدَ انْقِضَآئِهٖ فِيْ اَوَّلِ النَّهَارِ وَ يَصْعَدُوْنَ بِاَعْمَالِ النَّهَارِ بَعْدَ انْقِضَآئِهٖ فِيْ اَوَّلِ اللَّيْلِ.

"ملائکہ محافظین رات کے اعمال اس کے گزر جانے پر دن کے اول وقت میں لے چڑھتے ہیں اور (اسی طرح) دن کے اعمال اس کے گزرنے پر رات کے شروع میں لے چڑھتے ہیں۔"

المثال السابع:-

مجمع البحار میں زیر لفظ رفع لکھا ہے:-

فَرَفَعَهُ إِلَى يَدِهِ أَيْ رَفَعَهُ إِلَى غَايَةِ طُوْلِ يَدِهِ لِيَرَاهُ النَّاسُ فَيُفْطِرُوْنَ. (جلد ثانی ص ۲۳)

"یعنی آنحضرت ﷺ نے پیالہ اپنے دستِ مبارک کی لمبائی کے برابر اوپر اٹھایا۔ تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور روزے افطار کریں۔"

اس حدیث میں بھی رفع کا صلہ الیٰ آیا ہے۔ اور اس سے حقیقۃً مفعول رفع یعنی برتن کا مدخولِ الیٰ کی طرف اٹھانا ہے۔ پس رفع جسمی ثابت ہے۔

المثال الثامن:-

مجمع البحار جلد ۲ ص ۲۳ یَرْفَعُهُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلّم اس میں بھی صلہ الیٰ آیا ہے۔ اور مراد اس سے مدخول الیٰ کی طرف بات کو نسبت کرنا اور اس تک پہنچانا ہے وَ فِيْ تِلْكَ الْأَمْثِلَةِ كفاية لمن له دراية (اتنی مثالیں سمجھ والے کے لئے کافی ہیں) [1]

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ جب رفع کا صلہ الیٰ آتا ہے۔ تو اس

---

[1] مولوی اکمل صاحب مہاجر قادیانی ان مثالوں کی کثرت سے سخت گھبرا گئے ہیں اور ایسی بہکی ہوئی باتیں کرنے لگے ہیں کہ با مذاق آدمی کو بے اختیار ہنسی آ جائے۔ اور علمی کمال کا قدر دان نفرت سے ان کی کتاب کے دیکھنے سے بیزار ہو جائے۔ میں تو حیران ہوں کہ انہوں نے اپنا تخلص اکمل کیوں رکھ لیا۔ جو شخص شہادت القرآن نہیں سمجھ سکتا وہ اکمل کیوں بنے۔

۱۲ سعادت منہ۔

کے معنی ''شئی مذکور کو مدخول الیٰ کی طرف اٹھانا'' ہوا کرتے ہیں بغیر ارادہ معنی موت واعزاز واکرام کے خواہ وہ شے جوہر ہو خواہ عرض۔

خلاصۃ المرام یہ کہ لغت میں رفع کے حقیقی اور وضعی معنی ''اوپر کو اٹھانا'' ہیں۔ برخلاف وضع اور خفض کے کہ ان کے معنی نیچے رکھنا ہیں پس جہاں رفع کا مفعول کوئی جسم ہوگا۔ وہاں اس سے مراد نیچے سے اوپر کو حرکت دینا ہوگی۔ اور اگر اس کا متعلق ومعمول کوئی معنی ہوگا۔ تو اقتضائے مقام پر محمول ہوگا۔ جیسے محاورہ رَفَعْتُهُ اِلَى الْحَاكِمِ میں اگر ضمیر منصوب سے مراد کوئی جسم ہو تو اس سے مراد رفع جسمی ہوگی اور اگر کوئی امر ومعاملہ ہو تو صرف اس امر کا پیش کرنا مراد ہوگا۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے المصباح المنیر کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو تا کہ اللہ تعالیٰ ظلمات شکوک سے نجات دے۔

فَالرَّفْعُ فِي الْاَجْسَامِ حَقِيْقَةٌ فِي الْحَرْكَةِ وَالْاِنْتِقَالِ وَ فِي الْمَعَانِيْ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الْمَقَامُ.

''لفظ رفع جسموں کے متعلق حقیقی معنی کے رو سے حرکت اور انتقال کے لئے ہوتا ہے اور معانی کے متعلق جیسا موقع ومقام ہو۔ ویسی مراد ہوتی ہے''۔

مصباح کی اس تصریح سے واضح ہو گیا کہ رفع کے حقیقی اور وضعی معنی نیچے سے اوپر کو حرکت وانتقال کے ہوتے ہیں۔ اور نیز محاورات سابقہ سے روشن ہو گیا کہ رفع کا صلہ جب الیٰ آئے تو اس کے معنی شئے مذکور۔ کا مدخول اِلیٰ کی طرف مرفوع ہونا ہوا کرتے ہیں۔ پس اس بیان وتحقیق سے وَرَافِعُکَ اِلَیَّ سے یہ محقق ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بجسدہ زندہ مرفوع اِلَى السَّمَآءِ ہوئے۔ کیونکہ رَافِعُکَ میں ضمیر مخاطب راجع بطرف منادی یعنی عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ اور اسمائے اجسام مع ارواح کے ہوا کرتے ہیں نہ مجرد ارواح کے اور نہ مجرد اجسام کے اور کلمات اِلَى اللّٰهِ وَ اِلَى السَّمَآءِ ہر دو سے ایک ہی مقصود ہے۔ عَلٰى مَا سَنُبَيِّنُ ان شاء اللہ[1]

---

[1] جیسا کہ ہم ان شاء اللہ جلد بیان کریں گے۔

ثالثاً یہ کہ کنایات بغیر ارادہ معنی کنائی و بغیر مطابقت باصل واقعہ کے اور مجازات بغیر تعذر حقیقت یا وجود قرینہ صارفہ کے مراد نہیں لیے جا سکتے۔ مثلاً کشف عَنِ السّاقِ جو کنایہ شدت اور مستعدی سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ محاورہ اپنے معانی حقیقیہ یعنی پنڈلی کو برہنہ کرنا'' پر کبھی بھی دال نہیں ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پانی سے گذرنے کے وقت یا کسی اور تقریب سے اپنی ساق (پنڈلی) کو فی الواقع برہنہ کرے تو یہ الفاظ معانی حقیقیہ پر محمول ہوں گے جیسے آیت سورہ نمل میں ہے وَ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (نمل پ ۱۹) کہ بلقیس نے (شیش محل میں جاتے وقت شیشے کے فرش کو پانی خیال کر کے اپنے پائچوں کو سمیٹا اور) اپنی پنڈلی کو ننگا کیا (عملی تولی) اور اگر حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس شخص نے اپنی پنڈلی برہنہ نہیں کی اور متکلم نے بھی اس معنی کا ارادہ نہیں کیا۔ تو یہی الفاظ کنایہ ہوں گے۔ مستعدی یا شدت سے جیسا کہ اس شعر میں ہے

اصبر عناق انه شرباق قد سن لی قومک ضرب الاعناق
وقامت الحرب بنا علی ساق

(تفسیر اتقان)

مع ھذا معنی حقیقی اور معنی کنائی دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ برخلاف مجاز کے کہ یہ حقیقت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اور کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے جیسا کہ مطول میں بالتصریح مذکور ہے۔

الکنایة لفظ ارید به لازم معناه مع جواز ارادته معه ای ارادة ذلک المعنی مع لازمه کلفظ طویل النجاد والمراد به لازم معناه اعنی طول القامة مع جواز ان یراد حقیقة طول النجاد ایضاً فظهر انها تخالف المجاز من جهة ارادة المعنی

جیسا کہ ہم ان شاء اللہ جلد بیان کریں گے۔ (عبدالقیوم میر)

الحقيقي للفظ مع ارادة لازمه لارادة طول النجاد مع ارادة طول القامة بخلاف المجاز فانه لا يصح فيه ان يراد المعنى الحقيقي. انتهى.

''کنایہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے اس کے لازمی معنی کا ارادہ کیا جائے اور اس لازمی معنی کے ساتھ اس لفظ کے اصلی معنی کا ارادہ بھی جائز ہو۔ مثلاً لفظ ''طویل النجاد'' کہ اس سے اس کے لازمی معنی یعنی ''قد کی درازی'' مراد ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے حقیقی معنی (شرافتِ نسب) بھی مراد لینے جائز ہیں پس ظاہر ہو گیا کہ کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی اور لازمی ہر دو معنی جمع ہو سکتے ہیں بخلاف مجاز کہ اس کے ساتھ حقیقی معنی جمع نہیں ہو سکتے۔''

اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں رَافِعُکَ اِلَیَّ کے معنی حقیقی یعنی رفعِ جسمی جو بالکل حق ہیں' اور معنی کنائی (فرضی) یعنی رفعِ منزلت جو مراد نہیں ہیں۔ ان دونوں میں تبائن کلی و منافات نہیں ہے۔ بلکہ دونوں معاً مجتمع و متحقق ہو سکتے ہیں کیونکہ رفعِ جسمی بہ نسبت عبدِ صالح مستلزمِ اعزاز و اکرام ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر چڑھا بٹھایا۔

خصوصاً مسئلہ مَا نَحْنُ فِیْهَا یعنی رفعِ مسیح الی السماء میں رفعتِ قدر و منزلت بھی بطریق اولیٰ و احسن پائی جاتی ہے۔ پس معنی کنائی ہم کو مضر نہیں جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ ارادہ معنی کنائی کے وقت ارادہ معنی حقیقی بالضرور ممنوع ہے اور معنی مجازی کی نسبت یہ جواب ہے کہ ارادۂ مجازات بغیر حقیقت کے ممنوع ہونے کے یا بغیر قرینہ موجود ہونے کے ممنوع ہے جیسا کہ علم اصول اور بیان میں مصرح ہے۔

اسی لئے قرآن شریف میں جہاں کہیں رفع سے مراد رفع بحسب الدرجہ

مراد ہے وہاں بالضرور قرائن صارفہ موجود ہیں۔ مثلاً آیات رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بقرہ پ۳) (۲:۲۵۳) اور نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (انعام و یوسف پ۱۳) اور رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (انعام پ۸) اور رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (زخرف پ۲۵) میں لفظ درجات بالتصریح موجود ہے۔ پس چونکہ آیت وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ میں ارادہ رفع جسم الی السمآء کے لئے نہ تو تعذر حقیقت لازم آتا ہے اور نہ کوئی قرینہ موجود ہے اس لئے اس جگہ محض رفع منزلت مراد نہیں لے سکتے۔

عوام کے افہام کے لئے اس قدر کافی ہے کہ وہ آیت وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف پ۱۳) کو جو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اپنے والدین کو تخت کے اوپر بٹھانے کے بارے میں ہے۔ یاد رکھیں کہ جس طرح اس آیت میں مفعول ''رفع'' کا مدخول ''علی'' پر حقیقۃً بالجسد مرفوع ہونا مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا بجسدہ العنصری مرفوع الی السمآء ہونا مراد ہے اور اسی طرح آیت اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر پ۲۲) میں مفعول یصعد یعنی کلمۂ طیب کا مدخول الی یعنی جناب باری عزاسمہ میں آسمان پر مرفوع ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل حدیث شریف میں وارد ہے اور اس کی کچھ شرح (ص ۱۸۵،۱۸۳) میں گذر چکی ہے۔ نیز آیت ثانیہ سورہ فاطر سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ ارتفاع الی اللہ اور صعود الی السمآء متساوق فی المعنی ہیں۔ کیونکہ صورت صعود کلمات طیبات کی یہ ہے کہ کراماً کاتبین اعمال عباد لکھ کر آسمان پر جناب باری عزاسمہ میں پیش کرتے ہیں۔

جملہ تفاسیر معتبرہ مثل تفسیر کبیر' معالم' جلالین' سواطع الالہام' تفسیر رحمانی جو بیان نکات قرآنی میں بے مثل ولاثانی ہے اور تفسیر فتح البیان' جامع البیان' ابن کثیر' مدارک' درمنثور' بیضاوی' السراج المنیر' خازن' کشاف' ابی السعود اور عباسی ان سب منقولی و معقولی تفاسیر میں بلاخلاف رَافِعُكَ اِلَيَّ سے رَفَعَ اِلَى السَّمَآءِ

مراد لکھا ہے۔ چنانچہ بعض کی عبارات تحریر میں لائی جاتی ہیں:۔

تفسیر رحمانی جو بیان معارف قرآنی میں لاثانی ہے اس میں لکھا ہے:۔

(ن) لا ادع لک شهوة طعام و شراب فتحتاج الى مساكنة الارض (وَرَافِعُکَ اِلَیَّ) ای الی سمائی (و) انما ارفعک لانی (مُطَهِّرُکَ مِنَ) جوار (الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) لئلا یصل الیک من اثار هم شیء (و) کما اجعلک فوق اهل الارض فانا (جَاعِلُ الذین اتَّبَعُوْکَ) من المسلمین والنصاریٰ (فوق الَّذِیْنَ کَفَرُوا) لک من الیهود یعلونهم (اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ).

''اور میں تجھے کھانے پینے کی خواہش ہی باقی نہ رکھوں گا کہ تجھے زمینی سکونت کے اسباب کی حاجت پڑے۔ کیونکہ میں تجھے اپنے آسمان کی طرف اٹھانے والا ہوں کہ تجھے کفار کی مصاحبت سے پاک رکھوں تا کہ تجھے ان کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے۔ اور جس طرح تجھے زمین والوں سے اونچا کروں گا۔ اسی طرح تیرے تابعداروں کو (جو مسلمان اور عیسائی ہیں) تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔''

علامہ صوفی علی مہائمیؒ نے اس عبارت جامعہ میں منکرین کے شبہ کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ کہ اگر حضرت روح اللہ آسمان پر موجود ہیں تو کھاتے کہاں سے ہیں؟

اسی طرح تفسیر کشاف اور مدارک میں ہے۔

(وَرَافِعُکَ اِلَیَّ) ای الی سمائی (وَمقرِّ ملائکتی)

یعنے ''تجھ کو اپنے آسمان اور اپنے فرشتوں کی قرار گاہ میں اٹھا لینے والا ہوں۔''

یہ اس لئے کہ حضرت روح اللہ بوجہ ولادت بلا پدر مشابہ بالملائکہ ہیں جیسا کہ عنقریب بالتفصیل مذکور ہوگا۔ ان شاء اللہ

سبحان اللہ! علامہ محمود جار اللہ زمخشری باوجود اہل اعتزال کا امام ہونے کے اپنی اس تفسیر میں جو قرآن مجید کی عربیت کے بیان کرنے میں سب کی استاد تسلیم کی گئی ہے رافعک الی میں حقیقی معنی رفع الی اسماء کو چھوڑ کر تاویل نہیں کر سکے۔ اگر ان کو عربیت اجازت دیتی۔ تو وہ ضرور تاویل کرتے۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی وسراج منیر اور ابی سعود میں بھی ہے۔

وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

دوسرا قرینہ:۔

وَ مُتَوَفِّیْکَ سے رفعِ جسم مراد لینے کے لئے الفاظ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ہیں۔

اس جگہ تطہیر سے مراد کفار کے ہاتھ سے صاف بچا لینا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو نجس اور پلید قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (توبہ پ۱۰)

یعنی "مشرکین (بوجہ خباثتِ شرک) نجس ہیں۔" (۹:۲۸)

محدث ابن جریر اپنی تفسیر میں حضرت ابن جریج رومیؒ سے نقل کرتے ہیں

عن ابن جریج قوله انی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا قال فرفعُهٗ اياه اليه تَوَفِّيْهِ اياه و تطهيرُهٗ من الذين كفروا. (جلد۳ص ۱۴۷'۱۴۸)

"کہ انہوں نے قولِ الٰہی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ الخ کے بارے میں کہا کہ خدا تعالیٰ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لینا ہی آپ کی توفی ہے۔ اور یہی کفار سے تطہیر ہے۔"[1]

---

[1] ہمارے اکمل صاحب اس مقام پر سخت حیران ہیں۔ کبھی تو تطہیر سے مراد تخلیص مان جاتے ہیں۔ گو الٹی طرف سے ناک پکڑ کر اور کبھی صاف انکار کر جاتے ہیں اور کبھی نہایت سادگی سے کہتے ہیں مگر یہ تخلیص وانجاء کیا آسمان پر جانے ہی سے ممکن ہے؟ کیا دوسرے ملک میں چلے جانے سے ممکن نہ تھی؟ (ص ۳۱) جواب۔ جناب معقولات جانے آپ کی بلا۔ سنئے! ممکنات میں سے جب ایک صورت واقع ہو جائے تو وہ ممکن درجہ وجوب میں آ جاتا ہے پس اس کے علاوہ دوسری ممکن صورتوں کے امکان کی وجہ سے اس "واجب" کا انکار سفاہت ہے۔ اور جو

جملہ تفاسیر معتبرہ کیا معقولی اور کیا منقولی مثل تفسیر کبیر و تفسیر معالم و جلالین و تفسیر فیضی و رحمانی و فتح البیان و جامع البیان و مدارک و سراج منیر و خازن و کشاف و تفسیر ابی السعود و عباسی و بیضاوی و تفسیر ابن کثیر میں وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے معنی کفار کے ہاتھ سے خلاصی اور نجات لکھے ہیں۔ بلکہ تفسیر فتح البیان اور ابن کثیر میں اس جگہ رفع الی السمآء بھی ذکر کیا ہے۔

پس آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ الخ کے صحیح معنی یہ ہوئے کہ اے عیسیٰؑ میں تجھے پورا پورا لے لوں گا اور تجھے اپنی طرف آسمان پر اٹھا لوں گا۔ اور تجھے کفار کے شر سے صاف بچا لوں گا[1]

تعجب ہے کہ قرآن مجید کی صاف صاف تصریحات کے برخلاف ایک مسلمان کس طرح تسلیم کر سکتا ہے کہ یہود نے آپ کو پکڑوا کر صلیب پر چڑھوا دیا۔ اور آپ کے سر پر (استہزاء) کانٹوں کا تاج پہنایا گیا اور آپ کے ہاتھ پاؤں میں

؎ اس جگہ تطہیر سے مراد تخلیص بنا پر موقع ذکر ہے اسے اصطلاح علمائے اصول میں "سوق کلام" کہتے ہیں جو آپ نہیں جانتے اور قرائن حالیہ و مقالیہ اس کے مؤید ہیں۔ ۱۲ سعادت الاقران۔ منہ

[1] اکمل صاحب نہایت بے باکی سے لکھتے ہیں۔" اور چندرہ تفاسیر کا حوالہ جو دیا کہ ان میں اس آیت کے معنی کفار کے ہاتھ سے خلاصی و نجات کے لکھے ہیں۔ وہ برابر ہمارے اعتقاد کی تصدیق کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے نبی کو ان کے ہاتھوں سے خلاصی و نجات دی اور کشمیر چلے آئے (ص ۳۷) جواب۔ اکمل صاحب مفسرین پر یہ افترا کیا؟ ان میں سے جس تفسیر میں کشمیر کی تصدیق لکھی ہے بھلا کسی مجلس میں دکھائیں تو سہی ورنہ قادیان میں ہی شرما چھوڑیں۔ ہاں سماء کے معنی کشمیر کر لیں تو امر دیگر ہے۔ سچ ہے اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (ص ۱۴ النحل) (۱۶:۱۰۵) یعنی "افترا باندھنا بے ایمانوں کا کام ہے اور وہ سب جھوٹے ہوتے ہیں" قادیان میں بھی تو مزے ہیں کہ جھوٹ بنایا اور خلقت کو لوٹا۔ ۱۲ سعادت۔ منہ

میخیں ٹھونکی گئیں اور آپ کی پسلی میں نیزہ مارا گیا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔[1]

---

[1] یہ سب امور نصاریٰ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن کے اعتبار سے سرسید احمد صاحب علیگڈھی اور مرزا صاحب قادیانی تصلیب مسیح کے قائل ہوئے ہیں۔ نہ تو یہ کتابیں معتبر ہیں اور نہ ان کے بیانات قابل اعتبار ہیں۔

اوّل:- اس وجہ سے کہ ان کتابوں کے مصنفین تک ان کی سند متصل نہیں اور نہ ان کی طرف ان کی نسبت کا صحیح ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوم:- اس وجہ سے کہ جن مصنفوں نے بھی ان کو لکھا۔ انہوں نے واقعات مندرجہ کی کوئی سند نہیں بیان کی اور نہ سلسلہ روایت ذکر کیا۔

سوم:- اس وجہ سے کہ ان میں یہ بھی مرقوم ہے کہ جب سپاہی حضرت مسیح کو گرفتار کرنے آئے تو آپ کے "شاگرد بھاگ گئے۔" دیکھو متی ۵۶/۲۶ اور مرقس ۵۰/۱۴ پس جب واقعہ کے وقت کوئی بھی مومن موجود نہیں تھا تو کس کی شہادت سے اس کا اعتبار کیا جائے؟

چہارم:- اس وجہ سے کہ واقعۂ صلیب اور اس کے ضمیمہ جات کی نسبت انہی مصنفین اناجیل میں کئی قسم کی اختلاف بیانیاں ہیں مثلاً

(۱) متی ۴۸/۲۶ اور مرقس ۴۴/۱۴ اور لوقا ۴۷/۲۲ میں مرقوم ہے کہ یہوداہ اسکریوطی نے آپ کی پیشانی پر بوسہ دے کر آپ کو شناخت کرایا۔ لیکن اس کے برخلاف یوحنا ۱۸/۵ میں مرقوم ہے کہ خود حضرت مسیح نے سپاہیوں کو اپنے آپ بتایا کہ میں مسیح علیہ السلام ہوں اور انہوں نے آپ کو گرفتار کرلیا۔

(۲) اسی طرح متی ۳۲/۲۷ اور مرقس ۲۱/۱۵ اور لوقا ۲۶/۲۳ میں مسطور ہے کہ سپاہیوں نے ایک دیہاتی شخص شمعون کرینی کو جو دیہات سے آرہا تھا۔ بیگاری پکڑا اور اسے حضرت مسیح علیہ السلام کی صلیب اٹھوائی اور وہ اسے اٹھا کر مقام گلگتا تک جہاں وہ صلیب دیے گئے لے گیا۔ لیکن اس کے برخلاف انجیل یوحنا ۱۷/۱۹ میں مسطور ہے کہ صلیب خود حضرت مسیح نے اپنے کندھوں پر اٹھائی اور مقام گلگتا تک لے گئے۔

(۳) اسی طرح متی ۵/۲۷ میں اس روپیہ کی بابت جو یہوداہ اسکریوطی نے حضرت مسیح کو پکڑوانے کی رشوت میں لیا یہ لکھا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد یہوداہ وہ روپیہ مقدس میں پھینک کر چلا گیا اور جا کر اپنے آپ کو پھانسی دی لیکن اس کے برخلاف کتاب "رسولوں کے اعمال" ۱۸/۱ میں لکھا ہے۔ کہ اس نے اس روپے سے ایک کھیت حاصل کیا اور سر کے بل گرا۔ اور اس کا پیٹ پھٹ گیا اور اس کی ساری انتڑیاں نکل پڑیں۔ پس ایسے صاف اختلافات کے ہوتے ان کا بیان ہرگز قابل اعتبار نہیں رہتا۔ اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو فرمایا وَاِنَّ

اگر کوئی کہے کہ اس جگہ تطہیر سے مراد ان الزاموں سے بری کرنا ہے جو یہود آپ کی ولادت بلا پدر کے بارے میں لگاتے تھے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سب الزاموں سے پاک کیا اور بری بیان کیا اور یہ امر قرآن شریف میں متعدد مقامات پر اشارۃً صراحۃً مذکور ہے' لیکن خاص اس مقام پر تطہیر سے مراد سوائے ان کے مکر[1] سے بچا لینے کے اور کچھ نہیں' تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مطھرک کا وعدہ بوقت تبلیغ رسالت ہے۔ جب یہود آپ کے قتل کے درپے تھے۔ جیسا کہ سابقاً فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ اور وَمَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ کی تفسیر میں مذکور ہو چکا' اور ان الزامات سے برأت اس سے پیشتر تکلم فی المھد سے ہو چکی تھی' اور جو امر پہلے گذر چکا ہو اس کا آئندہ وعدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وعدہ ہمیشہ اس امر کا کیا جاتا ہے۔ جو حاصل نہ ہو پس وعدہ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جو تکلم فی المھد سے کئی سال بعد ہوا۔ اس سے برأت

---

[1] الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (نساپ ۲) بالکل حق ہے یعنی "جن لوگوں نے اس امر میں (حق سے) اختلاف کیا۔ وہ بالضرور شک میں ہیں۔ ان کو سوائے گمان کی پیروی کے کوئی بھی علم نہیں" ۱۲۔ کتاب ہذا کے صفحہ ۸۲ کے حاشیہ نمبر ۲ پر جو وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا کسی قدر ایفا اس جگہ کر دیا ہے۔ ۱۲ سعادت۔ منہ

[2] اکمل صاحب بھی عجب کمال کے بندے ہیں کہ لفظ مکر کی اس تشریح کو جو ہم نے سابقاً کئی صفحوں میں بیان کی ہے نظر انداز کر کے فرماتے ہیں مکر کیا تھا؟؟ آپ خود ہی حسب قول اپنے بول اٹھے "قتل"۔ بس اس سے اللہ نے نجات دے دی (ص ۳۰) جواب جناب والا! اس جگہ مکر سے مراد قتل مع اس کے اسباب کے ہے کیونکہ قتل کے لئے کوئی نہ کوئی صورت اور اس کے اسباب ضروری ہیں اور وعدہ مُطَهِّرُكَ میں قتل اور اس کے اسباب سے بالکلیہ صاف صاف بچا لینا مقصود ہے۔ پس نہ قتل ہوا اور نہ اسباب قتل جن کا انہوں نے منصوبہ باندھا تھا منعقد ہو سکے۔ اسی لئے مَا قَتَلُوْهُ کے بعد مَا صَلَبُوْهُ کی تصریح ضروری ہوئی۔ کہ صلیب پر چڑھانا قتل کا ذریعہ اور سبب تھا پس اس کی بھی نفی کر دی فافھم۔ ولا تکن من القاصرین۔ ۱۲ سعادت منہ

از طعن مراد نہیں ہو سکتی اور چونکہ بالکلیہ صاف صاف بچا لینا تھا۔[1] اس لئے مبالغۃً اس معنی کو لفظِ تطہیر سے بیان کیا۔ چنانچہ اس کی کچھ تفصیل مُتَوَفِّیکَ کی بحث میں گذر چکی اور کچھ ابھی مذکور ہو گی' ان شاء اللہ

اگر کہا جائے کہ تطہیر از طعن' محمد رسول اللہ ﷺ کی معرفت قرآن شریف میں کی جانے کی بابت وعدہ ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف نے صرف حکایۃً مضمون بیان کیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام نے عادۃً کلام نہ کرنے کی عمر میں بیان کیا تھا' پس اصل برأت تو اس سے ہو گی اور کوئی نقل نقل کرنے والے کی طرف اصالۃً منسوب نہیں ہو سکتا' پس یہ عذر بھی درست نہیں۔[2]

---

[1] اکمل صاحب نے اس موقع پر عجب کمال دکھایا ہے کہ صلیب پر کئی ایک مصیبتیں اٹھا کر اور نیم مردہ ہو کر صرف موت سے بچ رہنے کی بابت بھی لکھتے ہیں "صاف بچ نکلے" جواب! "سبحان اللہ! صاف صاف بچنے کی یہ صورت قادیان والے ہی سمجھے ہوں گے۔ بندۂ خدا! کیوں عقل کے پیچھے لوٹ کر پڑے ہو اور جس امر کو خدا تعالیٰ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَا صَلَبُوْهُ یعنی اسے سولی پر بھی نہ چڑھایا خواہ مخواہ اس کے خلاف کیوں باتیں بناتے ہو؟ سعادت الاقران۔ منہ

[2] اکمل صاحب نے یہاں پر نئی توجیہ نکالی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔
"یہ وعدۂ تطہیر علاوہ اس کے اس الزام کے متعلق ہے جو لعنتی موت کا یہود لگاتے تھے۔ (ص ۳۱) جواب: جناب من! علاوہ کا علاوہ کیوں ساتھ رکھ دیا۔ اس کی تو کافی تردید ہو چکی کچھ جواب تو بن آیا نہیں اور علاوہ یونہی لکھ مارا۔ دیگر یہ کہ "لگاتے تھے" کیسے دھر گھسیٹا ذرا سوچو تو یہ بشارت تو آپ کو زندگی میں واقعۂ صلیب سے قبل ہو رہی ہے واقعہ صلیب سے پیشتر لعنتی موت کا الزام کیسے متصور ہو سکتا ہے کہ آپ نے "لگاتے تھے" بصیغہ ماضی لکھ مارا۔ بریں اکملیت بباید گریست دیگر یہ کہ صلیب پر چڑھایا جانا یا کہ اس سے قتل کیا جانا کوئی گناہ نہیں۔ کہ موجبِ الزام ہو سکے پس اس سے تطہیر کی کیا ضرورت ہے؟؟ اگر کہا جائے کہ یہود کے خیال میں صلیب کی موت لعنتی تھی جیسا کہ کتاب استثنا میں مذکور ہے پس اس نظر سے صلیب کی موت موجبِ الزام ہو سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کتاب استثنا کے اس حوالہ سے یہ نتیجہ نکالنا قادیانی ایجاد ہے وہاں کہیں بھی مذکور نہیں کہ مطلقاً ہر صلیب پر لٹکایا ہوا لعنتی ہوتا ہے بلکہ تو

نکتہ:- اس جگہ رفع الی السماء کو توفی سے تعبیر کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے جو تفسیر کبیر اور خازن میں مذکور ہے کہ

اِنَّ التَّوَفِّیَ اَخْذُ الشَّیْءِ وَافِیًا وَلَمَّا عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّخْطُرُ بِبَالِهٖ اِنَّ الَّذِیْ رَفَعَهُ اللّٰهُ هُوَ رُوْحُهٗ لَا جَسَدُهٗ ذَكَرَ هٰذَا الْكَلَامَ لِیَدُلَّ عَلٰی اَنَّهٗ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ رُفِعَ بِتَمَامِهٖ اِلَی السَّمَآءِ بِرُوْحِهٖ وَبِجَسَدِهٖ. (تفسیر کبیر جلد دوم)

''توفی کے معنی ہیں کسی چیز کو تمام لے لینا' اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ کسی شخص کے دل میں یہ بھی گزرے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی (صرف) روح کو اٹھایا تھا اور جسم کو نہیں اٹھایا تھا اس لئے اللہ نے یہ کلام (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ) فرمایا تاکہ اس امر پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتامہ مع جسم اور روح کے (زندہ) آسمان پر اٹھالیا۔''

سبحان اللہ! قرآن شریف کیسا معجز کلام ہے اور امام رازیؒ بھی قرآن شریف کے کیسے رمز شناس ہیں کہ جو بات مرزا جی کئی صدیاں بعد کہنے والے تھے۔

؎ خاص اسی شخص کو ملعون کہا گیا ہے جو کسی جرم واجب الصلیب کی سزا میں مصلوب ہو جیسا کہ نفس عبارت میں مذکور ہے۔ دیکھو کتاب استثناء باب ۲۱ آیت ۲۲) میں مکتوب ہے (۲۲) اور اگر کسی نے ایسا گناہ کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہوا الخ۔

دیگر یہ کہ قرآن شریف میں یہود کا ادعائے قتل صرف ان الفاظ میں ذکر کیا ہے اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ الخ اور اس کے ساتھ ان کے قول سے صَلَبْنَا ذکر نہیں کیا اس سے صاف کھل سکتا ہے کہ یہود نفس قتل پر فخر کرتے تھے اور اس کے ذریعہ یعنی صلیب کی کوئی اہمیت ان کی نظر میں نہ تھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اسے بھی ان کی طرف سے اس ادعائے مفاخرت کے ساتھ ہی ذکر کرتا۔ پس جب وہ صلیب پر لٹکانے پر فخر ہی نہیں کرتے۔ تو اسے ان کے نزدیک موجب طعن والزام گرداننا صرف قادیانی تصور وتخیل کا نتیجہ ہے اور ''بلی کو چھیچھڑوں کے خواب'' کا مصداق ہے اس کی مزید تشریح آیت وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ کی تفسیر میں مذکور ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

سعادت ۱۲ منہ

اس کی تردید پہلے ہی فرما دی۔ یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے' جو پوری پوری واقع ہوئی سُبْحَانَ مَا اَصْدَقَ کَلَامَهٗ۔

کشف مغالطہ:۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے قال ابن عباس مُتَوَفِّیْکَ مُمِیْتُکَ[1] یعنی ابن عباس مُتَوَفِّیْکَ کے معنی مُمِیْتُکَ کرتے ہیں۔

مرزا صاحب قادیانی کو الہام بافی کے علاوہ مغالطہ دہی میں خاص کمال تھا اور کسی سیدھی بات کو بھی الٹا کر کیا کا کیا کچھ کر دکھانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اس مُمِیْتُکَ سے پہاڑ سر پر اٹھا لیا۔ اور ایک طوفان برپا کر دیا کہ لو جی! حضرت ابن عباس بھی وفات مسیح کے قائل تھے اور امام بخاری کا بھی یہی مذہب تھا[2]

جناب مرزا صاحب نے نہ تو صحیح بخاری کسی استاد حدیث سے پڑھی کہ اسے سمجھتے اور نہ اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی رکھتے تھے' بلکہ جیسا کہ وہ خود اقرار[3] کرتے ہیں علم حدیث سے مناسبت ہی نہ رکھتے تھے۔ پھر علم حدیث میں ان کے قول کا کیا اعتبار؟

کسی روایت کی تشریح کے لئے ضروری ہے کہ اس کی صحت معلوم کرنے کے بعد اول تو اس کے جملہ طرق جمع کیے جائیں' پھر اس مضمون کی جملہ روایات کو سامنے رکھ کر علوم آلیہ کی مدد سے اسے حل کیا جائے' مرزا جی کی علمی بضاعت جاننے والے اصحاب جانتے ہیں کہ مرزا جی کی نظر علم روایت میں بہت ناقص تھی' اور فہم قاصر' پھر خود غرضی کا بھوت سر پر سوار مزید برآں کذب و افترا اور مغالطہ سے بیخوفی' پھر وہ ایک مضمون کی جملہ روایات اور ایک روایت کے جملہ طرق کو کس طرح اور کیوں جمع کریں' بالخصوص جب اس طرح کی تحقیقات کا نتیجہ اپنے ادعا اور

---

[1] کتاب التفسیر سورہ مائدہ۔ ۱۲ منہ

[2] ازالہ اوہام مصنفہ مرزا صاحب قادیانی۔ ۱۲ منہ

[3] حمامۃ البشریٰ و تبلیغ مصنفہ مرزا صاحب۔ ۱۲ منہ

مدعا کے خلاف ہو' وہ تو صرف لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ جانتے تھے۔ اور اَنْتُمْ سُکَارٰی سے ان کو کچھ واسطہ نہ تھا۔

چنانچہ ہم خدا کے فضل سے ان کے ہر دو مغالطات کو دور کر کے حقیقت الامر کو منکشف کرتے ہیں۔

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ وفات مسیح علیہ السلام کے قائل تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سراسر افترا ہے حضرت ابن عباسؓ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کے قائل ہرگز نہ تھے' صحابہ میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی کی بیشتر روایات حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگردوں ہی سے مروی ہیں۔ چنانچہ تفاسیر مبسوطہ ان سے بھری پڑی ہیں۔ آپ نے جو مُتَوَفِّيْكَ سے مراد مُمِيْتُكَ بتائی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آئندہ زمانہ میں کسی وقت فوت کرے گا۔ کیونکہ مُتَوَفِّيْ اسم فاعل کی وضع میں زمانِ مستقبل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا اشتقاق فعل مضارع سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مراح میں ہے اِسْمُ الْفَاعِلِ وَهُوَ اِسْمٌ مُشْتَقٌّ مِّنَ الْمُضَارِعِ اور اس امر کا لحاظ قرآن شریف میں بھی کیا گیا ہے' چنانچہ فرمایا:۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
(کہف پ ۱۵)(۱۸:۲۳'۲۴)

اس آیت میں فَاعِلٌ سے جو اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ لفظ غَدًا منضم کیا ہے جس کے معنی کل آئندہ کے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ مُمِيْتُكَ سے مقصد یہ ہے کہ میں تجھے آئندہ زمانہ میں ماردوں گا۔ پس ابن عباسؓ اس آیت کے اجزا میں تقدیم وتاخیر کے قائل ہیں۔ جیسے کہ مفسرین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ اگر اس جگہ تَوَفِّيْ سے مراد

---

[1] چنانچہ اکمل صاحب نے بھی اس آیت کے ترجمہ میں سب جگہ مستقبل کے صیغے لکھے ہیں دیکھو ان کی کتاب کا ص ۲۱ سطر ۱۵ سے ۲۰ تک۔ ۱۲ سعادت منہ

موت بھی لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ توفی بالموت کا تحقق و وقوع بعد آسمان[1] سے نازل ہونے کے ہوگا۔ اگرچہ آیت میں مقدم ہے اور رفع الی السماء کا تحقق و وقوع قبل موت کے ہو چکا اگرچہ ذکر میں موخر ہے' کیونکہ ترتیب ذکری اور ترتیب وقوعی میں مطابقت ضروری نہیں اس لئے کہ واؤ عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف جمع کے لئے آتی ہے[2]

چنانچہ امام رازیؒ اس آیت میں تقدیم و تاخیر کی بحث میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہیں ان کا قول یہ ہے کہ

قالوا ان قوله ورافعک الی یقتضی انه رفعه حیا والواؤ لا یقتضی الترتیب فلم یبق الا ان یقول فیها تقدیم وتاخیر والمعنی انی رافعک الی و مطهرک من الذین کفروا و متوفیک بعد انزالی ایاک فی الدنیا و مثله من التقدیم والتاخیر کثیر فی القران. (تفسیر کبیر جلد دوم)

"قول الٰہی وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ اٹھالیا اور واؤ (عاطفہ) ترتیب کی مقتضی نہیں پس سوائے اس کے اور کچھ نہ رہا کہ کہا جائے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہیں کہ میں تجھے اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور کفار سے بالکل پاک صاف رکھنے والا ہوں اور تجھے دنیا میں نازل کرنے کے بعد فوت کرنے والا ہوں اور اس قسم کی تقدیم و تاخیر قرآن شریف میں بکثرت ہے۔"

اور اس سے پیشتر فرماتے ہیں:

---

1. جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان (مذکورہ) واقعات کے وقت میرا بھائی عیسیٰ بن مریم آسمان سے اترے گا۔ (مختصر کنز العمال) ۱۲ سعادت منہ۔

2. چنانچہ کافیہ میں ہے الواو للجمع المطلق لا ترتیب فیها ۔۱۲ منہ

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه

(الوجه الرابع) في تاويل الأية ان الواؤ في قوله متوفيک ورافعک اليّ لاتفيد الترتيب فالأية تدل علٰى انه تعالٰى يفعل به هذه الافعال فاما كيف يفعل و متٰى يفعل فالامر فيه موقوف علي الدليل وقد ثبت الدليل انهٗ حيٌّ وورد الخبر عن النبي صلّى الله عليه وسلم انه سينزل و يقتل الدّجّال ثم انه تعالٰى يتوفاه بعد ذٰلک (تفسیر کبیر جلد دوم سورہ آل عمران)

''(چوتھی وجہ یہ کہ) اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ واؤ (عاطفہ) جو مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ میں ہے وہ مفید ترتیب نہیں۔ پس یہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالٰی آپ سے یہ سب معاملے کرے گا۔ لیکن کس طرح کرے گا اور کب کرے گا۔ پس یہ سب کچھ کسی اور دلیل پر موقوف ہے اور اس کی دلیل ثابت ہو چکی ہے کہ آپ زندہ ہیں اور نبی ﷺ سے حدیث وارد ہے کہ آپ ضرور اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ پھر اللہ تعالٰی آپ کو اس کے بعد فوت کرے گا۔''

امام رازیؒ کے حوالہ میں جو یہ مذکور ہے کہ قرآن مجید میں تقدیم و تاخیر کی مثالیں بکثرت ہیں[1] بالکل درست ہے۔ مثلاً اسی مقام سے تھوڑا پیشتر سلسلۂ ذکر مریم علیہا السلام میں آیت يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران پ ۳) (۳:۴۲) میں سجدہ کو رکوع سے پہلے ذکر کیا۔ حالانکہ ترتیب خارجی و عملی میں متاخر ہوتا ہے۔ اس کی دیگر مثالوں کے لئے تفسیر اتقان فی علوم القرآن کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ اس میں مستقل طور پر ایک خاص فصل

---

[1] ہر چند کہ تقدیم و تاخیر کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں لیکن وکیل صاحب کبھی تو اسے غیر معقول کہہ دیتے ہیں اور کبھی الٹی طرف سے ناک پکڑ کر تسلیم کر لیتے ہیں مگر شاباش ان کی ہمت پر کہ اپنی ہٹ سے نہیں ہٹتے سوان کے جواب میں حضرت سعدیؒ کا یہ شعر مناسب کافی ہے۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نرہی ۔۔۔ آنست جوابش کہ جوابش ندہی ۔۔۔ ۱۲ سعادت منہ

اتباع الظن وما قتلوه يقينا بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزا حكيما

اسی امر کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

اب معتبر کتابوں سے حضرت ابن عباسؓ کا مذہب دربارہ رفع و توفی حضرت مسیح بیان کیا جاتا ہے۔

امام سیوطیؒ تفسیر الدر المنثور میں فرماتے ہیں کہ:

عن الضحاک عن ابن عباسؓ فی قوله اِنّی متوفیک و رافعک الیّ یعنی رافعک ثم متوفیک فی اٰخر الزمان.
(الدر المنثور)

حضرت ضحاک تابعی حضرت ابن عباسؓ سے قول الٰہی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مراد اس جگہ یہ ہے کہ تجھے اٹھالوں گا پھر آخری زمانہ میں فوت کروں گا[1]

اسی طرح ابی السعود میں ہے:۔

والصحیح ان اللّٰه تعالٰی رَفَعه من غیر وفات ولانوم کما قال الحسن و ابن زید وهو اختیار الطبری وهو الصَّحیح عن ابن عباس (ابی السعود)

کہ صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر موت اور نیند کے اٹھالیا۔ جیسے کہ حضرت حسن بصری اور ابن زید تابعین نے کہا اور یہی امام ابن جریر طبریؒ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ سے صحیح (طور پر ثابت) ہے۔

اسی طرح تفسیر ابن کثیر اور تفسیر فتح البیان میں بذیل آیت وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ

---

[1] باوجود اس کے کہ ابن عباسؓ تصریح کرتے ہیں اور ہم سب کا یہی مذہب ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخری زمانہ میں فوت ہوں گے پھر بھی ہمارے اکمل صاحب کہتے ہیں۔" جب قیامت کے بعد تک موت نہ ہوئی تو اچھے خاصے خدا بن گئے۔" (ص ۳۴) جواب! جناب والا! پھر روح بھی خدا ہوئی کیونکہ اسے بھی فنا نہیں' غالباً اسی لئے مولوی سید سرور شاہ صاحب احمدی قادیانی نے مباحثہ سیالکوٹ میں پادری عبدالحق صاحب مسیحی مناظر کے جواب میں کہا تھا کہ خدا روح ہے (معاذ اللہ) ان لوگوں کو نہ علم ہے نہ عقل۔ ۱۲ سعادت منہ

لِلسَّاعَةِ (زخرف پ ۲۵ ـ ۶۱:۴۳) یعنی تحقیق وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کا ایک نشان ہے حضرت ابن عباسؓ کا مذہب دوبارہ نزول عیسیٰ علیہ السلام مذکور ہے کہ وہ اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو قرب قیامت کی ایک نشانی جانتے تھے۔

اسی طرح محدث ابن جریرؒ نے آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (نساء پ ۶)(۴:۱۵۹) کی تفسیر میں

عن سعید بن جبیر عن ابن عباس و ان من اهل الکتب الا لیومنن به قبل موته قال قبل موت عیسٰی (ابن جریر جلد ۵ ص ۱۲)

حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد حضرت سعید بن جبیر تابعی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا۔ کہ آپ نے فرمایا کہ قَبْلَ مَوْتِهٖ سے مراد قَبْلَ مَوْتِ عیسٰی ہے۔

نیز فتح الباری۔ ارشاد الساری اور عمدۃ القاری ہر سہ شروح صحیح بخاری میں آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ میں قَبْلَ مَوْتِهٖ کی ضمیر کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ بسند صحیح حضرت ابن عباسؓ سے یہی ثابت ہے کہ یہ ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے اور ان سے جو یہ مروی ہے کہ یہ ضمیر کتابی کی طرف پھرتی ہے اسے ضعیف لکھا ہے کیونکہ اس کی اسناد میں ایک راوی خصیف ہے جو ضعیف ہے (فتح)

پس تصریحات بالا سے ثابت ہو گیا کہ حضرت ابن عباسؓ کا اعتقاد یہی تھا

ل اکمل صاحب قادیانی بدمذاقی میں نہایت کامل ہیں۔ اس مقام پر اعتراض کرتے ہیں اگر نزول ثانی کے اعتقاد کا ذکر ہے تو آپ نے اسے مفصل کیوں نہ لکھا۔" (ص ۴۴) جواب! جناب مفصل اس لئے نہ لکھا کہ اس کتاب کا موضوع نزول مسیح نہیں قافہم۔ آداب تصنیف سیکھئے پھر اعتراض کیجئے۔ ۱۲ سعادت منہ

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں[1] اور آخری زمانہ میں آسمان سے نازل[2] ہوں گے اور اس کے بعد فوت ہوں گے' چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

فعند ذٰلک ینزل اخی عیسیٰ بن مریم من السمآء.

(مختصر کنز العمال)

''پس ان (مذکورہ) واقعات کے وقت میرا بھائی عیسیٰ بن مریم آسمان سے اترے گا۔''

باقی رہا دوسرا مغالطہ کہ امام بخاریؒ بھی وفات مسیح علیہ السلام کے قائل تھے سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ پہلے سے بھی بڑا دلیرانہ افترا ہے۔ حضرت امام بخاریؒ ائمہ محدثین سے ہیں۔ وہ خلاف قرآن و حدیث و اجماع صحابہ کوئی اعتقاد کیسے رکھ سکتے

---

[1] اکمل صاحب علم میں تو جو کمال رکھتے تھے وہ معلوم ہو چکا ہوگا۔ آپ عقل میں بھی اکمل ہی ہیں حضرت ابن عباسؓ کا مذہب ہم نے بدلائل ثابت کر دیا کہ وہ نزول من السما اور بعد نزول کے وفات مسیح علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اس پر اکمل صاحب سے کچھ بن نہ پڑا۔ تو آپ فرماتے ہیں' ان کا اپنا مذہب خواہ کیا ہوا ایک اہل زبان اور پھر صحابی کی شہادت تو مل گئی کہ توفی کے وضعی معنی موت کے ہیں'' (ص ۳۳) جواب اس وقت زیر نزاع یہی امر ہے کہ ابن عباسؓ کا مذہب در بارۂ وفات و نزول مسیح علیہ السلام کیا ہے؟ پس جب ثابت ہو گیا کہ وہ رفع و نزول ہر دو کے قائل ہیں' اور وفات بعد النزول مانتے ہیں جو اہلسنت کا مذہب ہے۔ تو آپ کے مرزا صاحب کا مغالطہ کہ حضرت ابن عباسؓ وفات قبل النزول کے قائل ہیں۔ طشت از بام ہو گیا۔ اور یہ جو آپ نے لکھا کہ توفی کے وضعی معنی موت کے ثابت ہو گئے۔ یہ آپ کی غلطی بے کمالی ہے اس سے بعض اوقات موت مراد ہونا تو محل کلام نہیں محل تحقیقات تو یہ ہے کہ اس سے مراد موت از روئے حقیقت ہے یا از روئے مجاز' سو حضرت ابن عباسؓ والی روایت میں اس امر کا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ پھر ثابت کس طرح ہو گیا؟ فافہم۔ ۱۲ سعادت الاقران منہ۔

[2] اکمل صاحب کو قادیانی تقلید میں اسلام اور کفر میں بھی تمیز نہیں رہتی۔ چنانچہ اس نزول کی بابت فرماتے ہیں۔ نزول سے مراد کسی چیز کا بروزی طور سے آنا ہے یعنی اس کی روح و قوت میں (ص ۳۴) جواب جناب والا' پھر تناسخ کیا ہوا؟ سعادت منہ۔

ہیں' یہ مرزا صاحب کا افترا ہے۔ اور عوام کو دھوکا ہے۔

اوّل اس وجہ سے کہ ابن عباسؓ کی روایت کے معنی معلوم ہو چکے کہ محدثین کے نزدیک کیا ہیں پس امام بخاریؒ کا قول بھی بوجہ امام حدیث و حافظ روایت ہونے کے وہی ہے' نظر بر روایات دیگر۔

دوم: اس وجہ سے کہ نقل قول صحابی مستلزم اعتقاد ناقل نہیں۔ کما لا یخفی علی الماھر الذکی۔

سوم: یہ کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مستقل باب باندھا ہے اور اس کے ذیل میں صحیح حدیث نزول کی ذکر کی ہے اور اسی حدیث کو سب محدثین نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے لئے اصل دستاویز بنایا اور دیگر سب روایات کو اس کے تابع رکھا۔

چہارم: یہ کہ امام بخاریؒ نے اسی موقع پر آیت وَ اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ءَاَنْتَ قُلْتَ الخ کی تفسیر میں کہا۔ کہ اذ صلہ ہے اور قال بمعنی یقول یعنی بمعنی مستقبل ہے اور اس صورت میں معاملہ قیامت[1] پر جا پڑتا ہے۔ اور امام بخاریؒ اہلسنت کے ساتھ رہے ہیں پس امام بخاریؒ وفات قبل النزول کے قائل ہرگز نہیں ہو سکتے لہٰذا مرزا صاحب کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے واللہ الموفق۔

تذییل و تتمہ:-

اب ذیل میں بطور تتمہ کے ان کتابوں کا نام لکھا جاتا ہے۔ جن میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے۔ کہ واو عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں بلکہ مطلق جمع کے لئے آتی ہے' یہ اس لئے کہ اگر بالفرض توفی سے مراد موت بھی لی جائے تو بھی رفع و نزول سے پیشتر حضرت عیسیٰ کی موت کا واقع ہونا ثابت نہیں ہو سکتا' بلکہ واقعات کی صورت یوں ہو گی کہ پہلے رفع آسمانی ہوئی۔ پھر قرب قیامت میں نزول ہو گا۔ پھر

[1] اس کی مزید تفصیل شہادت القرآن حصہ دوم میں ص ۳۰۹ سے ۳۱۲ تک دیکھو۔ ۱۲

اس کے چند سال بعد وفات ہوگی [1] جیسا کہ ابن عباسؓ ضحاک اور ائمہ مفسرین کا مذہب ہے کیونکہ آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ رفع آسانی میں نص قطعی ہے کَمَا سَيَجِيءُ بَيَانُهٗ ان شاء اللہ اور مجموع احادیث نزول جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول اور ان کے بعض کام اور حج وعمرہ اور مدت اقامت اور وفات اور مدفن کا ذکر ہے اسی ترتیب کو چاہتی ہیں چنانچہ محدث ابن جریر توفی کی مختلف صورتیں نقل کرنے کے بعد بطور فیصلہ لکھتے ہیں۔

قال ابو جعفر و اولٰى هذه الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنى ذلك انى قابضك من الارض و رافعك الىّ لتواتر الاخبار عن رسول الله صلّى الله عليه وسلّم انه قال ينزل عيسى بن مريم فيقتل الدجال ثم يمكث في الارض مدة ذكرها اختلف الروايات في مبلغها ثم يموت فيصلى عليه المسلمون ويد فنونهٗ (جلد سوم ص ۱۸۴)

ابوجعفر (محدث ابن جریر) کہتا ہے کہ ان سب اقوال میں سے ہمارے نزدیک اولیٰ بصحت ان کا قول ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تجھے زمین سے لے لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں کیونکہ آنحضرت ﷺ سے متواتر حدیثیں مروی ہیں کہ آپؐ نے

---

[1] اکمل صاحب بڑے مزے کی باتیں بناتے ہیں۔ چنانچہ آپ عنوان آیت ''انی متوفیک'' کی ترتیب کی حکمت میں فرماتے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چونکہ یہ خیال تھا کہ مشابہ بالمصلوب کی حالت پیش آنے سے فائدہ اٹھا کر یہود میری لعنتی موت کی خبر اڑا دیں گے۔ تو اس کے جواب میں فرمایا میں تجھے کفار کے الزام سے پاک رکھوں گا۔ (ص ۳۱) جواب سبحان اللہ جناب والا: صلیب سے قبل حضرت عیسیٰ کو کیا معلوم تھا کہ مجھے نیم جان اتارا جائے گا اور یہ پروپیگنڈا بنایا جائے گا اکمل صاحب تو اس طرح لکھتے ہیں کہ گویا آپ موقع پر موجود تھے بلکہ شریک کار تھے لیکن لطف یہ ہے کہ بات ایسی بکی ہوئی کہتے ہیں کہ موقع پر چسپاں ہی نہیں ہو سکتی۔'' سچ ہے تعصب سے عقل بھی ماری جاتی ہے۔ ۱۲ سعادت الاقران۔ منہ

فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم اتریں گے۔ اور دجال کو قتل کریں گے۔ پھر زمین میں اتنی مدت رہیں گے جو آپ نے ذکر کی اور اس کی تحدید میں مختلف روایتیں ہیں پھر مریں گے اور مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے اور ان کو دفن کریں[1] گے۔''

اس کے بعد امام ممدوح نے بعض احادیثِ نزول ذکر کی ہیں جن کی بنا پر انہوں نے فیصلہ بالا دیا ہے۔

اب ہر فن کی کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔ جن میں لکھا ہے کہ واؤ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی۔

علم نحو:۔

کافیہ۔ شرح جامی۔ رضی شرح کافیہ۔ زینی زادہ۔ ترتیب سعیدی۔ تکملہ مولٰنا عبدالحکیم سیالکوٹی۔ الفیہ ابن مالک۔ حاشیہ الفیہ۔ شرح الفیہ لابن عقیل۔ مفصل للزمخشری۔ الفیہ للسیوطی۔

علم اصول:۔

حصول المامول۔ ارشاد الفحول۔ اصول شاشی۔ حواشی۔ حسامی۔ نور الانوار۔ کاشف۔ اسرار اصول بزدوی۔ آیات بنیات۔ شرح جمع الجوامع۔ منہاج للبیضاوی۔ شرح الاسنوی۔ مسلم الثبوت۔ فواتح الرحموت۔ توضیح تلویح حاشیہ للفنری۔ تحریر لابن الہمام۔ تقریر لابن امیر الحاج۔

علم بلاغت:۔

مختصر المعانی۔ مواہب المفتاح۔ عروس الافراح۔ نہایۃ۔ الایجاز

---

[1] مشکوٰۃ میں باب نزول عیسیٰ علیہ السلام میں عبداللہ بن عمرو کی روایت میں مرفوعاً مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (مدینہ طیبہ) داخل حجرہ نبویہ ﷺ مدفون ہوں گے۔ اس کا پورا بیان ہم نے رسالۃ الحجۃ الصحیح عن قبر المسیح علیہ السلام میں کر دیا ہے۔ ۱۲ منہ

للامام الرازیؒ۔

علم ادب:۔

شرح سبعہ معلقہ' قصیدہ لبید بن ربیعہ میں مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سہارنپوری جو ہندیوں میں زبانِ عربی کے ماہر ادیب مانے گئے ہیں۔ اس کی تصریح فرماتے ہیں' شعر یہ ہے۔

أغلي السباء بكل أدكن عاتق أو جونة قدحت و فض ختامها

اس شعر میں شراب کا نکالنا پہلے مذکور ہوا اور ڈاٹ کا کھولنا پیچھے حالانکہ ترتیب واقعی و عملی میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی بوتل کا ڈاٹ پہلے کھولا جاتا ہے اور شراب یا جو کچھ بوتل کے اندر ہو پیچھے نکالا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم سورہ نحل میں فرمایا:۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(نحل پ۱۴)(۱۶:۷۸)

''اور خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں خارج کیا تھا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم شکر کرو۔''

اس آیت میں ماں کے پیٹ سے نکالنا پہلے ذکر کیا گیا ہے اور دل اور آنکھ اور کان کا بنانا پیچھے' لیکن ترتیب واقعی میں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی اعضا پہلے بنتے ہیں اور بہت مدت بعد از آں بچہ پیٹ سے خارج ہوتا ہے۔

(۲) سورہ بقرہ پ ۱ میں ہے وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ یعنی ''خدائے تعالیٰ نے یہودیوں کو حکم کیا کہ دروازہ شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور (زبان سے) کہنا بخشش۔'' (۲:۵۸)

اسی مضمون کو سورۂ اعراف پ ۹ میں یوں بیان کیا ہے وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ

وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (۷:۱۶۱) اس جگہ اوپر کے مقام کی ترتیب کے خلاف کلمہ حِطَّۃٌ کا کہنا پہلے ذکر کیا اور شہر کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا ذکر پیچھے کیا' حالانکہ واقعہ ایک ہی ہے۔

چنانچہ شرح رضی میں اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ

ولو كانت للترتيب لناقض قوله تعالى وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ قَوْلَهٗ في موضع اخرىٰ وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اِذًا الْقِصَّةُ وَاحِدَةٌ.

(رضی شرح کافیہ ص۵۰۳)

''اگر واؤ ترتیب کے لئے ہو تو اللہ کا قول وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا الخ اس قول کو جو دوسری جگہ بالفاظ وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ وارد ہے۔ توڑ دیوے' کیونکہ ہر (دو آیات میں) قصہ ایک ہی ہے۔''[1]

(۳) سورۂ مومنون پ ۱۸ میں فرمایا کہ منکرین قیامت کہتے ہیں۔

نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ.

یعنی ہم مرتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں اور (اس کے بعد) ہم (دوسری دفعہ) زندہ نہیں کئے جائیں گے۔ (۲۳:۳۷)

اس جگہ مرنے کو پہلے ذکر کیا اور زندہ رہنے کو پیچھے' حالانکہ ترتیب خارجی میں پہلے ''جینا'' ہوتا ہے پیچھے ''مرنا۔'' علامہ رضی اس آیت کو بھی واؤ عاطفہ کے ترتیب کے لئے نہ ہونے پر شاہد لائے ہیں' قرآن شریف میں اس کی مثالیں اس قدر ہیں کہ ان کے نقل کرنے سے خوف طوالت ہے۔

غرض جمہور ائمہ نحو و اصول کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ واؤ عاطفہ ترتیب کے لئے نہیں ہوتی اور نیز یہ کہ ترتیب ذکری اور ترتیب خارجی یا وقوعی وعملی میں

---

[1] واو عاطفہ کے مفید ترتیب نہ ہونے کے متعلق علامہ قنری نے بھی حاشیہ توضیح میں انہی دو آیتوں کو ذکر کر کے پھر ان پر یہی نوٹ لکھا ہے' جو علامہ رضی نے لکھا ہے۔ ۱۲ سعادت الاقران منہ

مطابقت ضروری نہیں۔

پس جب اس قدر شواہد و اسناد سے یہ مسئلہ پایۂ یقین کو پہنچ گیا تو حضرت ابن عباسؓ کا مذہب کہ آیت إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ میں تقدیم و تاخیر ہے' خلاف محاورۂ زبان عرب نہ ہوا۔

فالحمدللہ معلم الحقائق وملھم الدقائق و معطی الخیرات من معادنھا و مُنزل الرحمۃ من اماکنھا و مجری البرکات علی اھلھا۔

(ترجمہ) پس سب تعریف خدا کو ہے' جو سچے امور کا سکھانے والا اور باریک امور کا الہام کرنے والا' اور نیکیوں کا ان کی معدنوں سے عطا کرنے والا اور رحمت کا اس کی جگہ سے نازل کرنے والا اور برکات کا ان کے اہل پر جاری رکھنے والا ہے۔

دوسری آیت جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور رفع آسمانی قطعی طور پر ثابت ہے۔ آیت سورہ نساء ہے۔

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا. (نساء پ٦)(٤:١٥٧)

"اور ہم نے ان کو اس قول کے بدلے (بھی ملعون کیا) کہ ہم نے مسیح عیسیٰ علیہ السلام بن مریم رسول خدا کو قتل کر دیا۔ حالانکہ انہوں نے اس کو نہ قتل کیا اور نہ اس کو صلیب پر چڑھایا لیکن (انہوں نے) اس شخص کو قتل کیا اور صلیب دیا جو ان کے لئے مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنایا گیا تھا۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا (یعنی نصاریٰ) البتہ وہ اس سے شک میں پڑے ہیں۔ ان کو اس کا کوئی بھی علم نہیں

سوائے ظن کی پیروی کے۔ اور انہوں نے اس کو ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔
بلکہ خدا نے اس کو اوپر اپنی طرف اٹھالیا اور خدا غالب اور حکمت والا ہے۔"

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ کی تفسیر ص ۱۲۶ میں اور وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ کی تشریح ص ۱۰۱ سے ص ۱۰۴ تک اور وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی توضیح و تنقیح ص ۱۰۵ سے ص ۱۱۹ تک بہ بسط بیان ہو چکی اور حوالہ جارج سیل صاحب جو ص ۱۱۸ پر منقول ہو چکا۔ اس سے ظاہر ہو چکا کہ حضرت روح اللہ تعالیٰ کے واقعہ صلیبی کی نسبت صرف فرقِ نصاریٰ ہی مختلف الآرا ہیں۔ لہٰذا اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ سے یہی نصاریٰ مراد ہیں دون الیھود. کیونکہ یہود تو اپنے زعم میں قتل حضرت روح اللہ تعالیٰ پر جزم رکھتے ہیں۔ کما ھو واضح من قولہ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ اور ص ۱۲۹ میں گزر چکا کہ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِيْنًا سے یہود کے اس جزم مزعوم کا ابطال اور اس کی تردید منظور ہے فَلَا تَكْرَارَ حِيْنَئِذٍ (پس اس صورت میں اس میں کوئی تکرار نہیں)۔

اب کلمات طیبات بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی صحیح مراد بیان کی جاتی ہے۔ کہ یہ آیت متبرکہ دربارۂ حیات و رفعِ مسیح علیہ السلام الی السماء نص قطعی بعبارۃ النص ہے۔ سو واضح ہو کہ مرزا صاحب قادیانی کا یہ قول ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے تو گئے مگر زندہ اتارے گئے اور پھر خفیہ طور پر علاج کراتے رہے اور بعد ازاں بھاگ کر کشمیر میں آ گئے۔ جہاں ستاسی سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ اعاذنا اللّٰہ مِنْ هٰذِهِ الْخُرَافَاتِ۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے کبھی رفع روح بتاتے ہیں اور کبھی عزت کی موت مراد رکھتے ہیں مرزا صاحب کی صلیب تو فصل اول سے بالکل منکسر ہو گئی اور معنی کنائی کی تردید الفک اِلَيَّ میں بالاستیفا ہو چکی۔ اور ہجرت الی کشمیر کی تردید ابھی آگے مذکور ہو گی۔ ان شاء اللہ۔

چونکہ مرزا صاحب قادیانی رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے رفع روح مراد لیتے ہیں اور

اہل السنت والجماعت سلفاً وخلفاً مطابق مراد الٰہی رفع جسم پر یقین رکھتے ہیں اس لئے بہر دو صورت رفع کے معنی تو تحقیق ہی لئے گئے اور نیز چونکہ مرزا صاحب بھی رفع روح الی اللہ کی صورت رفع الی السماء ہی بتاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب ازالۂ اوہام میں اس آیت کے ذیل میں بالتصریح لکھا ہے[1] اور اہلسنت بھی رفع الی اللہ اور رفع الی السماء کو متساوق فی المعنی جانتے ہیں جیسا کہ رَافِعُکَ اِلَیَّ میں محقق ہو چکا ہے اس لئے اِلَیْهِ سے الی السماء مراد[2] ہونا بھی مسلم فریقین ہو گیا۔ پس تنازع صرف جسم و روح کے مرفوع ہونے میں رہا اور بس لہٰذا رفع روح کا ابطال اور رفع جسم کا اثبات مدلل طور پر کیا جاتا ہے وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ نِعْمَ الْمُعِيْنُ۔

وجہ اوّل برائے ابطال رفع روحی و اثبات رفع جسمی:

چونکہ یہودیوں کا قول اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ ہے اور ظاہر ہے کہ قتل و صلب کے قابل جسم ہے نہ روح۔ اس لئے مزعوم یہود قتل جسد ہوا نہ قتل روح' بنا بر آں وَمَا صَلَبُوْهُ اور وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا میں بھی نفی قتل و صلب جسم ہی سے کی گئی ہے پس چونکہ جملہ ضمائر منصوب و متصل جو افعال منفیہ و فعل مثبت کے ساتھ ہیں یعنی جو

---

[1] اکمل صاحب شاید قرآن کی بھی ترمیم کر ڈالیں گے (معاذ اللہ) آپ رفع الی اللہ اور رفع الی السماء کے تساوق کو نہ سمجھ کر فرماتے ہیں "ایسا کہنا خداوند کریم کو مکانی بتانا ہے جو کفر ہے" (ص ۳۶) جواب: جناب عالی! پھر أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ (ملک پ ۲۰) وغیرہ آیات میں کیا فرمائیں گے کیا قرآن بھی کفر سکھاتا ہے بیٹے! خداوند کریم کے لئے جہت فوق کی طرف ماننا تقاضائے فطرت ہے لیکن اسے کسی" جہت میں" ماننا اور ہے اور یہی کفر ہے۔ ۱۲ سعادت۔

[2] اکمل صاحب بے سمجھی میں بھی کامل ہیں فرماتے ہیں "رفع روح الی اللہ کو رفع الی السما بنانے سے یہ مطلب ہے کہ روح کی رفع الی اللہ ہو تو وہ عند اللہ عند الملائکہ فی السما چلا جاتا ہے نہ یہ کہ رفع الی اللہ اور الی السماء کے معنی ایک ہیں" (ص ۳۶) جواب جناب والا! بات تو پھر بھی وہی رہی کہ روح خدا کے پاس آسمان پر چلی گئی بس یہی تو مقصود تھا کہ مرزا صاحب بھی روح آسمان پر جانا مانتے ہیں حالانکہ آسمان کا لفظ موجود نہیں آپ نے بھی اسے بحال رکھا ہاں کمال یہ کیا کہ تسلیم کر کے مکر گئے مان کر مکر جانا اسے ہی کہتے ہیں۔ ۱۲ سعادت۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اور وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں واقع ہیں۔ ان سب کا مرجع المسیح علیہ السلام ہے اس لئے لامحالہ جسد مسیح علیہ السلام مرفوع ماننا پڑے گا۔ بنا بر اتحاد مرجع۔ اور پھر چونکہ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں رفع کو بصیغہ ماضی تعبیر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ زمانہ کی ماضویت و استقبال اضافی امور سے ہے ذاتی نہیں۔ یعنی ایک ہی زمانہ بہ نسبت ایک کے ماضی ہوسکتا ہے اور بہ نسبت دوسرے کے استقبال۔ اس لئے رفع کی ماضویت بھی کسی کی نسبت سے ہوگی اور وہ ماقبل بل ہے یعنی واقعہ صلیبی[1] جس طرح کہ آیات ذیل سے ظاہر ہے۔

(۱) اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ (پ ۱۸ مومنون)

''کیا یہ کفار کہتے ہیں کہ اسے (پیغمبر ﷺ کو) جنون ہے۔ نہیں بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا ہے۔'' (۲۳:۷۰)

اور آیت

(۲) وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ (صافات پ ۲۳)

''اور یہ (دوزخی) کہتے تھے کہ کیا ہم اس شاعر مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں (ہمارا پیغمبر شاعر و مجنون نہیں) بلکہ وہ تو حق لے کر آیا۔'' (۳۷:۳۶)

واقعہ میں مجئ بالحق کا تحقق پہلے ہوا۔ بعد ازاں ان کفار بدکردار نے آپ ﷺ کی نسبت زعم جنون کیا۔ اور آیت

---

[1] اکمل صاحب میں خاص کمال یہ ہے کہ بات تسلیم کر کے بھی سرکھسکا جاتے ہیں چنانچہ ص ۳۶ پر لکھتے ہیں رفع کی ماضویت آپ نے پوچھی وہ واقعہ صلیبی کی نسبت۔ ہی سہی تو معنی یہ ہوئے کہ واقعہ صلیبی سے پہلے ہی حضرت مسیح علیہ السلام مرفوع الشان عنداللہ تھے جواب۔ اکمل صاحب نے بڑا کمال دکھلانا چاہا تھا لیکن افسوس بات نہ بن سکی کیونکہ مرزا صاحب کا ساختہ پرداختہ سب برباد ہوگیا۔ یعنی رفع الی اللہ سے مراد عزت کی موت ہے۔ ۱۲ سعادت منہ

(۳) وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ.

(پ ۱۷ انبیاء)

"اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی وہ پاک ہے بلکہ (وہ تو) اس کے معزز بندے ہیں"

واقعہ میں تکریم بعض عباد اللہ کا تحقق پہلے ہوا۔ پیچھے مشرکین نے ان کی نسبت زعم الوہیت کیا۔ اسی طرح بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں بھی یہی ملحوظ ہے کہ ماقبل بَلْ یعنی واقعۂ صلیبی پر زعم یہود بہ نسبت مسیح علیہ السلام پیچھے ہوا اور اس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے آپ کے جسد مبارک کو مرفوع الی السماء کر لیا تھا اور چونکہ واقعۂ صلیبی کے پیشتر حیات مسیح علیہ السلام عندالخصم بھی مسلم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے جسد حضرت روح اللہ کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور یہود کے ہاتھ میں ہرگز نہ آنے دیا۔ اور یہی امتنان باری آیہ وانی ہدایہ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ میں مذکور ہے۔ اور یہی تھا وعدۂ الٰہی وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا "یعنی میں تجھ کو کفار سے بالکل پاک رکھوں گا۔"

نیز اس لئے کہ چونکہ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں ہر دو منصوب متصل ضمیریں اسی مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہیں اور اسی مسیح علیہ السلام معتبر ہے جسد مع روح سے اس لئے صرف اسی ضمیر سے رفع جسد مع روح ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ ارواح مجردہ بغیر تعلق بالبدن کے قابل تسمیہ نہیں ہوتے اور نہ جسم بے روح حامل اسم ہوتا ہے۔

شق اوّل:۔

(یعنی مجرد ارواح کا نام نہ رکھا جاتا) آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (پ ۹ اعراف) (علی قول) اور باب صحیح بخاری اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ سے ثابت ہے جس سے معلوم ہوا کہ خلق ارواح کا تحقق خلق اجسام سے متقدم ہے اور اس حالت میں ان کے نام نہیں ہوتے۔

شق ثانی :-

(یعنی مجرد جسم کا نام نہ رکھا جانا) مسئلہ فقہیہ عدم تسمیہ جسمی درصورت غیر مستعمل ہونے سے ظاہر ہے۔

پس واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے المسیح یعنی جسم مع روح کو جس کا نام المسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم تھا آسمان کی طرف اٹھا لیا اور یہ امر بشارت حضرت مریم صفیہ اللہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علی لسان الملائکہ فرمایا یَا مَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ (پ۳ ال عمران) (۳:۴۴) اس سے واضح ہو گیا کہ مسمّٰی باسم مسیح عیسیٰ بن مریم ہونا بعد تحقق اثر کلمہ کن کے ہے۔ اور وہ کیا ہے؟ ولادت مسیح فَثَبَتَ الْمُرَادُ فالحمدللّٰہ اور ایسا ہی اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ اسْمُہُ یَحْیٰی (پ۱۶ مریم۔۱۹:۷) سے ظاہر ہے فافہم و تدبّر و تامّل ولا تَعْجَلْ۔

وجہ ثانی برائے ابطال مزعوم قادیانی

آیت بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ میں قتل و صلب کی نفی کے بعد اثبات رفع بواسطہ حرف بل کیا گیا ہے اور ماہرین علم اصول و نحو پر روشن ہے کہ بَلْ ابطالیہ کے اطراف متضاد فی الحکم ہوتے ہیں اور باہم متحقق نہیں ہو سکتے کیونکہ اجتماع ضدین عقلاً محال ہے۔ جیسا کہ آیات مذکورہ ذیل سے واضح ولائح ہے۔

الآیہ الاولی. وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحَانَہٗ بَلْ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. (پ البقرہ)(۲:۱۱۶)

"اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدا نے فرزند اختیار کیا۔ وہ پاک ہے بلکہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملک ہے۔"

الآیۃ الثانیہ. وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ.

(پ۱۷ انبیاء۔۲۱:۲۶)

"اور یہ (مشرک) کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے فرزند اختیار کیا۔ وہ اس سے پاک ہے' بلکہ وہ تو اس کے معزز بندے ہیں۔"

ان آیتوں میں ولدیت وعبودیت میں کلمہ "بل" سے تضاد وتنافی ظاہر کر کے تنزیہہ باری سبحانہ از اتخاذ ولد کی گئی ہے۔

الآیۃ الثالثۃ. اَمْ یَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ.

(پ ۱۸ مومنون)

"کیا یہ (منکر) کہتے ہیں کہ اسے (یعنی ہمارے پیغمبرؐ) کو جنون ہے (نہیں) بلکہ وہ تو ان کے پاس حق لے کر آیا ہے"۔ (۲۳:۷۰)

الآیۃ الرابعۃ. وَ یَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ. (پ۲۳ صافات۔۳۷:۳۶و۳۷)

"اور یہ (دوزخی) کہتے تھے کہ کیا ہم اس شاعر مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں (ہمارا پیغمبر شاعر ومجنون نہیں) بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا اور دیگر رسولوں کی تصدیق کی۔"

ان آیتوں میں کلمہ "بَلْ" سے رسول اللہ ﷺ سے نسبت مجنونیت و شاعریت کا ابطال اور آپ کے مجئ بالحق وتصدیق المرسلین کا اثبات کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں اور دیگر مرسلین علیہم السلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ تو پھر آپ کی طرف نسبت مجنونیت وشاعریت بالکل باطل ٹھہری۔ اگر کلمہ بَلْ کو افادۂ مذکور کے لئے مفید تسلیم نہ کیا جائے۔ تو معاذ اللہ پھر تقریب ناتمام رہتی ہے۔ پس آیت معنونہ میں بھی ماقبل بَلْ یعنی مقتولیت و مصلوبیت اور مابعد بَلْ یعنی مرفوعیت میں منافات وعدم اجتماع فی التحقق پایا جانا چاہیے۔ اگر رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ سے مراد رفع روح یا اعزاز واکرام لیا جاوے تو ناقد لبیب پر اس کا بطلان ظاہر ہے کیونکہ مابین مقتولیت ومصلوبیت اور رفع روح و اعزاز واکرام کے اصلاً منافات نہیں کیونکہ شہداء جو ظلماً مقتول ہوتے ہیں ان کے

ارواح عالم بالا کو مرفوع ہوتے ہیں۔ اور وہ جناب باری عزاسمہ میں بعنایت معظم و مکرم بھی ہوتے ہیں۔ پس بمقتضائے کلمہ بل ارادۂ رفع روح باطل ٹھہرا اور چونکہ مقتولیت و مصلوبیت اور رفع جسمی بحالت زندگی میں منافاۃ ہے۔ اور ہر دو معاً متحقق نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا لابد ارادۂ رفع جسمی تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جب زندہ جسم مرفوع الی السمآء ہو گیا۔ تو پھر اس کو صلیب پر نہیں چڑھا سکتے۔

سوال مرزا صاحب قادیانی مقتولیتِ مسیح علیہ السلام کے قائل نہیں۔ لہٰذا تقریب بالا ان کے مذہب کے خلاف مؤثر نہیں۔ اور نیز بموجب ان کے مذہب کے مابعد بَلْ یعنی رفع جو کنایہ ہے اعزاز و اکرام سے اس میں اور ماقبل بَلْ یعنی قتل بالصلیب میں جو بحکم تورات مستلزم لعن ہے تنافی و تضاد متصور ہے۔ کیونکہ ملعون عنداللہ معزز نہیں ہو سکتا۔

اما الجواب عن الشق الاوّل: پس واضح ہو کہ تقریر بالا گو ردّا بزعم الیہود ہے کیونکہ وہی بالجزم اس کے خلاف کہتے تھے مگر اس میں من وجہ قادیانی کے اعتقادِ فاسد کا ابطال و استیصال بھی بکمال وضوح عیاں ہے اگرچہ انہوں نے یہودیت و نصرانیت کے رنگ میں ایک الگ مسلک اختیار کیا ہے۔ وہ مسلک یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر تو چڑھائے گئے۔ مگر اس سے مرے نہیں۔[1]

---

[1] اکمل صاحب اسے تسلیم تو کرتے ہیں' لیکن فرماتے ہیں'' اس بروز محمدیہ (چشم بددور مرزا صاحب) نے دو قوموں میں بطور حکم فیصلہ کر دیا۔ ایک گروہ قائل تھا کہ صلیب پر چڑھائے گئے اور قتل ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ نہ قتل ہوئے نہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ آپ (مرزا صاحب) نے فرمایا صلیب پر چڑھائے تو گئے۔ مگر قتل نہیں ہوئے۔'' (ص ۳۶) جواب: اکمل صاحب بقول شاعر الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں + لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ اپنی تحریر سے آپ ہی پھنس گئے۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ وہ ایک گروہ کی نسبت تو فرماتے ہیں کہ وہ حضرت مسیح کی نسبت قتل و صلیب ہر دو کا قائل۔ لیکن دوسرے کی نسبت فرماتے ہیں کہ وہ ہر دو سے منکر تھا' سو معلوم ہے کہ پہلے قول کے قائل یہود و نصاریٰ ہیں اور قادیانی علماء اس واقعہ

تفصیل اس کی یوں ہے کہ مضمونِ کسر صلیب میں محقق ہو چکا ہے کہ صلیب کے معنی صرف سولی پر لٹکانے کے ہیں۔ پس چونکہ مرزا صاحب مصلوبیتِ حضرت مسیح کے قائل ہیں۔ اس لئے تقریب بالا سے ان کے مذہب کا بھی ابطال ہوا۔ کیونکہ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں ابطال مصلوبیت بھی ملحوظ ہے۔ بوجہ بَلْ[1] کے قبل مذکور

---

[1] کے تواتر کے ثبوت میں یہی دلیل پیش کیا کرتے ہیں' چنانچہ ص ۱۱۷ پر مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی احمدی کا قول مع تردید گزر چکا۔

"اب دریافت طلب یہ ہے کہ دوسرا گروہ جو قتل وصلیب میں سے کسی بات کا بھی قائل نہیں وہ کون سا ہے۔"

ماننا پڑے گا کہ وہ دوسرا گروہ مسلمانوں کا ہے جو بحکم مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ حضرت مسیح علیہ السلام کو ہر دو سے بری و محفوظ مانتے ہیں' پس اکمل صاحب نے تسلیم کر لیا کہ مرزا صاحب قادیانی سے پیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے مقتول نہ ہونے اور صلیب پر بھی نہ چڑھائے جانے" پر امت مرحومہ کا اجماع ہو چکا تھا۔ لہٰذا مرزا صاحب کا یہ قول کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھائے گئے اجماع امت کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ٹھہرا۔ صاحبان! آپ اسی کتاب کے ص ۹۵ پر میرے اشتہار بنام مرزا صاحب پر ایک نظر پھر ڈالیں۔ جہاں لکھا ہے۔

"جناب مرزا صاحب! بندہ (محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) "جمیع اہل سنت والجماعت سلف وخلف" کی طرح اس بات کا قائل ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر نہیں چڑھائے گئے۔ اور اب تک فوت بھی نہیں ہوئے۔" (ص ۹۹)

الحمد للہ کہ اب ہمارے اکمل صاحب نے بھی خود ہی مان لیا کہ مرزا صاحب سے پیشتر مسلمانوں کا یہی اعتقاد تھا۔ شکر اللہ کہ میانِ من او صلح فتاد' ہم اکمل صاحب کو اس تسلیم حق پر مبارکباد دیتے ہیں۔

دیگر: یہ کہ یہ بھی بالکل صاف ہو گیا کہ چونکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل وصلب ہر دو کے قائل تھے۔ اس لئے خدائے تعالیٰ نے ہر دو امر کی تردید کرنے کے لئے فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ یعنی نہ تو انہوں نے مسیح رسولِ خدا کو قتل کیا اور نہ سولی دیا۔ ۱۲ سعادت منہ

[1] کلمہ بل کے استعمال کی تحقیق و تدقیق نے اکمل صاحب کے سارے بل پیچ نکل گئے۔ اور انہوں نے بلاتردد اسے تسلیم کر لیا۔ چنانچہ میری عبارت نقل کر کے تصدیق فرماتے ہیں:-

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں ابطال مصلوبیت بھی ملحوظ ہے" بیشک" (ص ۳۷) [1]

ہونے کے۔

چنانچہ تفسیر خازن میں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

والمعنی انهم لم یقتلوا عیسٰی و لم یصلبوه ولکن الله عزوجل رَّفَعَهُ اِلَیْهِ. (خازن ص۴۲۰)

''اس کے معنی یہ ہیں کہ یہود نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہ تو قتل کیا اور نہ اسے صلیب دیا بلکہ اس کو خدائے عزوجل نے اپنی طرف (اوپر کو) اٹھالیا۔''

اور شق ثانی کے جواب میں اول تو یہ معروض ہے کہ کتب محرفہ سے استدلال و تمسک کرنا اور بیان قرآنی میں تحریف کرنا سب سے زیادہ موجب لعن ہے۔ جو توریت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ وہ تو صفحہ دنیا پر نظر نہیں آتی ہے اور اس کا کہیں بھی پتہ نہیں ملتا۔ جو پانچ کتابیں بنام توریت مجموعہ بائبل کے ابتدا میں منضم ہیں۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ کسی مورخ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بہت دیر بعد وقائع و شرائع موسویہ کو تاریخی طور پر جمع کیا جیسا کہ اس کی اندرونی شہادات سے ثابت ہے۔ مثلاً کتاب استثناء باب اخیر واقعہ وفات حضرت کلیم اللہ اور اسی طرح کئی دیگر مواضع[1]

دیگر یہ کہ توریت اور انجیل شریف اور قرآن عظیم غرض جملہ کتب سماویہ میں

ف لیکن اس کے بعد پھر مکرنے کی راہ نکالتے ہیں اور لکھتے ہیں:۔

''مگر مصلوبیت کے معنی صلیب پر موت واقع ہونے کے ہیں۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ لَاُصَلِّبَنَّکُمْ اور اَوْ یُصَلَّبُوْا میں بھی صرف صلیب پر چڑھانا مراد ہے۔'' (ص ۳۷) جواب جناب والا! مصلوب کی تحقیق سابقاً مولوی مبارک علی صاحب کے جواب باصواب کی تردید میں مفصل گذر چکی۔ اس سے عشوہ نمائی کیوں کی دیکھئے کتاب ہذا ص ۱۰۱ سے ص۱۴۵ تک اور جو آیات آپ نے لکھی ہیں۔ ان میں بھی وہی تحقیق ملحوظ ہے۔ فارجع البصر الآیۃ۔ ۱۲ سعادت منہ۔

[1] مرزا صاحب قادیانی نے اپنی آخری کتاب چشمۂ معرفت ص ۲۵۵ میں خود ان کتابوں کو لچر پوچ اور محرف مبدل لکھا ہے۔ ۱۲ منہ

اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے کہ شہداء بمراتب عالیہ فائز ہوں گے۔ چنانچہ سورۂ توبہ پ ۱۱ میں فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ. الآية

''بیشک خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں تو (کبھی تو فریق مقابل کو) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) خود قتل ہو جاتے ہیں خدا نے حق وعدہ کیا ہے تورایت میں بھی اور انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔'' (۹:۱۱۱)

دیگر یہ کہ توریت موجودہ میں بھی مطلقاً قتل بالصلیب کو مستلزم لعن قرار نہیں دیا گیا۔ بلکہ خاص اسی شخص کو ملعون کہا گیا ہے جو کسی سخت جرم واجب الصلیب کی سزا میں مصلوب ہو جیسا کہ سیاق وسباق بلکہ صریح عبارت سے ظاہر ہے۔

(۲۲) ''اور اگر کسی نے کچھ ایسا گناہ[1] کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو اور وہ مارا جائے۔ اور تو اسے درخت میں لٹکا دے (۲۳) تو اس کی لاش رات بھر لٹکی نہ رہے۔ بلکہ تو اسی دن اسے گاڑ دے کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے۔ اس لئے چاہئے کہ تیری زمین جس کا وارث خداوند تیرا خدا تجھ کو کرتا ہے ناپاک نہ کی جاوے۔'' (استثناء باب ۲۱)

مزید برآں ظاہر ہے کہ کافر مجرم کا مقتول بالصلیب ہونا ہی موجب لعن نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شریعت حقہ کے حکم سے کسی اور طریق سے بھی قتل کیا جائے یا سزا دیا

---

[1] خدا جانے اکمل صاحب بات کے نہ سمجھنے میں نہایت کمال رکھنے کے سبب اکمل ہیں یا نہ ماننے کے سبب' عبارت میں تو صاف لکھا ہے کہ اگر کسی نے کچھ ایسا گناہ کیا ہو جس سے اس کا قتل واجب ہو' پھر بھی ہمارے اکمل صاحب (زید کمالہ فی الانکار) فرماتے ہیں ''توراۃ کی آیات میں پہلے مجرم کا بیان ہو یا نہ ہو' لخ ص ۸۹ ہر ین اکملیت بباید گریست۔ ۱۲ سعادت القرآن۔ منہ

جائے۔ تو پھر بھی وہ زمرۂ مردودین میں معدود ہوگا۔ جیسا کہ آیت مائدہ سے ثابت ہے:-

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (پ۶ مائدہ)

''سوائے اس کے نہیں کہ ان لوگوں کی جزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ ان کو خوب قتل کیا جائے یا صلیب پر لٹکایا جائے۔ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے کاٹ دیئے جائیں۔ یا ان کو جلا وطن کیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں خواری ہے۔ اور آخرت میں ان کو بڑا عذاب ہوگا''۔ (۵:۳۳)

اور یہ بھی یاد رہے کہ مومن عاصی کے لئے حدود کفارہ ہوتی ہیں جیسا کہ حدیث صحیح بخاری سے ثابت ہے۔

پس اس بیان سے واضح ہو گیا کہ عند اللہ ملعون و غیر ملعون اور مردود و مقبول ہونا مادۂ صلاح و فساد کے سبب ہے نہ قتل و صلب کے سبب۔

پس جب ثابت ہو چکا کہ توریت موجودہ میں بھی مطلقاً مقتولیت بالصلیب کو موجب لعن قرار نہیں دیا گیا بلکہ وہ حکم مجرم فی الواقع کی نسبت ہے۔ تو چونکہ حضرت روح اللہ فی الواقع غیر مجرم تھے۔ لہٰذا بنا بر واقعہ ما قبل بل یعنی قتل بالصلیب اور ما بعد بل یعنی رفع اعزازی میں تنافی و تضاد متحقق نہ ہوا۔ بلکہ مومن جو ظلماً مقتول ہو وہ عند اللہ معزز ہوتا ہے۔ پس تقریب کلمہ بل بعد ابطال تاویل قادیانی رفع جسمی میں محکم رہی۔

اور اگر مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ بزعم یہود مجرم خیال کر کے تنافی پیدا کی جائے۔ تو ماہر ذکی پر ظاہر ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ قصر قلب ہے

. س میں مزعوم مخاطب کو برعکس ما یذکرہ المتکلم ظاہر کر کے رد کیا جاتا ہے اور چونکہ صورت اعتراضیہ میں بحسب علم المتکلم بھی وصف مزعوم مخاطب کا وجود متصور ہے و ہذا خلف۔لہٰذا قول قائل باطل ہوا۔فافہم۔

ثانیاً یہ کہ ص ۲۰۷ میں بوضوح محقق ہو چکا ہے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ میں نفی قتل وصلب مقصور علی المفعول ہے یعنی قتل وصلب کی نفی صرف بہ نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کی گئی ہے۔دُوْنَ غَيْرِهٖ بلکہ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے وہی قتل وصلب غیر مسیح علیہ السلام کے لئے ثابت کیا گیا ہے اور نیز ص ۱۲۵ میں مذکور ہو چکا ہے کہ مفعول قَتَلْنَا یعنی اَلْمَسِيْحَ کو موصوف رَسُوْلَ اللّٰهِ ذکر کرنا بنا بر اظہار مفاخرت یہود ہے جو قصر مذکور کے لئے مؤید قوی ہے پس ماہر ذکی پر ظاہر ہو سکتا ہے کہ کلام الٰہی وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ جو کلام قصری ہے وہ مِنْ بَابِ الْقَصْرِ الْمَوْصُوْفِ عَلَى الصِّفَةِ ہے وَهُوَ اَنْ لَا يَتَجَاوَزَ الْمَوْصُوْفُ تِلْكَ الصِّفَةَ اُخْرٰى اور پھر قصر قلب ہے لِوُجُوْدِ مُوْجِبِهٖ وَلَيْسَ قَصْرَ اَفْرَادٍ وَلَا تَعْيِيْنٍ لِفُقْدَانِ مُوْجِبًا بِهِمَا اور پھر قصر کے طرق اربعہ مشہورہ میں سے قصر بالعطف ہے۔لِاَنَّهُ اشْتَمَلَ عَلٰى كَلِمَةِ بَلِ الَّتِيْ تَقْتَضِيْ ثُبُوْتَ ضِدِّ حُكْمِ مَا قَبْلَهُ لِمَا بَعْدَهُ اور چونکہ قصر میں تمیز بین الخطا والصواب ملحوظ ہوتی ہے اور قصر قلب میں متکلم پر واجب ہوتا ہے کہ مثبت ومنفی کو منصوص ذکر کرے کیونکہ اس میں نفی غیر اور اثبات مذکور بطریق حصر بیان کرنا پڑتا ہے تاکہ مخاطب کے اعتقاد میں جو خطا ہے اس کی تردید بھی ہو جائے۔اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ مخاطب کا اعتقاد برعکس ما یذکرہ المتکلم ہے۔خصوصاً قصر بالعطف میں تو کسی صورت میں بھی ترک تصریح بالمراد جائز نہیں۔کیونکہ پھر مابعد عاطفہ کا حکم ماقبل کی ضد ثابت نہیں ہو سکتا۔

بعد تمہید اس تقریب کے واضح ہو کہ اگر رفع الی اللہ سے موت طبعی بعد از واقعہ صلیب بعرصہ دراز بملک کشمیر مراد لی جائے جیسا کہ مزعوم مرزا صاحب ہے تو بمقتضائے تمہید مذکور تصریح وَمَا قَتَلُوْهُ بِالصَّلِيْبِ بَلْ بَقِيَ حَيًّا زَمَانًا طَوِيْلًا ثُمَّ

اَمَاتَهُ اللّٰهُ وَرَفَعَهُ اِلَیْهِ[1] ضروری ہے[2] کیونکہ جب مزعوم یہود قتل مسیح بالصلیب تھا اور مراد الٰہی اثبات واقعہ صلیبی مگر برعکس زعم یہود ابطال قتل بالصلیب اور اثبات حیات بعد واقعہ صلیب بعرصہ دراز تھا۔ تو آئی تصریحات کا ترک کر دینا حسب قواعد علم معانی و بیان فصاحت و بلاغت کے بالکل منافی ہے۔ اور شان قرآن عظیم کے ہرگز شایان نہیں۔ پس چونکہ بنا بر مذہب مرزا صاحب بوجہ فقدان نص علی المثبت یعنی واقعہ صلیبی و حیات بعرصہ دراز بعد ازاں یہود کے زعم باطل کا ابطال ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ مدعائے الٰہی کا اثبات۔ اس لئے لامحالہ قول مرزا صاحب باطل ٹھہرے گا۔ اور چونکہ بموجب مذہب فرقہ حقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کے

---

[1] مطابق مذہب مرزا صاحب لکھا گیا ہے۔ فافہم ۱۲ منہ

[2] ہمارے اکمل صاحب نے ہمارے اس بیان قصر قلب کو کان لپیٹ کر مان لیا ہے اور اس قاعدے کی رو سے ہم نے جتنی تصریحات کا ضروری ہونا ذکر کیا ہے۔ ان سب کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> قصر قلب جس میں مزعوم مخاطب کو برعکس ما ذکرہ المتکلم ظاہر کر کے رد کیا جاتا ہے۔ بیشک! چنانچہ اس آیت میں بھی مزعوم مخاطب کے برعکس ہی کیا گیا ہے کیونکہ مجرم زعمی کا مدار قتل بالصلیب تھا جس کی نفی کی گئی۔ اور اصل حال بتا دیا گیا۔ کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے اور مشبہ بالمصلوب ہو گئے۔ مگر یونس نبی کی طرح قبر میں زندہ ہی رکھے گئے۔ اور پھر وہاں سے نکل کر لمبا سفر کیا اور کشمیر میں شاہزادہ نبی کہلائے۔ اور باعزت وہاں رہے اور کامیابی کے ساتھ دنیا سے بحوائے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ اٹھائے گئے۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں یہ سارا مضمون بالتصریح بتلایا گیا ہے۔" (ص ۳۹)

حضرات! جناب اکمل صاحب نے ہمارے بیان کو حرف بحرف تسلیم کر لیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب امور مذکورہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ میں بالتصریح بتلا دیئے گئے ہیں اور ہم عرض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں ان امور کا ذکر مطلقاً نہیں اب آپ خود انصاف کر لیں۔ کہ آیا قرآن شریف میں یہ امور مذکور ہیں یا نہیں۔ اگر مذکور ہیں تو بہتر ورنہ سمجھ لیں کہ قادیانی دعاوی اسی طرح بے بنیاد ہوتے ہیں۔ ۱۲ شہادت القرآن۔ منہ

نص علی المثبت والمنفی موجود ہے یعنی ابطال واقعہ صلیبی بہ نسبت مسیح مَا صَلَبُوْہُ میں منصوص ہے اور رفع الی السماء بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں مصرح ہے۔ اور قتل وصلب غیر مسیح جس پر آپ کی شباہت ڈالی گئی۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں مذکور ہے۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے سوائے رفع جسد کے اور کچھ مراد لینا ہرگز جائز نہیں۔ فافہم و تدبر۔

ثالثاً یہ کہ اس سے اوپر انہی یہود کی نسبت کہا گیا ہے وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ اور وہ سب مقتول انبیاء عنداللہ ماجور و مرفوع الدرجات ہوئے اور ہیں اگرچہ وہ یہود کے نزدیک مجرم و لائق قتل تھے۔ پس اس مقام پر رفعت درجہ اور قتل بالظلم جمع ہو گئے۔ اسی طرح اگر حضرت مسیح علیہ السلام ان کے ہاتھ سے قتل بھی ہو جاتے۔ تو پھر بھی عنداللہ مرفوع الدرجات ہی ہوتے۔ کیونکہ آپ نبی صادق ہیں اور مثل دیگر نبیوں کے ناحق قتل کیے جاتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے واقعہ کو دوسرے انبیائے مقتولین کی شمولیت میں بیان نہیں کیا۔ بلکہ ان سے جدا طور پر کیا ہے۔ جو بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ہے۔ اور سابقاً اچھی طرح بدلائل واضح ہو چکا ہے۔ کہ بَلْ اِبطالیہ کے ما قبل و مابعد میں جمع ممکن نہیں اور مرزا صاحب ان کو واقعاً جمع کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا قول باطل ہے اور بموجب مذہب اہلسنت جمع ممکن نہیں کیونکہ جب آپ واقعہ صلیبی سے پیشتر آسمان کی طرف اٹھائے گئے۔ تو پھر صلیب پر کس طرح چڑھائے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ سابقاً محقق ہو چکا ہے۔

رابعاً یہ کہ وجہ اوّل میں بالدلیل ثابت ہو چکا ہے کہ رفع کی ماضویت بہ نسبت ما قبل بَلْ یعنی واقعہ صلیبی کے ہے تو اگر رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے موت طبعی بعد از مدت مدید مراد لی جائے۔ تو معاذ اللہ کلام باری سبحانہ میں کذب لازم آتا ہے۔ کیونکہ جب موت مسیح قبل از واقعہ صلیبی واقع ہی نہیں ہوئی۔ تو پھر اس کو قبل از واقعہ ذکر کرنا کذب نہیں تو اور کیا ہے؟ حاشا شانہ عن ذلک۔

بعد از قطع احتمالات مردودہ مذکورہ آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ رفع جسمی میں

محکم ٹھہری اور مخالفت کے لئے اس میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس لئے صحابہ کرامؓ جو اہل لسان تھے۔ اور اپنی عربی زبان کے محاورات کو خوب سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے قرآن شریف میں من اولہ الی آخرہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت بابرکت میں شب و روز اقامت کر کے آپؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے مع اس کے بیان و تفسیر کے سیکھا تھا اور علمائے عظام کیا متقدمین اور کیا متاخرین جو اکثر علوم عربیہ کے موجد اور مجدد اور میدانِ فصاحت کے فارس اور بحر بلاغت کے غوّاص تھے۔ اور جن کے مساعی جمیلہ سے آج کل علوم عربیہ زندہ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک سے بھی اس آیت میں اختلاف مروی نہیں۔ اور کسی نے بھی سوائے رفع جسمی کے مراد نہیں لی۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں امام ہمام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں:۔

رَفْعُ عِیْسٰی اِلَی السَّمَآءِ ثَابِتٌ بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ وَ نَظِیْرُ هٰذِهِ الْاٰیَةِ قَوْلُهٗ فِیْ اٰلِ عِمْرَانَ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاعْلَمْ اَنَّهٗ تَعَالٰی لَمَّا ذَکَرَ عَقِیْبَ مَا شَرَحَ اَنَّهٗ وَصَلَ اِلٰی عِیْسٰی اَنْوَاعٌ کَثِیْرَةٌ مِّنَ الْبَلَاءِ وَالْمِحْنَةِ اَنَّهٗ رَفَعَهٗ اِلَیْهِ دَلَّ ذٰلِکَ اَنَّ رَفْعَهٗ اِلَیْهِ اَعْظَمُ فِیْ بَابِ الثَّوَابِ مِنَ الْجَنَّةِ وَ مِنْ کُلِّ مَافِیْهَا مِنَ اللَّذَّاتِ الْجِسْمَانِیَّةِ وَهٰذِهِ الْاٰیَةُ تَفْتَحُ عَلَیْکَ بَابَ مَعْرِفَةِ السَّعَادَاتِ الرُّوْحَانِیَّةِ.

’’اس آیت سے حضرت عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا ثابت ہے اور اس کی نظیر سورہ آل عمران کی آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ الخ ہے اور جان لو کہ جب خدائے تعالیٰ نے اس کے بعد کہ عیسیٰ علیہ السلام کو کئی قسم کی تکالیف اور مصائب پہنچیں یہ ذکر کیا کہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ تو اس امر نے یہ بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خدا کی طرف مرفوع ہونا جنت وغیرہ ہر جسمانی لذت کے ثواب سے زیادہ ہے اور

یہ آیت تجھ پر سعادات روحانیہ کی معرفت کا دروازہ کھول[1] دے گی۔"

سوال:۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جسم خاکی کا آسمان کی طرف صعود کرنا ممتنعات و محالات میں سے ہے اور نیز یہ کہ جب اللہ تعالیٰ دیگر رسولوں کو انہی اسباب معتادہ سے بچا کر اسی کرۂ زمین میں بساتا رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو ارضِ مقدسہ اور آنحضرت ﷺ کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرائی۔ تو حضرت روح اللہ کو کیوں آسمان پر اٹھا لیا اور کس لئے اتنی دیر تک زندہ رکھ کر پھر زمین میں نازل کرے گا؟

جواب:۔

تو سوال کی شق اوّل کا جواب حسب وعدہ اوّلاً یہ ہے کہ امر خارق عادت کے وقوع میں شک بدو وجہ ہوسکتا ہے۔ اوّل واقع کرنے والے کے نقصِ علم کی نظر سے۔ دوم اس کے عجز و نقصِ قدرت کے اعتبار سے اور یہ امر عندالخصم بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہر دو نقصوں سے مبرا و منزہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں رَفَعَ کو اپنی طرف منسوب کیا کیونکہ صعود الی السماء اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی حول و قوت سے بعید ہے مگر اللہ عزیز کی قدرت کاملہ کے سامنے کچھ بھی

---

[1] اکمل صاحب بھی کمال کے چلتے ہیں۔ امام رازیؒ نے جو فرمایا کہ یہ آیت تجھ پر سعادت روحانیہ کی معرفت کا دروازہ کھول دے گی۔ تو اکمل صاحب نے اپنی نیت سے یہ سمجھ لیا کہ بس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع روحانی ہے۔ چنانچہ ص ۱۲۱ میں فرماتے ہیں "تفسیر کبیر میں پیش کردہ عبارت تفتح علیک الخ میں اشارہ ہے رفع روحانی کی طرف" جواب حالانکہ اس عبارت کے شروع میں الی السماء کی تصریح موجود ہے پھر بھی بے تکی ہانکے جاتے ہیں کہ اشارہ ہے رفع روحانی کی طرف صحیح مطلب امام رازیؒ کی عبارت کا یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رفع آسمانی کی جو نعمت ملی وہ دیگر جسمانی نعمتوں سے برتر ہے اس سے قبولیت اور قرب الٰہی کی حقیقت معلوم ہو کر سعادت روحانی حاصل ہوسکتی ہے۔ سعادت الاقران ۱۴ منہ

نہیں اور اسی طرح اللہ سبحانہ نے اسرار نبوت علیہ السلام کو اپنی طرف نسبت کیا اور فرمایا:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا. الآیہ (بنی اسرائیل پ۱۵)

''پاک ہے وہ (خدا) جس نے اپنے بندے (محمدؐ) کو راتوں رات سیر کرائی۔'' (۱۷:۱)

یعنی اتنی مسافت بعیدہ اتنے تھوڑے وقت میں طے کرنا اگر چہ بہ نسبت محمد رسول اللہ ﷺ کی قدرت کے متعذر ہے مگر اللہ سبحانہ کی قدرت کے سامنے بالکل سہل ہے۔

كما قال الامام الرازیؒ تحت قوله تعالٰى الأتى وكان الله عزيزاً حكيما حيث قال والمراد من العزة كمال القدرة ومن الحكمة كمال العلم فنبه بهذا على ان رفع عيسٰى من الدنيا الى السمٰوٰت وان كان كالمتعذر على البشر لكنه لا تعذر فيه بالنسبة الى قدرتى والى حكمتى وهو نظير قوله تعالٰى سُبحان الّذى اسرى بعبده ليلا فان الاسراء وان كان متعذرا بالنسبة الى قدرة محمد (صلى اللّٰه عليه وسلّم) الا انه سهل بالنسبة الٰى قدرة الحق سبحانهٗ. انتهٰى

''چنانچہ امام رازی نے وکان اللّٰہ عزیزًا حکیمًا کے ذیل میں کہا ہے کہ اس آیت میں عزت سے کمال قدرت مراد ہے اور حکمت سے کمال علم مراد ہے پس اس سے خدا نے اس امر پر متنبہ کیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا دنیا سے آسمان پر اٹھایا جانا اگر چہ بشر کی طاقت سے بالا ہے۔ لیکن میری قدرت اور حکمت کی نسبت کوئی چیز بھی نہیں۔ اور یہ آیت دوسری آیت سبحان الذی اسرٰی بعبدہ کی نظیر ہے کہ اسراء اگر چہ آنحضرت ﷺ کی قدرت کی نسبت مشکل ہے مگر حق سبحانہ کی قدرت کے آگے بالکل سہل ہے۔''

اور اسی نکتۂ عجیبہ کے لئے بل رفعه الله إليه میں اسم جلالۃ (اللہ) ذکر کیا کیونکہ یہ اسم دلالت کرتا ہے اس ذات پر جو مجمع جمیع صفات کمال ہو وہو اللہ الذی لا الہ الا ہو مزید برآں اسی دقیق لطیفہ کے لئے اپنی اور دو صفتیں جو کمالِ علم اور کمالِ قدرت کی مظہر و مثبت ہیں ذکر کیں جیسا کہ صفحہ ص ۹۰ میں مذکور ہو چکا ہے کہ چونکہ قرآنِ عظیم کی آیات مثل دعاوی مع بینات کے ہیں اس لئے ذکر ہر اسم اور صفت کا حسب اقتضائے مقام و مفہوم کلام ہوتا ہے اور وہ اسم منزلۂ علت مضمون ہوتا ہے' پس چونکہ رفع الی السمآء میں وہم و استبعاد و وسوسۂ عبثیت واقع ہو سکتا تھا اس لئے اس کے ازالہ کے لئے وَکَانَ اللّٰهُ عزیزًا حکیمًا فرمایا یعنی اللہ تعالیٰ مجمع جمیع صفاتِ کمال اپنے ارادے پر غالب اور قادر ہے۔ جو کچھ چاہتا ہے کر سکتا ہے لہٰذا حضرت روح اللہ کو آسمان پر چڑھا سکنا اس کے دائرۂ قدرت سے خارج نہیں اور چونکہ وہ حکیم ہے اس لئے آپ کا رفع الی السمآء اور حیاتِ سماوی اور نزول بعینہٖ عبث اور خلاف حکمت نہیں ہے۔

سائنس کا کمال:-

دیگر یہ کہ سائنس اس کمال پر پہنچ گیا ہے اور نئی نئی انسانی ایجادات اور عجائب المخلوقات کے نئے نئے انکشافات اس حد تک ہو چکے ہیں کہ گذشتہ زمانہ کے بہت سے محالاتِ عادیہ مشاہدات و واقعات سے ثابت ہو چکے ہیں۔ جن پر قیاس کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر امور بھی اسی طرح ممکنات سے ہیں اور اس ذہنیت کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ ہر محال عادی ممکن بالذات ہوتا ہے۔

اسفل (نیچے) سے اعلیٰ (اوپر) کی طرف حرکت کرنے کو صعود کہتے ہیں انسان طبعی طور پر اپنے ارادہ و قوت سے ایک چھلانگ سے زیادہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن ایروپلین (ہوائی جہاز) نے ثابت کر دیا کہ کسی تدبیر و حکمت عملی سے انسان بھی پرواز کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ تدبیر ہمارے علم میں آ جائے۔ اور ہم عملی طور پر اس پر قدرت و قابو بھی رکھ سکیں۔ حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا میں اڑتا تھا۔ اس

کے لئے بھی عالم اسباب میں کوئی سبب ہوگا۔ جس کا ہم کو علم نہیں لیکن ہم ایروپلین (ہوائی جہاز) سے سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ممکن ہے۔

اسی بنا پر خداوند عزوجل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع کے ساتھ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا یعنی سمجھایا کہ میں حکیم ہوں۔ مجھے سب تدبیریں آتی ہیں اور عزیز ہوں سب تدبیریں اور حکمتیں میرے احاطۂ قدرت میں ہیں۔ جس امر کا ارادہ کروں۔ اس کے وجود میں لانے سے کوئی امر مجھے عاجز نہیں کرسکتا' چنانچہ دوسری جگہ فرمایا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (فاطر پ ۲۲) (۳۵:۴۴) یعنی ''خداوند عزوجل ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی شے بھی آسمانوں یا زمین میں عاجز کردیوے' بیشک وہ سب کچھ جانتا اور بڑی قدرت والا ہے''۔

صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث سے ثابت ہے کہ معراج کی رات سرور عالم آنحضرت ﷺ کی سواری کے لئے براق لایا گیا' یہ کیا تھا؟ خدائے تعالیٰ نے جب چاہا کہ اپنے حبیب ﷺ کو بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کرائے اور تجلیات ونشانات قدرت دکھائے تو اس کے اس ارادہ کے فعل میں آنے کی ایک عملی تدبیر تھی اور صحیح بخاری میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِيْ فَعَرَجَ بِيْ اِلَى السَّمَآءِ (کتاب الصلوٰۃ) یعنی ''پھر جبرائیل نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف لے چڑھا''۔ یہ بھی عالم اسباب میں سے ایک سبب تھا۔ کہ ایک فرشتہ جس کے لئے اوپر چڑھنا اس کی طبیعت کے برخلاف نہیں ایک انسان کو جو طبعی طور پر اپنے ارادہ وقوت سے آسمان پر نہیں چڑھ سکتا۔ چڑھا کر لے گیا۔ اسی طرح ہوسکتا کہ اللہ عزوجل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آسمان پر اٹھایا ہو۔ چنانچہ امام رازیؒ آیت وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ پ ۱)(۲:۸۷و۲۵۳) کی تفسیر میں اس امر کے بیان میں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دیگر انبیا کی نسبت مزید اختصاص ہے' فرماتے ہیں:۔

لانه هوالذی بشر مریم بولادته و انما ولد عیسی علیه السلام بنفخة جبرئیل علیه السلام وهو الذی ربّاه فی جمیع الاحوال وکان یسیرمعه حیث سار وکان معه حین صعدالی السّماء (جلداوّل ص ۴۲۶)

یعنی ''اس لئے کہ حضرت جبرئیلؑ ہی نے حضرت مریم علیہ السلام کو پیدائش کی بشارت دی تھی' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبرئیلؑ ہی کی پھونک سے پیدا ہوئے اور اسی (جبرئیل) نے سارے احوال میں آپ کی تربیت کی اور جہاں آپ جاتے تھے۔ وہ بھی ساتھ ساتھ جاتا تھا اور وہ اس وقت بھی آپ کے ساتھ تھا جب آپ آسمان کو چڑھے''۔

فرشتہ تو بڑی شے ہے واقعات میں تو یہ بھی ہو چکا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ایک صحابی کو جن اٹھا کر لے گیا۔ کئی سالوں کے بعد پھر مدینہ طیبہ میں چھوڑ گیا۔ یہ وہی واقعہ ہے۔ جس پر حضرت عمرؓ نے اس کی بیوی کو چار سال کے بعد بیوہ ہونے کی عدت (یعنی چار مہینے اور دس دن رات) گذار کر دوسرا نکاح کر لینے کی اجازت دی تھی۔ (مستفاد از سبل السلام)

ثانیاً یہ کہ کسی امر کا امکان شئے دیگر ہے اور اس کا وقوع شیئے دیگر عقل کے متعلق صرف اثبات امکان ہے نہ وقوع۔ جس طرح کہ وقوع صرف رویت یا نقل یعنی مخبر صادق کی روایت وخبر کے متعلق ہے نہ کہ عقل کے۔ پس برہانِ عقلی سے صعود الی السمآء کے امکان کا بیان اس طریق سے ہے۔ کہ ممتنعات دو قسم پر ہیں بالذات وبالغیر اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے۔ کیونکہ عرف میں امکان بدو معنی مستعمل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے امکان ذاتی ہے کہ اس کا وجود وعدم بالنظر الی ذات الممکن متساوی ہوتا ہے۔ گو بلحاظ امور خارجیہ از علل موجبہ یا موانع وعوائق احدہما واقع بلکہ واجب ہو اور یہ (امکانِ ذاتی) جامع ہوتا ہے وجوب بالغیر اور امتناع بالغیر کو یعنی واجب بالغیر اور ممتنع بالغیر عین حالت وجوب وامتناع بالغیر کو یعنی واجب بالغیر

اور ممتنع بالغیر عین حالت وجوب و امتناع میں ممکن ذاتی ہوتے ہیں کیونکہ عین حالتِ وجوب و امتناع میں بھی اس کا وجود و عدم تساوی ہوتا ہے۔ اگرچہ بلحاظ امورِ خارجیہ احدھما واجب ہو گیا ہو لے پس چونکہ صعود و نزول ساوی ممتنع بالذات نہیں ہے بلکہ واجب بالغیر ہے۔ لثبوت صعود الملائکۃ و نزولھم اس لئے بہ نسبت بشر کے ممتنع بالغیر ہو گا۔ بالنظر الی الامور الخارجیہ۔ مثل عدم استعداد در فطرتِ انسان و عدم صعود فردے از افرادِ بنی آدم قبل از مسیح علیہ السلام اور تمہید بالا سے محقق ہو چکا ہے کہ ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے کیونکہ امکانِ ذاتی جامع ہوتا ہے وجوبِ بالغیر اور امتناع بالغیر کو۔ اس لئے صعود البشر الی السماء ممکن بالذات ہوا۔

دیگر یہ کہ صعود البشر الی السمآء محالاتِ عادیہ میں سے ہو گا۔ نہ کہ عقلیہ میں سے اور محالاتِ عادیہ کا ممکناتِ ذاتیہ میں سے ہونا ظاہر ہے لتعذر الاحاطۃ بقدرۃ

لے اس مقام پر امکان و امتناع اور وقوع و لا وقوع کی بحث ایسی صفائی اور سہولت سے بیان کی گئی ہے کہ معقولات میں کچھ بھی دسترس رکھنے والا آسانی سے سمجھ کر شکر گذار ہو سکتا ہے لیکن ہمارے اکمل صاحب ایسے کور مغز ہیں کہ آپ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔ چنانچہ آپ خیریت سے فرماتے ہیں "آپ (خاکسار) نے صعود کو ممتنع بالغیر ثابت کیا ہے۔ بہت اچھا! اب آپ فرمایئے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ممتنع بالغیر کے لئے امکانِ وقوعی نہیں ہوتا۔" (ص ۴۲) اس کا جواب ہم سوائے اس کے اور کیا دیں کہ اکمل صاحب باوجود ادعائے اکملیت نہ تو ان مصطلحات سے واقف ہیں اور نہ شہادت القرآن کے اس مقام کو سمجھ سکتے ہیں ایسے اجہل اکمل سے کون کہے کہ جب ممتنع بالغیر ہوا تو اس کا وقوع کیوں ممکن نہیں کیونکہ ممتنع بالغیر اسے کہتے ہیں جو اپنی ذات میں تو ممکن ہو لیکن موانع و عوائق کے سبب وجود میں نہ آیا ہو اور چونکہ ہر ممکن کا وجود و جود علتِ موجبہ اور رفع موانع و عوائق کے وقت واقع ہو جاتا ہے اس لئے ہر ممتنع بالغیر بھی وقوع میں آ سکتا ہے کیونکہ امکانِ ذاتی جامع و شامل ہوتا ہے۔ وجوبِ بالغیر اور امتناع بالغیر کو جیسا کہ متن میں مدلل و مفصل بیان ہو چکا ہے ہاں وقوع کی دلیل کا سوال باقی رہ جاتا ہے سو اس کے لئے ہم نے شروع تقریر میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ اثباتِ وقوع صرف روئت یا نقل (یعنی مخبر صادق کی خبر و روئت یا شہادت کے متعلق ہے نہ کہ عقل کے اور وہ خبر و شہادت آیت بل رفعه الله الیه میں مذکور ہے جس کی تفسیر و توضیح ہم کر رہے ہیں۔ فافہم۔ ۱۲۔

سعادت القرآن منہ

الْحَقِّ سُبْحَانَهٗ۔ پس جب صعود البشر الی السماء ممکن بالذات ٹھہرا۔ اور یہ امر عند الخصم بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے تو رفع مسیح علیہ السلام الی السماء بہر دو طریق تحت قدرت باری عزاسمہ ثابت ہوا یعنی اس نظر سے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی فطرت میں نفخ روح قدسی مادہ ملکیت پیدا کیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلکہ کل بنی آدم کی فطرت میں مادہ ملکیت یا ان کو مثل ملائکہ پیدا کر لینا داخل قدرت باری عزاسمہ ہے۔ کیونکہ جب الوف الوف ملائکہ کو پیدا کر لیا۔ تو ان کی مثل پیدا کر لینے پر بھی قادر ہے۔ جیسا کہ ضمن ذکر مسیح ہی میں فرمایا:-

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ.

(زخرف پ ۲۵)

''اگر ہم چاہتے تو تم میں سے[1] فرشتے پیدا کرتے جو زمین میں آباد ہوتے۔'' (۴۳:۶۰)

اور اس اعتبار سے بھی کہ افراد بنی آدم میں سے حضرت مسیح علیہ السلام کو

---

[1] ہم نے لجعلنا منکم ملائکۃ کا ترجمہ کیا ہے ہم (چاہتے تو) تم میں سے فرشتے پیدا کرتے'' اس پر جناب اکمل صاحب (لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل) فرماتے ہیں۔ ''لجعلنا منکم کے معنی تمام معتبر تفسیروں میں بدلا منکم لکھے ہیں یہ تو نہیں کہ تم میں سے فرشتے پیدا ہونے لگ جائیں'' جواب خدا جانے اکمل صاحب بلا مطالعہ کتب و بلا استعداد اکمل کس طرح بن گئے۔

اوّل تو یہ کہ آپ تو میرے حوالہ جات تفسیری سے شاکی ہیں اور اب تفاسیر ہی کا حوالہ پیش کرتے اور حقیقت میں طلب کرتے ہیں دوم یہ کہ لیجئے جناب عالی! ان تفاسیر کے نام سننے چاہیے جن میں اس کے معنی ''تم سے فرشتے پیدا کر دیں یا کر دیتے'' لکھے ہیں۔

تفسیر کشاف جو بلحاظ عربیت کے سب سے اول نمبر پر ہے۔ اس میں بھی یہی معنی لکھے ہیں دیگر یہ کہ امام زمخشری کے بعد امام رازی۔ قاضی بیضاوی۔ امام خطیب شربینی۔ نواب صدیق حسن صاحب اور مخدوم علی مہائی مفسرین نے بھی یہ معنی ذکر کیے ہیں بلکہ حضرت نواب صاحب نے امام یمین سے اسی کو مشہور نقل کیا ہے جیسے ابھی تسلی ہوئی یا نہیں یہ عذر نہ کرنا کہ یہ کتابیں میں نے دیکھی نہ تھیں کیونکہ پھر اکملیت کی شیخی کرکری ہو جائے گی۔ ۱۲ سعادت۔ ۱۲ منہ

شہادت القرآن

اپنی قدرت کاملہ کا نمونہ بنانے کے لئے مخصوص کیا۔ جیسا کہ فرمایا:-

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ. (مریم پ ۱۶)

''اور تا کہ ہم اس کو اپنی قدرت کا ایک نشان بنائیں۔'' (۲۱:۱۹)

نیز فرمایا:-

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ.

(زخرف پ ۲۵)

''وہ تو ہمارا ایک بندہ ہی ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے (اپنی قدرت کا نمونہ بنایا)''۔ (۵۹:۴۳)

اور اس نظر سے بھی کہ صعود الی السماء ممکن بالذات ہے اور ہر ممکن بالذات تحت قدرت باری تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل ص ۳۹ سے ۷۵ تک گزر چکی ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ باوجود قادر ہونے کے صرف مسیح علیہ السلام ہی کو کیوں مثل ملائکہ[1] کے پیدا کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مختار ہے قادر مجبور

---

[1] اکمل صاحب حضرت عیسیٰ کو مثل ملائکہ کہنے پر سخت ناراض ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور خوب گستاخی فرماتے ہیں:-

''پھر عیسیٰ علیہ السلام کس طرح فرشتے ہو سکتے ہیں جو عورت کے پیٹ میں حسب معمول نو ماہ خون حیض سے پرورش پاتے رہے۔'' (ص ۴۲)

جواب! سنئے۔ جناب خفگی معاف کیجئے۔ میں اکیلا حضرت روح اللہ کو مثل ملائکہ نہیں کہتا بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان سے پہلے مخدوم علی مہائی بھی میرے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب تو تاویل الاحادیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حال میں فرماتے ہیں:- كان عيسى عليه السلام كانه ملك يمشى على وجه الارض (ص ۵۹) یعنی عیسیٰ علیہ السلام گویا ایک فرشتہ تھے جو روئے زمین پر چلتے پھرتے تھے۔''

اور مخدوم صاحب تفسیر رحمانی میں فرماتے ہیں وكيف لا يكون ملكية (وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ) اى من اشراطها بنزل بقربها والبشر المحض لايبقى الى هذه المدة (سورہ زخرف پ ۲۵) یعنی عیسیٰ میں ملکیت کس طرح نہ ہو کیونکہ وہ تو قیامت کا ایک نشان ہیں کہ اس کے قریب نازل ہوں گے اور بشر محض اتنی مدت تک زندہ نہیں رہتا۔ ۱۲ منہ سعادت الاقران۔

نہیں' جیسا کہ آریوں کے خیال سے لازم آتا ہے اور فاعل مختار فعل کی کسی خاص صورت کو اختیار کر لے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں' خصوصاً جب کہ وہ علیم کل اور حکیم مطلق بھی ہو جیسا کہ فرمایا:۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ. الآية
(قصص پ ۲۰)

''اور تیرا رب جو کچھ چاہے پیدا کرے اور جو کچھ چاہے پسند کرے اس میں غیروں کا کوئی اختیار نہیں''۔ (۲۸:۶۸)

نیز فرمایا:۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ. (انبیاء پ ۱۷۔ ۲۱:۲۳)

''جو کچھ خدا کرے اس کی بابت اس سے کوئی پرسش نہیں اور دیگر سب کو پرسش ہے''۔

اور نیز:۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ. (ھود پ ۱۲۔ ۱۱:۱۰۷)

''بیشک تیرا رب کر لینے والا ہے اس امر کو جسے وہ چاہے''۔

فلا اعتراض عليه في تخصيص بعضٍ دون بعضٍ. (میر)

''پس اس کے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو مخصوص کرنے پر کوئی اعتراض نہیں''۔

مرزا صاحب قادیانی نے اس مقام پر ایک اور غلطی کی ہے کہ اپنی کتاب ازالۂ اوہام میں اس آیت وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا کے ذیل میں عزیز کا ترجمہ عزت والا یعنی آبرو والا کیا ہے بیشک اللہ تعالیٰ بڑی عزت والا ہے۔ مگر اس کی صفت عزیز سے مراد غلبہ و قدرت ہے۔ چنانچہ علامہ فیومیؒ مصباح میں فرماتے ہیں عز الرجل عِزًّا بالكسر و عزازة بالفتح قوى و عزيعز من باب تعب لغة فهو عزيز و جمعه اعزة والاسم العزة و تعزز قوى و عززته

باخر قوية بالتقيل والتخفيف من باب قتل انتهى مصباح کا سارا بیان قرآن شریف کے بالکل مطابق ہے چنانچہ سورہ یٰس میں ہے فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (یٰس پ۲۳۔ ۳۶: ۱۴) اور سورہ فتح میں اسی معنی میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح پ۲۶۔ ۴۸: ۲۹) فرمایا اور مواضع متعددہ میں صفت عزیز کو صفت قوی کے ساتھ جمع کیا مثلاً حج' احزاب' شوریٰ اور مجادلہ میں اس بیان سے واضح ولائح ہوگیا کہ اسم الٰہی عزیز کے معنی اَلْغَالِبُ عَلٰى مَا يُرِيْدُ ہیں۔[1]

سوال کی دوسری دونوں شقوں کے جواب میں اللہ سبحانہ نے اپنی صفت حکیما فرمائی۔ کیونکہ جب فعل رفع اللہ عزیز حکیم کی طرف منسوب ہوا تو اگرچہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شر یہود سے محفوظ رکھ کر اسی سطح زمین پر زندہ رکھنے پر بھی قادر تھا مگر بحکم فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْا عَنِ الْحِكْمَةِ ضرور ہے۔ کہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہ ہو کیونکہ صفات الٰہیہ میں سے ایک صفت حکیم بھی ہے اور وہ ہر شے کو اس کے مقام مناسب پر رکھتا ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے مادۂ فطری کے موافق اور استعداد نفس ناطقہ[2] کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ لہٰذا مقتضائے حکمت

---

[1] اکمل صاحب اس کا جواب دیتے ہیں کہ جب عزت کے معنی غلبہ ہیں تو مرزا صاحب کی عبارت میں عزت کے معنی ''آبرو والا'' کیوں کئے جائیں۔ جواب۔ جناب اس لئے کہ اردو زبان میں عزت بمعنی غلبہ مستعمل نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحب کے خیال شریف میں عزت کے معنی غلبہ تھے تو وہ خطوط ہلالی میں ظاہر کردیتے۔ فافہم۔ ۱۲ سعادت' منہ۔

[2] اکمل قادیانی عبارت کو الٹا سمجھنے میں بہت کمال رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

''اس عبارت سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت نبی کریم ﷺ کا مادہ فطرتی اور استعداد نفس ناطقہ ایسی نہ تھی ورنہ وہ بھی مثل ملائکہ یعنی آسمان پر مرفوع ہوتے۔'' (ص ۴۳)

جناب۔ آنحضرتؐ بھی آسمان پر مرفوع ہوئے۔ لیکن آپ اسے بھی نہیں مانتے۔ فَاَبٰى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا شب معراج میں نبی کریم ﷺ اپنے جسم پاک سے آسمان پر لے جائے گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام سے بہت آگے گئے۔ جہاں پر رفیق راہ جبرئیل علیہ السلام بھی رہ گئے۔ شاید آپ نے بوستان تو پڑھی ہوگی۔ اس میں سعدی مرحوم فرماتے ہیں ؎

چناں گرم در تیہ قربت براند   کہ در سدرہ جبرئیل زو باز ماند

الہیہ یہی ہوا۔ کہ چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام کی پیدائش پر اسباب ارضیہ منعقد نہیں ہوئے بلکہ آپ کی پیدائش نفخ روح القدس سے عالم الامر میں سے ہے۔ یعنی کلمہ کن سے ہوئی ہے۔ پس آپ کو کمال تشبہ بالملائکہ ایک خاص طور پر حاصل ہے۔ لہٰذا آپ کو مرفوع الی السماء کر کے آسمان کو آپ کا مقر بنا دینا بمقابلہ آپ کے مادۂ فطری کے مقام تعجب وخلاف حکمت نہیں ہے۔ اسی تاثیر جبرائیلؑ سے معجزۂ تکلم فی المہد ظاہر ہوا۔ اور یہی تاثیر روح القدس احیائے موتی اور دیگر معجزات کا

لہ دیگر یہ کہ شہادت القرآن کی اگلی سطروں میں آپ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خصوصیت میں الفاظ "خاص طور پر" کی طرف نظر نہیں کی۔ حالانکہ آپ اپنی کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں۔ "شہادت القرآن حصہ اول اس وقت میرے سامنے ہے۔ (ص۲) حَفِظْتَ شَیْئًا وَ غَابَتْ عَنْکَ اَشْیَاءُ۔

اسی طرح ہم حضرت آدم علیہ السلام کے بھی آسمان پر رہنے کے قائل ہیں حدیث صحیح میں وارد ہے کہ قیامت کو لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جا کر شفاعت کے لئے التجا کریں گے۔ تو آپ کی تعریف میں یہ بھی کہیں گے وَاَسْکَنَکَ جَنَّتَہٗ (مشکوٰۃ) یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے بہشت میں بسایا اور معلوم ہے کہ جنت آسمان پر ہے بدلیل عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی اور حدیث صحیح بخاری میں ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے۔ ۱۲ سعادت' منہ

لہ اکمل صاحب کی استعداد ومطالعہ ناقص ہے اس لئے وہ اس تاثیر کا بھی انکار کرتے ہیں حالانکہ امور خارقہ کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ لیجئے صاحب شاید آپ اسے میری ایجاد جانیں اس لئے میں اپنے سے بہت پیشتر کے دو بڑے بڑے بزرگوں کے کلام پیش کرتا ہوں۔ اگر اس پر بھی نہ سمجھے۔ تو پھر تم سے خدا سمجھے' حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم تاویل الاحادیث میں فرماتے ہیں فحصلت فی جبلتہ ملکۃ راسخۃ شبیہۃ بجبریل وھذا معنی تائید اللہ لہ بروح القدس ۱۲ (ص ۵۹) یعنی حضرت جبرئیل کے نفخ کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی جبلت میں جبرئیل کے مشابہ پختہ ملکہ پیدا ہوگیا اور یہ ہیں معنی خدائے تعالیٰ کے آپ کی تائید روح القدس سے کرنے کے اور حضرت شیخ اکبرؒ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں وما کان فیہ من قوۃ الاحیاء والابراء فمن جھۃ نفخ جبریل علیہ السلام۔ (ص ۲۵۳) مع شرح بالی افندی مطبوعہ مطبع عثمانیہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں مردوں کو) زندہ کرنے اور (بیماروں اور کوڑھیوں اور اندھوں کو) چنگا کرنے کی قوت نفخ جبرئیل کی جہت سے تھی۔ ۱۲ سعادت القرآن

باعث ہوئی۔ اسی لئے قرآن شریف میں خبر سعادت اثر وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (پ ا بقرہ۔۲:۸۷و۲۵۳) آپ ہی سے مخصوص ہے۔ اور یہی تائید جبرائیلی صعود الی السماء کے وقت آپ کے ہمرکاب تھی۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا جو سابقاً گذر چکا۔

دوسری حکمت الٰہیہ حضرت روح اللہ کے زندہ رکھنے اور پھر دنیا میں نازل کرنے میں یہ ہے کہ نظر بر کمالات انبیاء علیہم السلام چار وصف ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا حصول بہ نسبت انبیائے اولی العزم علیہم السلام کے ضروری ہے۔ گو ان میں سے کسی کی نسبت کوئی وصف بباعث عدم ضرورت ذکر قرآن شریف میں مذکور نہ ہو یا بسبب موانع وعوائق خارجیہ مثل عدم ضرورت ظہور بالفعل ظاہر نہ ہوا۔ مگر بالقوہ وہ سب ان صفات اربعہ سے متصف ہیں۔ اوّل مبشر بہ (بصیغہ اسم مفعول) اس اعتبار سے کہ اس پیغمبر کے ہونے کی بشارت پہلے دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت روح اللہ علیہ السلام کی نسبت علی لسان الملائکہ حضرت مریم علیہا السلام کو بشارت دی گئی۔ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ (پ۳ آل عمران) ''اے مریم خدا تجھ کو اپنے کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ بشارت دیتا ہے'' (۳:۴۴) اور نیز وَرَسُوْلًا إِلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيلَ (پ۳: آل عمران) ''اور رسول ہوگا۔ بنی اسرائیل کی طرف۔'' (۳:۴۸)

پس حضرت مسیح علیہ السلام مبشر بہ ہوئے۔ دوم مصدق سوم مبشر ہر دو بصیغہ اسم فاعل مصدق اس نظر سے کہ وہ رسول اپنے سے پہلے رسولوں کی تصدیق کرتا ہے اور مبشر اس لحاظ سے کہ وہ رسول کسی دیگر رسول کے آنے کی بشارت سناتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ روح اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ اور محمد رسول اللہ حبیب اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم وسلامہ کی نسبت حکایۃً عن روح اللہ علیہ السلام سورہ صف میں ذکر کیا۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ. (صف ۲۸)

"تصدیق کرنے والا توریت کی جو میرے آگے ہے اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ﷺ ہوگا۔" (۶:۶۱)

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دونوں وصف یعنی مصدق ومبشر ہر دو بصیغہ اسم فاعل ثابت ہوئے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مصدق ہونا (بصیغہ اسم مفعول) جو وصف چہارم ہے۔ کیونکہ تصدیق کتاب مستلزم ہے تصدیق رسول کی۔ اور آنحضرت سرور عالم ﷺ کا مبشر بہ ہونا اور وصف چہارم جناب رسالتماب ﷺ کی نسبت سورہ صافات میں فرمایا:

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ. (صافات پ۲۳)(۳۷:۳۷)

"بلکہ حق لے کر آیا ہے اور رسولوں کی تصدیق کرتا ہے۔"

اس میں آپ ﷺ کا وصف مصدق اسم فاعل مذکور ہوا۔ اور چونکہ حضرت روح اللہ علیہ السلام بھی زمرۂ مرسلین میں سے ہیں۔ اس لئے ان کی صفت مصدق بصیغہ اسم مفعول ثابت ہوئی۔ پس اس سلسلہ میں حضرت روح اللہ علیہ السلام کے چاروں وصف ثابت ہوئے۔ اور آنحضرت ﷺ کے صرف دو یعنی مبشر بہ بصیغہ اسم مفعول اور مصدق بصیغہ اسم فاعل۔ آنحضرت ﷺ کے لئے بوجہ سیادت اور ختم رسالت ان اوصاف اربعہ کا ظہور بالفعل ضروری ہے۔ پس اگر آپ کے اوصاف کی تکمیل بالفعل کے لئے کوئی نیا رسول پیدا کیا جاتا۔ تو خاتم النبیین کا شرف باقی نہیں رہتا اور بلحاظ ختم نبوت مجرد کے تو اوصاف بلحاظ مبشر بصیغہ اسم فاعل اور مصدق بصیغہ اسم مفعول کا ظہور نہیں ہوتا۔ جو شانِ سیادت کے شایان نہیں ہے۔ اس لئے اللہ حکیم کی حکمت بالغہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا جائے۔ جن کی آمد ثانی کی بشارت سے آپ کا لقب مبشر بصیغہ اسم فاعل ظاہر ہو جائے۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آکر اس امر کی تصدیق کریں۔ کہ محمد رسول اللہ ﷺ حق ہے!! حق ہے!!! اور آپ ﷺ کی صفت مصدق بصیغہ اسم

مفعول بالفعل ظاہر ہو جائے۔ پس اس طریق حکیمانہ سے ختم نبوت بھی قائم رہی۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام آپ ﷺ سے پہلے رسول بن چکے ہوئے ہیں۔ اور اسی نبوت سے پھر آئیں گے اور نیز رسول اللہ ﷺ کے اوصاف اربعہ بھی پورے ہو گئے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہما السلام میں بتخریج طبرانی من حدیث[1] عبداللہ بن مغفل مذکور ہے۔

يَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا بِمُحَمَّدٍ عَلٰى مِلَّتِهٖ. (فتح الباری)

"حضرت عیسیٰ بن مریم، محمد ﷺ کی تصدیق کے لئے نازل ہوں گے اور آپ کی ملت پر ہوں گے۔"

اسی طرح تفسیر رحمانی میں اس آیت میں حکیما کی تفسیر کے متعلق لکھا ہے۔

وهي حفظه لتقوية دين محمد صلّى الله عليه وسلّم حين انتهائه إلى غاية الضعف لظهور الدّجال فيقتله. (ص۱۷۳)

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع میں یہ حکمت ہے کہ خدا نے آپ کو دین محمدیؐ کی تقویت کے لئے محفوظ رکھا۔ جب کہ وہ (دین محمدی) دجال کے ظہور سے بہت ہی ضعف میں ہو جائے گا۔ تو آپ اس (دجال) کو قتل کریں گے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام کو اس نعمت جزیلہ و منحہ جلیلہ کے لئے۔ اس واسطے مخصوص کیا گیا کہ آپ کی نسبت حضرت مریم صفیۃ اللہ کو آپ کی ولادت سے پیشتر ہی بشارت سنائی گئی تھی۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ. (پ۱۶ مریم)

"تا کہ ہم اس کو لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنائیں۔"

لہٰذا آپ اس انعام کے زیادہ مستحق ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ

---

[1] حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ میں اس شرح میں جو حدیث لاؤں گا وہ صحیح ہوگی یا حسن (مقدمہ ص ۴) مطبوعہ دہلی ۱۲ سعادت' منہ

فرماتے ہیں:-

اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ. (الحدیث رواہ البخاری وغیرہ)

''مجھے عیسیٰ بن مریم کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ نسبت ہے۔''[1]

الحمد للہ کہ اس کے فضل غیر متناہی اور حسن توفیق سے آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا کی تفسیر معقولاً ومنقولاً پوری ہوئی۔ اور بدلائل قاہرہ وقویہ وبراہین ظاہرہ باہرہ وحجج قاطعہ ساطعہ وبینات غیر مرفوعہ حضرت مسیح علیہ السلام کا صعود الی السمآء اور اب تک زندہ ہونا ثابت کر دیا گیا۔

اب مختصراً دیگر آیات ودلائل مثبتہ رفع وحیات آسمانی بیان کی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے جو مثبتہ نزول بھی ہیں۔ ان کا تفصیلی بیان رسالہ نزول المسیح من السّمآء[2] میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

تیسری آیت:-

تیسری آیت جس سے حضرت روح اللہ علیہ السلام کی حیات الی الآن اور نزول عیسیٰ فی آخر الزمان ثابت ہوتا ہے یہ ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا. (پ ۶ نسآء)

''اور نہیں ہوگا کوئی اہل کتاب میں سے مگر ایمان لے آئے گا اس پر اس کی موت سے پہلے اور وہ قیامت کے دن ان پر شاہد ہوگا۔''

(۱۵۹:۴)

---

[1] اس حدیث کی مزید توضیح وتشریح رسالہ ''نزول المسیح من السمآء'' میں کی جائے گی ان شاء اللہ اور نیز مخالفین جو جو ایرادات ومناقضات عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر وارد کرتے ہیں ان کے مفصل جواب دیئے جائیں گے۔ ۱۲ منہ سعادت الاقران

[2] یہ رسالہ مدتوں سے لکھا پڑا ہے کثرت مشاغل کی وجہ سے نوبت چھپوانے کی نہیں آ سکی اللہ توفیق دے۔ ۱۲ منہ

وجہ استدلال کی یہ ہے کہ لَیُؤْمِنَنَّ میں لام قسم کا اور نون تاکید کا ہے۔ اور متون و شروح کتب نحو میں مصرح ہے۔ کہ نون تاکید مضارع کو خالص استقبال کے لئے کر دیتا ہے اور ماضی اور حال کے لئے نون تاکید نہیں آتا۔ اس مسئلہ میں کسی نحوی کو خلاف نہیں۔ اور نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی ﷺ یا کلام عرب عرباء میں اس کے خلاف نون تاکید کا استعمال پایا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابن ہشام نحوی مغنی میں تحریر کرتے ہیں۔

وَاَمَّا الْمُضَارِعُ فَاِنْ كَانَ حَالًا لَمْ يُؤَكَّدْ بِهِمَا وَ اِنْ كَانَ مُسْتَقْبِلًا اُكِّدَبِهِمَا وَجُوْبًا فِيْ نَحْوِتَا للّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ. انتهى. (مغنے ص ۲۲ جلد ثانی)

''اگر مضارع حال کے معنی میں ہو تو ان ہر دو (نون خفیفہ و ثقیلہ) سے اس کی تاکید نہیں کی جاتی اور اگر مستقبل کے معنی میں ہو تو اس (مستقبل) کی تاکید آیت تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ کی شکل میں یعنی جب فعل کے اوّل میں قسم کا کوئی حرف ہو' ان ہر دو (نون ثقیلہ یا خفیفہ) میں سے کسی کے ساتھ واجب ہوتی ہے۔''

اسی طرح علامہ رضی شرح کافیہ میں فرماتے ہیں:-

وَاَمَّا فِي الْمُسْتَقْبِلِ الَّذِيْ هُوَ خَبَرٌ مَحْضٌ فَلَا يَدْخُلُ اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ عَلٰى اَوَّلِ الْفِعْلِ مَا يَدُلُّ عَلَى التَّوْكِيْدِ اَيْضًا كَلَامِ الْقَسَمِ. انتهى.

''لیکن اس مستقبل میں جو محض خبری ہو نون تاکید (خفیفہ یا ثقیلہ) داخل نہیں ہوتا مگر اس صورت میں کہ فعل کے اوّل میں کوئی تاکید کا کلمہ بھی داخل ہو مثلاً لام قسم''۔

بعد اس تمہید کے واضح ہو کہ چونکہ آیت ما نحن فیھا میں لَیُؤْمِنَنَّ مع لام قسم اور نون تاکید ثقیلہ کے ہے۔ پس حسب تصریحات بالا یہ خالص استقبال کا صیغہ

ہے۔ اس لئے مراد الٰہی اس آیت مبارکہ سے یہ ہوئی کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔ جس میں سب اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔

موافق محاورہ کتاب وسنت وقواعد نحو وکلام عرب عرباء اس آیت کے صحیح معنی یہی ہیں اور جتنے معنی اس کے سوا ہیں وہ سب غلط اور باطل[1] ہیں پس چونکہ ابھی تک اتفاق اہل کتاب قاطبۃً[2] عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے پر محقق نہیں ہوا۔ لہٰذا آپ ابھی تک فوت نہیں ہوئے وھذا ھو المراد والحمد للہ علی حسن توفیقہ۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا فیکسر الصلیب و یقتل الخنزیر و یضع الحرب و یفیض المال حتی لا یقبلہ احد حتی تکون السجدۃ الواحدۃ خیرا من الدنیا ثم یقول ابوھریرۃ و اقرأوا ان شئتم وَ اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ مَوْتِہٖ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکُوْنُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا۔

(صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ البتہ عنقریب تم میں (حضرت) ابن مریم علیہ السلام۔ صاحب عدل وانصاف حاکم ہو کر اتریں گے۔ پس صلیب کو توڑ دیں گے۔ اور خنزیروں کو قتل کروا دیں گے اور لڑائی (بوجہ غلبۂ اسلام)

---

[1] اس کی مفصل بحث شہادت القرآن حصہ دوم میں ص ۳۲۲ سے ص ۳۳۴ تک عالمانہ طریق پر نہایت تحقیق وتدقیق سے کی گئی ہے۔ طالب تفصیل اس کا مطالعہ کرے۔ ۱۲ منہ سعادت القرآن

[2] سب کے سب (عبدالقیوم میر)

موقوف کر دیں گے اور مال اس قدر کثرت سے ہو جائے گا کہ کوئی اس کو قبول نہ کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سجدہ ساری دنیا (کے مال و متاع) سے بہتر ہو گا۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ و ان من اھل الکتاب الالیومنن بہ قبل موتہ۔ الخ

ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں اس حدیث کے ذیل میں اس آیت کا مفہوم یوں ادا کیا گیا ہے۔

ای وان من اھل الکتاب احد الّا لیؤمنن بعیسٰی قبل موت عیسٰی وھم اھل الکتاب الذین یکونون فی زمانہ فتکون الملۃ واحدۃ وھی ملۃ الاسلام و بھذا جزم ابن عباس فیما رواہ ابن جریر من طریق سعید ابن جبیر عنہ باسناد صحیح. (ارشاد الساری شرح صحیح بخاری)

"یعنی اہل کتاب میں سے کوئی بھی نہ ہو گا۔ مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام پر حضرت عیسٰی کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا۔ اور وہ وہ اہل کتاب ہوں گے۔ جو ان (حضرت عیسٰی) کے زمانہ (نزول) میں ہوں گے' پس صرف ایک ہی ملت اسلام ہو جائے گی۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اسی پر جزم کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جو ابن جریرؒ نے ان سے سعید بن جبیر کے طریق سے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی۔"

اس آیت کو اپنے ماقبل سے دو ارتباط ہیں اول یہ کہ جب آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں مسیح علیہ السلام کا صعود الی السماء مذکور ہوا۔ تو سامع کے دل میں ایک سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان سے کبھی نازل بھی ہوں گے یا نہیں؟ اللہ تعالٰی نے بطور استیناف بیانی (جواب سوال مقدر) فرما دیا کہ زمانہ[1]

---

[1] اکمل صاحب قادیانی نے اپنی بے کمالی کی وجہ سے اس مقام پر ایک سوال کیا ہے کہ یہ کس آیت کا ترجمہ ہے؟ (ص ۴۴) جناب والا! فہم سخن نصیب اعداء۔ صحیحین کی احادیث تو

پیش کرنا مذکور ہے کہ ہم آپ پر تب ایمان لائیں گے۔ جب آپ ہم پر آسمان پر سے کتاب نازل کر دکھلائیں جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی مذکور ہے وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ یعنی (یہ کفار کہتے ہیں کہ) ہم تیرے (آسمان پر) چڑھنے ہی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ جب تک تو ہم پر کوئی کتاب نہ اتارے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اس سوال کے دو جواب تعلیم فرمائے۔ اوّل یہ ظاہر کیا کہ ایسے ایسے معترضات کا پیش کرنا ان کی موروثی اور جدی عادت ہے۔ چنانچہ انہوں نے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے کے آپ سے اس سے بھی بھاری سوال کیا۔ یعنی کہا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ ظاہرا دکھا۔ اور انہوں نے فلاں شرارت کی اور وہ فلاں فعل قبیح اور خلق شنیع کے مرتکب ہوئے۔ اسی سلسلۂ ذکرِ شناعاتِ یہود میں ان کا یہ قول بھی ذکر کیا کہ وہ فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر ڈالا۔ حالانکہ مسیح علیہ السلام کو نہ تو انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر چڑھایا۔ ولیکن اس شخص کو سولی پر چڑھا کر قتل کیا۔ جس پر حضرت مسیحؑ کی شکل وشباہت ڈالی گئی تھی۔ الی قولہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

پس اس ذکر کے ضمن میں اوّل تو آیت مانحن فیہا میں اس طور پر تقریع و تحکیت یہود پائی گئی۔ کہ جس رسول کی نسبت یہود فخر سے بے باکانہ یہ اخبارِ بے سروپا اور افواہِ بے بنیاد اڑا رہے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہود اس نبی برحق روح اللہ علیہ السلام کے سامنے سخت پست اور ذلیل ہو کر ایمان لائیں گے [1]

---

[1] ہر چند کہ ہم نے بال کی کھال اتار کر نہایت وضاحت سے ان آیات کا ربط مضمون سابق سے بیان کر دیا۔ اور تائید کے لئے تفسیر رحمانی کا حوالہ بھی دے دیا۔ جو ربط آیات میں لاثانی ہے لیکن ہمارے اکمل صاحب اس پر بھی راضی نہ ہو کر لکھتے ہیں۔ "سوال تو یہ ہے کہ آسمان سے کوئی کتاب نازل ہو۔ اور جواب یہ کہ مسیح علیہ السلام اتر کر تمہاری خوب خبر لے گا۔ پھر وہ بھی ان کی نہیں کیونکہ وہ تو مر چکے ہوں گے۔ بلکہ ان کی اولاد کی کسی آخری پشت کی۔" جواب طلب

چنانچہ تفسیر رحمانی میں اسی آیت کے متعلق لکھا ہے۔

ثم اشار الی ان من کان یفتخر بقتلہ سیذال لہ قبل موتہ.

(رحمانی ص ۱۷۲)

''پھر خدا تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا۔ کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر فخر کرتے ہیں وہ عنقریب اس کی موت سے پہلے اس کے تابع ہو کر اس کے سامنے عاجز و ذلیل ہوں گے۔''

ثانیاً اس طور پر کہ جو کتاب ہم اپنے حبیب ﷺ پر بواسطہ رسول امین یعنی جبرئیل علیہ السلام نازل کر رہے ہیں۔ وہ اسی طریق پر نازل ہوتی رہے گی۔ یہود کے اقتراح بے جا پر اس طریق تنزیل کو بدل نہیں دیں گے۔ ہاں ہم زمانہ اخیر میں مسیح ابن مریم علیہ السلام کو ان کی سرکوبی اور تذلیل کے لئے پھر نازل کریں گے۔ یہ تو جواب اول کی تقریر ختم ہوئی۔ حاصل یہ کہ یہود کے ایسے ناشایستہ و بے جا مقترحات سے دل تنگ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ان کی عادت متوارثہ ہے۔

جواب ثانی یہ تعلیم فرمایا:-

اِنَّا اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ.

(نساء پ ۶۔۴:۱۶۳)

''بے شک ہم نے تیری طرف ٹھیک اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح علیہ السلام کی طرف اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف کی تھی۔''

لہ جناب! شاید ہمارے الفاظ تفریع وتعقیب پر آپ کی نظر نہیں پڑی۔ جناب من! قرآن شریف میں اس کی نظائر بکثرت ہیں' سیالکوٹ میں آ کر ہم سے تفسیر جلالین پڑھیں ہم آپ کو اس طریق جواب کی تصریح دکھا دیں گے' ہاں یہ خوب کہا کہ ان کی اولاد کو ڈرا وا دیا گیا۔ ہاں جناب! یہ بھی قرآن میں بکثرت ہے۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا والے رکوع یہاں آ کر پڑھیں افسوس آپ نے مولوی نور الدین صاحب کو یہ بات نہ سکھائی۔ ورنہ وہ مرزا صاحب کی پشت سے کسی لڑکے کا نکاح محمدی بیگم کے بطن سے کسی لڑکی کے ساتھ تجویز نہ کرتے۔ فافہم سعادت منہ

یہ طریق جواب احسن الخطابات میں سے ہے۔ واللہ الموفق والملہم۔
چوتھی آیت جس سے حضرت روح اللہ علیہ صلوات اللہ کی رفع اور نزول اور حیات الی الآن ہرسہ امور ثابت ہیں آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (زخرف پ ۲۵) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول علامات قیامت میں سے ہے۔'' (۴۳:۶۱)

اعتراض: جناب اکمل صاحب نے ہمارے اس ترجمہ پر کمال علمی یا بے کمالی کی بنا پر چند سوالات کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں: کیوں جناب! یہ ''عیسیٰ'' (ضمیر کے مرجع میں اختلاف ہے) اور پھر اس کا نزول کہاں سے نکالا اور پھر علم بمعنی علامات کونسی لغات میں دیکھا۔ اور ساعت کے معنی عذاب کی گھڑی بھی موافق محاورہ قرآن مجید ہو سکتے ہیں' یقینا قیامت کیونکر ہوئے؟ (۳۴ و ۳۵)۔ جوابات: اس آیت سے پیشتر اور بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر صریح الفاظ میں موجود ہے۔ دیکھئے۔ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا (الی قولہ) وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ الآیۃ گرنہ بیند بروز شپرہ چشم + چشمۂ آفتاب راچہ گناہ؟ اور قابل لحاظ وہ اختلاف ہوتا ہے جو ناشی از دلیل ہو اور اس میں فیصلہ کی قوی دلیل نہ ہو۔ ورنہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ وجود باری تعالیٰ اور نبوت محمد ﷺ سے بھی اس بنا پر انکار نہ کر دیں۔ کہ ان میں بھی اختلاف ہے۔ محققین نے اس ضمیر کے مرجع کی نسبت صاف فیصلہ کر دیا ہے کہ سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے سب مرجع ضعیف اور بعید ہیں کیونکہ سابقاً و لاحقاً انہی کا ذکر ہے اور نزول حدیث ابن مسعود سے لیا ہے۔ آپ علم حدیث سے ناواقف ہیں۔ اس لئے آپ نے سوال کر دیا اور یہاں علم بمعنی علامت لسان العرب میں مرقوم ہے۔

دیکھئے ہرسہ امور بالا کی نسبت علامہ ابن منظور افریقی فرماتے ہیں۔ و فی التنزیل فی صفة عیسٰی صلوٰت اللّٰه علٰی نبینا و علیه وانه لعلم للساعة وهی قراۃ اکثر القراء وقرء بعضهم و انه لَعَلَمٌ للساعة المعنی ان ظهور عیسٰی و نزوله الی الارض علامة تدل علی اقتراب الساعة (لسان العرب جلد ۱۵ ص ۳۱۴) اسی طرح تفسیر کبیر میں مسطور ہے:۔ وان عیسٰی لعلم للساعة ای شرط من اشراطها تعلم به فسمی الشرط الدال علی الشیء علمًا لحصول العلم به و قرء ابن عباس لَعَلَمٌ وهو العلامة اور ایک دوسری حدیث میں جو حضرت حذیفہؓ سے تفسیر ابن جریر میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو آیات قیامت میں گنایا ہے' ہاں! آپ نے یہ خوب کہا۔ کہ ''چونکہ ساعة بمعنی عذاب کی گھڑی بھی قرآن مجید میں وارد ہے اس لئے اس کے معنی یقینا قیامت نہیں لے سکتے۔'' الخ

شہادات القرآن

حضرت عبداللہ بن مسعود سے سنن ابن ماجہ میں موقوفاً اور مسند امام احمد میں مرفوعاً مروی ہے کہ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا كَانَ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم لَقِيَ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى فتذاكروا الساعة فبدأوا بابراهيم فسألوه عنها فلم يكن عنده منها علم ثم سألوا موسٰى فلم يكن عنده منها علم فرد الحديث الٰى عيسٰى بن مريم فقال قد عهد الٰى فيما دون وجبتها فاما وجبتها فلا يعلمها اِلَّا اللّٰه فذكر خروج الدجال قال فانزل فاقتله (الحديث) واللفظ لابن ماجة (ص ٣٠٩ باب فتنة الدجال و خروج عيسٰى بن مريمؑ)

''جس رات رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی (اس رات) آپ حضرات ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ[1] علیہم السلام سے ملے تو قیامت کے متعلق تذکرہ

---

[*] جناب والا۔ جب مرزا صاحب آنجہانی نے اس مقام کی نسبت ساعۃ کے معنی میں یہ حجت نکالی تھی۔ تو ہمیں اس وقت سوجھا تھا کہ یہ انکار قیامت کی پیش بندی ہے کیونکہ جب قاعدہ یہ ٹھہرا۔ کہ جس لفظ مفرد سے چند ایک معنی مراد لئے جائیں تو کوئی معنی بھی کسی مقام پر بھی یقینی نہیں ہوسکتا تو جہاں جہاں پر قیامت مراد ہوگی۔ وہاں وہاں پر آپ کہہ سکیں گے۔ کہ چونکہ ساعۃ کے معنی عذاب کی گھڑی بھی ہیں۔ اس لئے یقیناً قیامت کیونکر ہوئے؟'' العیاذ باللہ جب ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ تو حجت باز طبیعت کوئی نہ کوئی وجہ تراش لیتی ہے۔ ۱۲ سعادت منہ۔

[1] مرزا صاحب قادیانی نے ازالہ اوہام میں فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دیگر انبیا کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ملاقات کی۔ ''پس جس طرح دیگر انبیا فوت ہو کر آسمان پر ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اس کا مفصل جواب شہادت القرآن حصہ دوم میں دے دیا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ملاقات کی تین صورتیں ہیں دونوں طرف سے جسمانی دونوں طرف سے روحانی ایک طرف سے روحانی دوسری طرف سے جسمانی جیسا کہ حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے کہ دو قبروں میں آپ نے عذاب ہوتے دیکھا۔ اس وقت صحابہ کے ساتھ آپ کی ملاقات ہر دو جانب سے جسمانی تھی۔ اور مردوں کے ساتھ آپ کی طرف سے جسمانی اور [*]

ہوا۔ اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال شروع ہوا تو ان کو قیامت کا کوئی علم نہ تھا۔ (کہ کب ہوگی) پھر موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا' تو ان کو بھی اس کا کوئی علم نہ تھا۔ پس حضرت عیسیٰؑ کی نوبت آئی۔ تو آپ نے کہا کہ قیامت کے وقوع کا علم تو سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ نے مجھ سے قیامت کے نزدیک کا عہد کیا ہوا ہے پس آپ نے دجال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔

(الحدیث بطولہ)

اس آیت کی تفسیر میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا قرب قیامت کی علامت ہونا۔ حضرات ابن عباسؓ۔ ابو مالکؒ۔ عوفؒ۔ مجاہدؒ۔ قتادہؒ۔ سدیؒ۔ ضحاک اور ابن زیدؒ سے مروی ہے۔ (ابن جریر) چنانچہ ضحاک کے الفاظ یہ ہیں۔ **خروج عیسٰی بن مریم و نزوله من السمآء قبل یوم القیامة** (ابن جریر سورہ زخرف) یعنی قیامت سے پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے۔

جب اس آیت اور حدیث سے پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ثابت ہوگیا۔ تو چونکہ نزول مستلزم صعود ہے۔ **اذلا یمکن ولا یتصور نزول البشر من السمآء الا بعد صعوده الیها** یعنی کیونکہ کسی بشر کا آسمان سے نازل ہونا ممکن و متصور نہیں مگر بعد اس کے کہ وہ اس سے پیشتر آسمان پر چڑھا ہو۔ اس لئے یہ آیت مثبت صعود (رفع) بھی ہے اور چونکہ زمان ماقبل النزول میں حیات بھی ضروری ہے اس لئے یہ آیت مثبت حیات بھی ہے۔

پانچویں آیت جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السمأ ثابت ہے

لہ ان کی طرف عالم برزخ کی۔ اسی طرح شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہر دو جانب سے جسمانی تھی۔ اور دیگر انبیا سے آپ کی طرف سے جسمانی اور ان کی طرف سے عالم برزخی۔ فافہم۔ ۱۲۔

آیت وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (پ ۳ آل عمران ۔ ۳: ۴۵) ہے۔ وجۂ استدلال یہ ہے کہ صفت مقرب قرآن شریف میں تین موقع پر وارد ہے اوّل اسی آیت میں مسیح علیہ السلام کی شان میں۔ دوم فرشتوں کے لئے آخر سورہ نساء میں ذکر رفع مسیح علیہ السلام کے تھوڑا آگے فرمایا۔

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ. (پ ۵ نساء ۔ ۴: ۱۷۲)

''نہ تو مسیح خدا کا بندہ بننے کو عار سمجھتا ہے اور نہ ملائکہ مقربین''۔

سوم:۔ جنتیوں کے لئے سورہ واقعہ میں فرمایا:۔

اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ. (پ ۲۷ واقعہ ۔ ۵۶: ۱۱و۱۲)

''نعمت کے باغوں میں وہی مقرب ہوں گے۔''

ان ہر سہ مقامات پر قرب جسمی ۔ حسی ۔ ساوی[1] ملحوظ ہے نہ فقط رتبی۔۔

---

[1] اکمل صاحب قادیانی اس پر فرماتے ہیں ''قرب جسمی ۔ حسی ۔ ساوی کہاں سے نکالا؟ جواب! جناب والا۔ فرشتے اپنے اجسام سے آسمان پر ہیں۔ اور جنتی بھی اپنے اجسام سے جنت میں ہوں گے اور جنت آسمان پر ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے جسم سے آسمان پر ہیں۔ آپ اپنے دماغ سے اکملیت کا دھواں نکال دیں۔ تو یہ باتیں خود بخود سمجھ میں آ جائیں گی۔ دیگر یہ کہ آپ نے شہادت القرآن کی عبارت ہی نہیں سمجھی۔ وہاں تو صاف لکھا ہے۔'' قرب جسمی ۔ حسی ۔ ساوی ملحوظ ہے۔ نہ فقط رتبی۔'' لیکن جناب نے اس لفظ ''ملحوظ'' کا لحاظ بالکل نہیں کیا۔ اور نہ الفاظ ''فقط رتبی'' کا خیال کیا۔ پھر یہ کہ تفہیم ناقصین کے لئے اس کے بعد معنی کنائی اور معنی حقیقی کا باہم جمع ہو سکنا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ ورنہ محصلین جن کی نظر حمد اللہ وغیرہ معقولی کتب پر ہو ان کے لئے الفاظ ''ملحوظ ہے نہ فقط رتبی۔'' ہی کافی تھے۔ ۱۲ سعادت منہ۔

اکمل صاحب نے ایک اور کمال دکھایا کہ قرب ساوی پر ایک اعتراضی حاشیہ بھی جڑ دیا چنانچہ فرماتے ہیں ''اس سے مکانی ہونا اللہ کا لازم آتا ہے۔'' (حاشیہ نمبر ا ص ۴۵) جناب من! آپ نہ تو قرآن جانیں نہ حدیث' نہ فطرت اللہ کو سمجھ سکیں اور دعویٰ اکملیت کا کر دیں۔ تو اس شعر کے مصداق بنیں گے۔ آنکس کہ نداند و داند کہ بداند * در جہل مرکب ابدالدہر بماند۔ منہ

وَلَوْ اَرَدْنَا بِهٖ لَازِمَ مَعْنَاهُ فَلَا يَضُرُّنَا لِاَنَّ الْمَعْنَى الْحَقِيْقِيْ لِلَّفْظِ يَجْتَمِعُ مَعَهٗ لَازِمُ مَعْنَاهُ وَهٰذَا الرَّسْمُ هُوَ الْمُصْطَلَحُ عِنْدَ عُلَمَاءِ الْبَيَانِ بِالْكِنَايَةِ كَمَا هُوَ مُصَرَّحٌ فِيْ كُتُبِ الْبَلَاغَةِ وَقَدْ مَرَّ ذٰلِكَ اٰنِفًا فَلَا فَائِدَةَ فِي الْاِعَادَةِ.

''اور اگر ہم اس (قرب) سے لازمی معنی بھی مراد لیں۔ تو بھی ہمیں مضر

لو بنتے مکانی ہونا تو لازم آئے۔ جب اسے محصور و محاط مانا جائے اور اگر حد و احاطہ کے تصور کے بغیر فوق العرش اس کیفیت سے مانا جائے جو اس کی شان کے لائق ہے۔ تو اس سے مکانی ہونا لازم نہیں آتا۔ ورنہ معاذ اللہ تمام سلف صالحین کو مثبت مکان ماننا پڑے گا۔ کسی حافظ قرآن سے پوچھئے کہ آیت ءَ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ کہاں ہے؟ اور کسی حدیث داں سے دریافت کیجئے کہ وہ حدیث جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لونڈی سے پوچھا تھا اَیْنَ اللّٰہُ یعنی خدا کہاں ہے؟ تو اس نے کہا تھا فِي السَّمَاءِ یعنی آسمان میں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا۔ اِنَّھَا مُؤْمِنَۃٌ یعنی بے شک یہ لونڈی ایماندار ہے اور کسی باہوش دعا گو سے سوال کیجئے کہ دعا کے وقت تمہاری توجہ اور خیال کدھر کو ہوتا ہے اور ساتھ ہی کسی قرآن داں سے معلوم کرلیں۔ کہ آنحضرت ﷺ تحویل قبلہ کی آرزو میں آسمان کی طرف کیوں دیکھتے رہتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْھِکَ فِي السَّمَاءِ اس کے بعد شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ والتحیہ کی عبارت ذیل پڑھیں تو آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ خدائے تعالیٰ کو اوپر ماننا علم جبلی و فطری ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔ ان ھذا الامر فطروا علیہ وجبلوا علیہ کما قال الشیخ ابو جعفر الھمدانی لبعض من اخذ ینکرا لاستواء ویقول لو استوی علی العرش لقامت بہ الحوادث فقال ابو جعفر معناہ ان الاستواء علم بالسمع فی قلوبنا ولولم یرد بہ لونعرفہ و انت تناولہ لدعنا من ھذا و اخبرنا من ھذہ الضرورۃ التی نجدھا فی قلوبنا فانہ ما قال عارف قط یا اللّٰہ الا وقبل ان ینطق لسانہ یجد فی قلبہ معنی یطلب العلو یلتفت یمنۃ و یسرۃ فھل عندک من حیلۃ فی دفع ھذہ الضرورۃ عن قلوبنا فلطم المتکلم وقال حیرا لھمدانی''

اور اس کے تھوڑا آگے فرماتے ہیں۔ وایضا فمن المعلوم ان القران ینطق بالعلوفی مواضع کثیرۃ جدا حتی قد قیل انھا للثمانہ موضع والسنن متواترۃ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بمثل ذلک وکلام السلف المنقول عنھم بالتواتر یقتضی اتفاقھم علی ذلک (منہاج السنہ جلد اول ص ۲۶۳) سعادت منہ

نہیں کیونکہ لازمی معنی حقیقی معنوں کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اس رسم کا نام علمائے بیان کی اصطلاح میں کنایہ ہے۔ جیسا کہ کتب بلاغت میں مصرح ہے اور اس کا حوالہ ابھی گزر چکا ہے۔ پس مکرر ذکر کرنے میں کوئی زیادہ فائدہ نہیں''۔

عیسیٰ علیہ السلام کو جو بکلمہ تبعیض مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ فرمایا تو مراد ان مقربین سے ملائکہ مقربین ہیں جو آیت سورہ نساء میں بالتفصیل مذکور ہیں۔ چنانچہ وہ آیت ان شاء اللہ ابھی مذکور ہوگی۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ فرشتوں کا مقر طبعی آسمان ہے۔ پس جب عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ایک فرد[1] ہوئے۔ تو آپ کا صعود ثابت ہوگیا۔ تفاسیر معتبرہ مثل تفسیر کبیر۔ ابی السعود۔ مدارک۔ خازن۔ بیضاوی۔ سراج منیر۔ کشاف اور فیضی ان سب تفاسیر میں اس آیت کے ذیل میں رفع الی السماء کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کشاف میں ہے۔

وَكَوْنُهٗ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ رَفْعُهٗ إِلَى السَّمَآءِ وَ صُحْبَتُهٗ لِلْمَلَآئِكَةِ.

''مقربین میں سے ہونے کے معنی ہیں۔ آپ کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور فرشتوں کے ساتھ رہنا۔''

اور تفسیر سواطع الالہام میں ہے:۔

لِصُعُوْدِهٖ مَصَاعِدَ السَّمَآءِ وَ اِدْرَاكِهٖ مَدَارِكَ الْمَلَكِ.

''کیونکہ آپ آسمان پر اٹھائے گئے اور آپ فرشتوں کے مقام پر پہنچے۔''

چھٹی آیت جو مثبت رفع روح اللہ ہے۔

---

[1] مطلب یہ کہ فرشتوں کا مسکن طبعی آسمان ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان پر ہونے کی وجہ سے اس سکونت میں سکان آسمان یعنی جماعت ملائکہ کے ایک فرد ہیں۔ جناب اکمل صاحب اسے سمجھ نہیں سکے۔ تو اعتراض جمانے بیٹھ گئے کہ سب رسول بشر تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرشتے کس طرح ہو گئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ۱۲ سعادت منہ۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ. (پ٦ نساء۔١٧٢:٤)

''نہ تو مسیح خدا کا بندہ ہونے کو عار جانتا ہے اور نہ ملائکہ مقربین''

وجۂ استدلال یہ ہے کہ بنائے شرک نصاریٰ تین امر ہیں اور انہیں کے سبب نصاریٰ کو وہم الوہیت مسیح پیدا ہوا۔ اوّل ولادت مسیح بلا پدر۔ دوم ظہور معجزات عجیبہ۔ سوم رفع الی السماء اور ظاہر ہے کہ یہ ہر سہ امور یا تو صحیح ہیں۔ یا نہیں اگر صحیح نہیں تو قرآن شریف میں حسمًا لِمَادَةِ شِرْكِ النَّصَارٰی[1] ان سب کا ابطال و تردید چاہئے اور اگر صحیح ہیں تو پھر یہ ثابت کرنا چاہئے کہ یہ امور مقتضی الوہیت نہیں ہو سکتے۔ ناقد ممارس کتاب اللہ پر ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو باطل نہیں کہا۔ بلکہ ان کو ثابت رکھ کر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ امور مقتضی الوہیت[2] نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وجہ اوّل یعنی ولادت بلا پدر کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے توڑا اور فرمایا:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ. (پ٣ آل عمران۔٥٨:٣)

''عیسیٰ علیہ السلام کی مثال تو خدا کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ کہ اسے خدا نے مٹی سے بنایا تو پھر اسے کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔''

---

[1] نصاریٰ کے شرک کے مادہ کو نابود کرنے کے لئے۔ عبدالقیوم مہر

[2] مطلب بالکل صاف ہے۔ کہ اگر یہ تینوں امر نفس الامر میں خدا کے نزدیک غلط تھے تو چاہئے تھا کہ خدائے تعالیٰ صاف فرما دیتا کہ یہ امر غلط ہیں' افترا ہیں' لیکن خدائے تعالیٰ نے بجائے ابطال و تردید کے ان کو ثابت کر دکھایا۔ اور نصاریٰ کی تردید اس طرح کہ یہ باتیں مثبت الوہیت نہیں ہو سکتیں اکمل صاحب شہادۃ القرآن کے ایسے صاف بیان کو بھی نہیں سمجھ سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں''رفع جسمانی مسیح علیہ السلام کا تو ضرور ابطال ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہی سب سے بڑا بھاری ثبوت ہے۔ نصاریٰ کے پاس الوہیت مسیح کا (ص ٢٦) جناب سن! قرآن نے رفع جسمانی کا ابطال نہیں کیا بلکہ نصاریٰ نے جو اسے وجہ الوہیت بنایا تھا۔ اس کا ابطال وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ سے کیا جیسا کہ اگلی سطروں میں مفصل و مدلل مذکور ہے۔ فافہم ١٢ سعادت منہ

اور یہ من باب تمثیل الغریب بالاغرب ہے۔

وجہ دوم یعنی ظہور خوارق کی نسبت فرمایا:۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ الآیہ۔ (مائدہ پ ۶)

''مسیح تو صرف ایک رسول ہیں۔ اس سے پیشتر کئی رسول ہو چکے ہیں۔'' (۵:۷۵)

اس میں ظاہر کیا کہ ظہور خوارق دیگر انبیا علیہم السلام کے ہاتھ پر بھی ہوا ہے۔ اس لئے یہ وجہ بھی مثبت لاہوتیت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے آپ کے عصا کا سانپ بن جانا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیائے موتی سے اعجب ہے کیونکہ میت وہ چیز ہے۔ جو کسی وقت زندہ ہو اور پھر اس سے حیات منتزع ہو اور لکڑی ایسی چیز ہے جس کی شان میں حیات نہیں ہے۔

وجہ سوم یعنی رفع الی السماء کو آیت لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ الآیہ سے توڑا اور ظاہر کیا کہ ملائکہ مقربین اور حاملین عرش رفع آسمانی میں حضرت روح اللہ علیہ السلام سے ارفع ہیں۔ پس یہ وجہ بھی مقتضی لاہوتیت نہیں ہو سکتی۔

بادنیٰ تامل ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس پچھلی آیت میں ان ہر سہ وجوہ کا جواب ہے کیونکہ ملائکہ کی پیدائش بھی بغیر اسباب کے محض کلمۂ کن سے ہے اور اظہار خوارق میں بھی وہ بشر سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔ اور رفع سماوی میں بھی اکثر ان میں حضرت عیسیٰ سے زیادہ بلند ہیں۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کا رفع مع دیگر خوارق کے اسی ایک آیت سے بھی ثابت ہے۔ اس آیت کے ذیل میں رفع عیسیٰ علیہ السلام کو ذکر کرنے میں بندہ منفرد نہیں ہے۔ بلکہ علامہ ابوالسعود تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں یہی لکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو عبارت ذیل:۔

ان مناط کفر النصاریٰ ورفعهم له علیه السلام عن رتبة العبودية كما كان اختصاصه علیه السلام و امتیازه عن

شہادت القرآن

سائر البشر بالولادة من غیراب و بالعلم بالمغیبات و بالرفع علی السّمآء عطف علی عدم استنکافه عن عبودیته تعالٰی عدم استنکاف من هو اعلٰی درجة منه فیما ذکر فان الملائکة مخلوقون من غیراب و امّ و عالمون بمالا یعلمه البشر من المغیبات و مقارهم السّمٰوٰت العُلٰی۔

۱۲(ابی السعود زیر آیت لن یستنکف الخ)

''نصاریٰ کے کفر اور ان کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رتبہ عبودیت سے برتر جاننے کا مناط و مدار اس وجہ سے ہے کہ آپ بلا باپ پیدا ہوئے اور (خدا کے جتانے سے بعض) مغیبات کے جاننے اور آسمان پر چڑھ جانے جانے میں دیگر بشروں سے ممتاز ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس بات پر کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبودیت سے عار نہیں ان لوگوں (فرشتوں) کے عدم استنکاف کو عطف کیا جو ان امور مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اعلیٰ وارفع ہیں کیونکہ فرشتے بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا شدہ ہیں اور وہ (خدائے تعالیٰ کے جتانے سے) ان مغیبات کو بھی جانتے ہیں۔ جو انسان کے علم میں نہیں ہیں' اور بلند آسمان ان کے رہنے کی جگہ ہے۔''

ساتویں آیت مثبت حیاتِ روح اللہ یہ ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً وَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ.

(آل عمران پ ۳)

''اور کلام کرے گا لوگوں سے گہوارے میں اور کہولت (کی عمر) میں بھی اور صالحین میں سے ہوگا۔'' (۴۶:۳)

وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت مسیح کو تکلم

فی المھد اور تکلم فی الکھولۃ کی بخشش سے نوازنا ذکر کیا اور یہ دونوں اعجازی امر ہیں۔ جیسا کہ سورۃ مائدہ کی آیات تذکیر انعامات[1] سے واضح ہے

اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا.

(مائدہ پ ۷)

"(اے عیسیٰ علیہ السلام) (وہ وقت یاد کر) جب میں نے تیری تائید روح القدس (جبرئیل فرشتے) سے کی۔ کہ تو نے لوگوں سے اپنے گہوارے میں بھی اور کہولت (کی عمر) میں بھی کلام کیا۔" (۵:۱۱۰)

تکلیم فی المھد یعنی گہوارے کی باتیں سورہ مریم میں مذکور ہیں۔

جب یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پر حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت میں شک کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحکم خدا اپنی ماں کی گود سے بول اٹھے۔

اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا الخ

(مریم پ ۱۶۔ ۱۹:۳۰)

"میں خدا کا بندہ ہوں خدا نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔" الخ

پس جس طرح تکلم فی المھد امر اعجازی اور خلاف عادت ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ کا تکلم فی الکھولۃ[2] بھی امر خارق عادت ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر کوئی امر

---

[1] اکمل صاحب یوں کمال نمائی کرتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) احسان تو یاد کرا دے اور اصلی نعمت جو اس سے پہلے کسی نبی کو نہ دی گئی۔ وہ نہ جتائی (ص ۴۷)" جواب۔ جناب والا! وَکَھْلًا میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے الفقیہ تکفیہ الاشارۃ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ نعمت (آسمان پر اٹھالینا) گزری ہوئی ہے۔ اس لئے وہ تو اسی اشارہ سے سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ لیکن قادیانی اصحاب کچھ بھی نہیں سمجھیں گے۔ والسفیہ لا تفیدہ العبارۃ کیونکہ وہ انکار کے درپے ہیں فما كانوا ليؤمنوا بما كذبوا من قبل كذلك يطبع الله على قلوب الكافرين. (اعراف پ ۹۔ ۷:۱۰۱) مگر یہ لوگ (اپنی سرشت ہی کے) نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے ہوں معجزے دیکھ کر اس پر ایمان لے آئیں۔

[2] اکمل قادیانی بات نہ سمجھے اور خواہ بات بنے یا نہ بنے۔ پھر بھی جواب میں کچھ نہ کچھ لکھ

عجیب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ کہولت کی عمر میں سب بولنے والے کلام کیا کرتے ہیں۔

پس اس معجزۂ عیسویہ کی صورت یہ ہے۔ کہ رفع آسمانی کے بعد ایک زمانہ دراز تک بغیر خوراک معتاد کے زندہ رہنا اور اسی حالت میں بغیر کسی قسم کے تغیر و استحالہ (حالت کے بدلنے) کے نازل ہونا امر خارق عادت ہے۔ ورنہ تخصیص مسیح علیہ السلام کی کوئی وجہ نہیں۔ توضیح اس کی یوں ہے کہ آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ

؎ کہہ ڈالنے میں بہت کامل ہیں۔ چنانچہ تکلم فی الکہولۃ کی نسبت فرماتے ہیں' اور تکلم الناس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ عمر کہولت بھی لوگوں سے کلام کرتے رہے ہوں اور آپ (خاکسار محمد ابراہیم میر سیالکوٹی) کے اعتقاد کے موافق تو ان پر کہولت کا زمانہ آسمان پر آیا ہے۔ وہاں کون سے انسانوں کے ساتھ کلام فرماتے ہیں" (ص ۴۷) جواب۔ ہاں جناب! ہم حضرت عیسیٰ کے تکلم فی الکہولۃ کو تو بلا ریب و شک مانتے ہیں۔ اور اسی امر کا یہاں بیان ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ دائما پایا جائے کہ اب ان کے آسمان پر ہونے کے وقت کرنے کے لئے وہاں کی ایک انسان بک کرا کر بھیجنے پڑیں' کیونکہ یہ قضیہ مطلقہ ہے۔ اور اطلاق میں اعتبار نا دوام کا ہوتا ہے' جیسا کہ جملہ کتب منطق میں مرقوم ہے اور فعلیہ نسبت سے ضرورۃ نسبۃ یا دوام نسبۃ لازم نہیں آتا۔ بلکہ ثبوت کے لئے اس کا وجود بالفعل و فی الجملہ احد از منہ ثلثہ میں کافی ہوتا ہے۔ (قطبی۔ سلم۔ حمد اللہ) جس طرح کہ تکلم فی المھد میں دوام نہیں تھا۔ اسی طرح تکلم فی الکہولۃ میں بھی دوام ضروری نہیں۔ پس جب زمانہ نزول میں اس کیفیت سے جو متن میں مذکور ہے۔ اس کا تحقق و وقوع ہو جائے گا۔ تو پھر اس کے صدق میں کیا کلام؟ سچ ہے کہ قادیانیوں کے سامنے ایسی باتیں بیان کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ لیجئے تفسیر ابن جریر میں ابن زیدؒ کا قول ہے قال قد کلمھم عیسٰی فی المھد و سیکلمھم اذا قتل الدجال وھو یومئذ کھل (جلد ۳ ص ۱۵۹)

اور تفسیر معالم میں ہے۔ قال الحسین بن الفضل (و کھلا) بعد نزولہ من السماء (ص ۱۵۹) دیکھئے! اب تو معقولاً و منقولاً ہر دو طریق مطلع صاف ہو گیا برائے خدا اب تو ضد چھوڑیئے اور آنکھیں کھولئے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتباعہٗ سعادت الاقران ۱۲ منہ۔ اے اللہ تو ہمیں حق کو حق دکھا دے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا کر (عبدالقیوم میر)

السلام کا مایہ زندگی بوجہ آسمان پر ہونے کے اور فرشتوں کی صحبت میں ہونے کے ذکر وعبادت ہے۔ چنانچہ تفسیر رحمانی کی یہ عبارت سابقاً گزر چکی ہے۔ "(انی متوفیک) ای اخذ بکلیتک (و) لا ادع لک شھوۃ طعام ولا شراب فتحتاج الی مساکنۃ الارض لانی (رافعک الی) ای الی سمائی" (پ ۳ آل عمران) اور زمانہ رفع ونزول کے درمیان خواہ کتنی ہی مدت مدیدہ آسمان پر رہیں ان کے جسم میں کوئی بھی تغیر واستحالہ نہیں ہوگا۔ بلکہ جس حالت میں وہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے۔ اسی حالت پر نزول فرمائیں گے۔ کیونکہ آسمان محل تاثر واستحالہ نہیں جیسے جنتیوں کے اجسام میں باوجود مدت ہائے دراز در دراز کے کوئی تغیر واستحالہ نہیں ہوگا۔" فافہم۔

ل اکمل صاحب قادیانی مذاق علمی سے نہایت کورے ہیں۔ بہت لمبی عبارت میں جو بے ضرورت مکرر سہ کرر ذکر کر کے لمبی کی گئی ہے فرماتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی فطرت جن حوائج کی مقتضی تھی۔ جب اس سے بوجہ رفع علی السماء کے بے نیازی ہوگئی۔ تو یہ مستلزم صمدیت و الوہیت ٹھہری۔ اس سے نصاریٰ ثبوت دے سکتے ہیں کہ ان کی فطرت میں ہی الوہیت تھی۔ (ص ۴۷) جواب: بندۂ خدا! کبھی تو علم کی بات کیا کرو۔ آپ الفاظ "مسیح کی فطرت" قلم سے تو لکھتے جاتے ہیں لیکن دماغ سے نہیں سمجھتے کہ کہتے کیا ہیں؟ سنیے جناب فطرۃ مصدر ہے اور یہاں مسیح علیہ السلام کی طرف مضاف ہونے سے مصدر مجہول ہے پس اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسیح علیہ السلام جس حالت پر مفطور ہوئے۔ پس آپ ہی کے الفاظ سے ثابت ہوگیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام صمد نہیں ہیں۔ کیونکہ صمد وہ ہے جو اپنے وجود وبقا میں کسی کا محتاج نہ ہو اور دیگر سب اس کے محتاج ہوں ملاحظہ ہو عبارت ذیل آیت اَللّٰہُ الصَّمَد کے ذیل میں۔ (۱) ثُمَّ (بَیَّنَ) صمدیتہ المقتضیۃ لاستغنائہ الذاتی عما سواہ و افتقار جمیع المخلوقات الیہ فی وجودھا و بقائھا و سائر احوالھا یعنی پھر صاف صاف بیان کی اپنی بے نیازی جو اپنے ماسوا سے اپنے ذاتی استغنا اور تمام مخلوقات کے اپنے وجود اور اپنی بقا کے لئے اور تمام احوال میں اس کی طرف محتاج ہونے کی مقتضی ہے۔ (عبدالقیوم میر)۔ دیگر یہ کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب آسمان پر بحکم اللہ تعالیٰ بعض حوائج بشریہ (کھانا پینا) سے بے ☜

ب ابوالسعود

آٹھویں آیت مثبت حیات ورفع نزول حضرت روح اللہ یہ ہے۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ. (مائدہ پ ۷)

''اور میں ان پر شاہد رہا۔ جب تک میں ان میں (موجود) رہا۔ پس جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر شے پر شاہد ہے۔'' (۵:۱۱۷)

آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ کی تفسیر میں سابقاً امور مندرجہ بہ بسط محقق ہو چکے ہیں۔

اوّل یہ کہ توفی کا مدلول (معنی) وضعی موت نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں أخذ الشيء وافيا ''یعنی کسی چیز کو بتمامہ لے لینا۔''

دوم یہ کہ چونکہ اس اخذ وقبض کے انواع متعدد ہیں اس لئے تعیین یک نوع کے لئے وجود قرینہ ضروری ہے۔''

سوم یہ کہ آیت رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ رفع الی السماء کے لئے نصوص قطعیہ ہیں کیونکہ رفع الی اللہ اور رفع الی السماء متساوق فی المعنی ہیں۔ جیسا کہ آیت اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ. (پ ۲۲ فاطر۔ ۳۵:۱۰) اچھی اچھی باتیں اس کی جناب تک پہنچتی ہیں اور (وہی) نیک عمل (کرنے والوں کے درجوں) کو بلند کرتا ہے (عبدالقیوم میر) سے ثابت ہو

ﻪ نیاز ہیں تو اس سے بھی خدا نہیں بن سکتے۔ کیونکہ موجب الوہیت وہ بے نیازی ہے جو ذاتی ہو اور جو خدا کی عطا سے ہو وہ موجب الوہیت نہیں' جیسے کہ معجزات جو حقیقت میں خدا کے افعال ہیں۔ لیکن خدا کے حکم سے نبی برحق کے ہاتھ پر ان کا ظہور ہوتا ہے دیگر یہ کہ کانا یا کلان میں لفظ ماضی ذکر کیا۔ جس میں اس امر پر دلالت ہو سکتی ہے کہ زمانِ گزشتہ میں وہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ لیکن اب نہیں کھاتے۔ پس کھانے سے استغنا تو قرآن شریف سے ثابت ہوا۔ آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں (مزید توضیح حصہ دوم میں صفحہ ۲۲۲ سے ص ۲۳۱ تک دیکھئے) ۱۲ سعادت منہ

چکا ہے۔ اور جناب مرزا صاحب نے ازالہ اوہام میں بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی توضیح کے ضمن میں اِلَيْهِ سے الی السماء مراد لی ہے۔ پس آیات رَافِعُكَ اِلَيَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ مسیح علیہ السلام کی توفی سے رفع آسمانی مراد لینے کے لئے قرائن قویہ ہیں۔ لہٰذا نظر بر آیات مثبتہ رفع فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے مراد فَلَمَّا رَفَعْتَنِي اِلَى السَّمَآءِ ہوگی نہ کچھ اور۔

جملہ تفاسیر معتبرہ مبسوطہ و وجیزہ میں تَوَفَّيْتَنِي سے مراد رَفَعْتَنِي لکھا ہے سالک شاہراہ یقین کے لئے اس بیان میں کفایت ہے۔ مگر متعسف مجرد پر اتمام حجت کے لئے مزید توضیح حصہ دوم میں کی جائے گی یان شاء اللہ تعالیٰ۔

مرزا صاحب قادیانی کا یہ مذہب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے معاذ اللہ اہانت صلیب برداشت کرنے کے بعد جو وجاہت کے منافی ہے۔ کشمیر کی طرف

ل اکمل صاحب غلط گوئی میں خاص کمال رکھتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں فلما توفیتنی کی تحقیق کو کسی اگلے حصے پر ٹالا ہے۔" (ص ۴۷) جواب۔ "بندۂ خدا کبھی تو درست لکھا کرو تحقیق تو ساری پوری کر کے یہاں اس کا خلاصہ بھی کر دیا گیا کہ کم علم لوگوں کو پچھلا پڑھا ہوا یاد آ جائے۔ اگلے حصے پر تو صرف مزید توضیح چھوڑی گئی تھی نہ کہ تحقیق" دیگر یہ کہ دوسرا حصہ بھی آپ کی تصنیف سے کئی سال پیشتر قادیاں میں پہنچ چکا تھا ذرا تکلیف اٹھا کر اسے بھی مطالعہ فرمایا ہوتا۔ اور دیکھا ہوتا کہ اس میں کیا مزید توضیح کی گئی ہے۔ پھر دونوں حصوں کی توضیح کا مقابلہ کر کے نظر کی ہوتی کہ پہلے حصے میں امر مقصود (رفع عیسوی) کے متعلق کیا کسر باقی چھوڑ دی گئی ہے۔ اکمل صاحب کی یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ عجب ناز و ادا سے لکھتے ہیں "کسی اگلے حصے پر" جناب! یہ "کسی" تنکیر کا کلمہ کیسا؟ جناب مرزا صاحب آنجہانی کی وفات سے پیشتر ڈھائی سال اور آپ (اکمل صاحب) کی تصنیف سے سوا تین سال پیشتر دوسرا حصہ قادیاں میں پہنچ چکا تھا۔ اور ملک میں شائع ہو چکا تھا۔ اس پر بھی آپ کلمہ تنکیر "کسی" فرما رہے ہیں۔ گویا کہ آپ کو اس کا نہ علم ہے نہ علم کی ضرورت ہے۔

دیگر یہ کہ لکھتے ہیں "ٹالا ہے" جناب! جس کے پاس قرآن و حدیث صحیح اور قواعد زبان عرب ہوں وہ ٹالے کیوں؟ ٹالے تو وہ جسے ان ہر سہ سے واسطہ نہ ہو یا ان کا علم نہ ہو۔ سعادت۔ منہ

ہجرت کی اور وہاں ستاسی سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ یہ سراسر باطل اور دروغ بے فروغ ہے۔ کیونکہ کلمہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سوال الہٰی ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ' الآیہ کے جواب میں واقع ہے۔ پس اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اہل کشمیر نے الٰہ نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ اہل شام اور اس کے قرب و جوار کے اشخاص نے۔

پس اہل شام جنہوں نے حضرت عیسیٰ کو معبود بنایا تھا۔ ان کی خبر بموجب قول مرزا صاحب[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بوجہ ہجرت الی الکشمیر آپ کی وفات سے ستاسی سال پیشتر منقطع ہو چکی ہے۔ اور اس ستاسی سال کی حیات مزعومہ مرزا صاحب میں عیسیٰ علیہ السلام کو اہل شام کے تغیر عقائد کی کوئی خبر نہیں کہ پیچھے انہوں نے کیا بنا لیا۔ پس سوال اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ کے جواب میں عذر موت صحیح نہیں ہے۔ بلکہ عذر خروج الی الکشمیر چاہیے[2] جب بدیں صورت ایک پیغمبر برحق تعلیم کردہ حضرت حق جل وعلا کے جواب میں قدح واقع ہوتی ہے۔ تو بالضرور معلوم ہوا کہ یہاں توفی سے مراد موت نہیں ہے۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرفوع الی السماء ہو کر اقوال نصاریٰ سے بے خبر ہو جانا جواب باصواب[3] ہے۔ اور یہ ثابت بھی

---

[1] عدم اطلاع کا عذر مرزا صاحب کے قول کے مطابق ذکر کیا گیا' چنانچہ شہادت القرآن حصہ دوم کے صفحہ ۲۹۹ و ۳۰۰ پر بھی بنا بر عدم اطلاع کا عذر ذکر کیا گیا' ورنہ ہماری تحقیق میں اس سے مراد اظہار برأت ہے چنانچہ شہادت القرآن حصہ دوم کے ص ۴۷ پر اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔ ۱۲ سعادت منہ

[2] اکمل صاحب قادیانی فرماتے ہیں یہ نہیں بتایا کہ عذر موت کن وجوہات سے باطل ہے۔ (ص ۴۸) جواب: جناب بتا تو دیا لیکن ۔ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم + چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ ۱۲ سعادت۔

[3] اکمل صاحب قادیانی سوال کرتے ہیں کہ وہ جب دنیا میں آئیں گے تو یہ لاعلمی کیسی؟ (ص ۴۸) جواب: اکمل صاحب نے اس سوال میں کوئی کمال نہیں دکھایا۔ یہ سوال تو میں نے (حصہ دوم کے ص ۲۹۹ پر) از خود کر کے اس کا کافی ووافی جواب دے دیا ہے۔ جو اکمل صاحب

ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی بارفع الی السمآء ہوئی ہے۔ تو اس لئے توفیتنی کے معنی رَفَعْتَنِیْ اِلَی السَّمَآءِ ہیں نہ کچھ اور۔ چنانچہ تفسیر سواطع الالہام میں ہے (فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ) اراد اِعْلَاءَہٗ مَصَاعِدَ السَّمَآءِ خدا تعالیٰ نے اس سے آسمان کی بلندیوں پر اٹھالینا مراد رکھا ہے۔

اور تفسیر کبیر اور خازن میں ہے۔ (فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ) یعنی فَلَمَّا رَفَعْتَنِیْ اِلَی السَّمَآءِ یعنی جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھالیا' اسی طرح دیگر تفاسیر میں بھی ہے۔

نویں آیت

مثبت رفع الی السما وَ جَعَلَنِیْ مُبَارَكًا اَیْنَمَا کُنْتُ.

(پ۱۶ مریم)

''اور خدا نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے جہاں کہیں میں ہوں'' (۳۱:۱۹)

وجہ استدلال یہ ہے کہ برکت خیر کثیر اور علو کو کہتے ہیں۔ جیسے آیت لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. (پ۹ اعراف۔ ۹۶:۷) میں برکت سے مراد خیر کثیر اور زیادت نعمت ہے۔ اور آیات صفات مثل فَتَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ (پ۸ اعراف) اور فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ. (پ۱۸

؎ صاحب کی تصنیف سے سوا تین سال پیشتر قادیاں میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن اکمل صاحب اس سے عشوہ نمائی کریں تو کسی کا کیا قصور؟ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نصاریٰ وغیرہ کے اقوال وافعال پر مطلع ہونے کے دو موقع ہیں۔ اول آسمان پر اٹھائے جانے سے پیشتر یعنی تبلیغ رسالت کے وقت دوم آسمان سے نازل ہونے کے بعد اور یہ مسلم ہے کہ نصاریٰ کے اعتقادات دونوں زمانوں کے درمیان یعنی زمانہ رفع میں بگڑے سو آپ کا قول وَ کُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ. ان دونوں زمانوں پر شامل ہے۔ چنانچہ آیت نزول میں فرمایا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکُوْنُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا (نساء پ۶۔ ۱۵۹:۴) فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ سے زمانہ مرفوعیت مراد ہے جو دونوں زمانوں کے درمیان ہے (جَمْعًا بَیْنَ الْاَدِلَّةِ) اور حضرت عیسیٰ کی مراد اس سے اظہار برأت ہے چنانچہ شہادت القرآن حصہ دوم کے ص ۲۱۷ پر تصریح کر دی گئی ہے۔ ۱۲ سعادت' منہ

مومنون) اور تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ (پ ۲۹ ملک) اور تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ۔ (پ ۱۸ فرقان) اور بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ[1] (پ ۱۹ نمل) میں مراد علو ہے۔ اور واضح ہو کہ حضرت روح اللہ علیہ السلام میں یہ ہر دو امر باحسن وجہ پائے جاتے ہیں۔ خیر کثیر۔ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے اور نزول مائدہ کی دعا کے قبول ہونے سے ظاہر[2] ہے۔ (قرآن مجید)

---

[1] اس آخری آیت میں اگر مَنْ سے مراد ذات حق سبحانہ ہو جیسا کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے تو برکت سے مراد علو ہوگا۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام یا ملائکہ ہوں تو دوسرے معنی یعنی خیر کثیر مراد ہیں۔ اکمل صاحب اس پر کہتے ہیں کہ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ کے آگے وَمَنْ حَوْلَهَا بھی آیا ہے۔ مدارک میں لکھا ہے۔ وَمَنْ حَوْلَ مَکَانِهَا اَیْ موسیٰ علیہ السلام تو کیا موسیٰ بھی آسمان پر چڑھے تھے' (ص ۴۸) جواب: موسیٰ علیہ السلام تو آسمان پر نہیں چڑھے لیکن آپ سمجھ نہیں سکے۔ اگلی سطروں میں صاف لکھا ہے کہ معنی ثانی یعنی علو بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں مصرح ہے۔ ۱۲۔

[2] اکمل قادیانی مذاق علمی خصوصاً علم معقول سے کامل طور پر بے بہرہ ہیں ان معجزات پر فرماتے ہیں اگر خیر کثیر سے مراد کوڑھیوں کا ہی چنگا کرنا ہے تو آسمان پر کون سے مردوں کو زندہ کر رہے اور کون سے اندھوں کو آنکھیں دے رہے ہیں؟ (ص ۴۸) جواب: بندۂ خدا قضیۂ مطلقہ میں اعتبار لا دوام کا ہوتا ہے جیسا کہ حواشی سابقہ میں گزر چکا۔ اور اس کا ثبوت بالفعل وفی الجملہ احد از منہ ثلاثہ میں کافی ہوتا ہے نبی صادق عیسیٰ علیہ السلام تبلیغ رسالت کے وقت دلیل صداقت میں یہ امر واقعات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اصدق القائلین اپنے کلام میں سے نقل کرتا ہے اور قیامت کے دن بھی واقعات گزشتہ کی صورت میں بطور امتنان حضرت عیسیٰ کو جتائے گا۔ پس اس کے ثبوت میں کیا شک رہا؟ لیکن چونکہ مرزا صاحب قادیانی ان معجزات کے قائل نہیں تھے۔ وہ انہیں مسمریزم اور عمل الترب جانتے تھے۔ (ازالہ اوہام جلد اول)

اس لئے آپ ان کی تصدیق نہیں کر سکتے وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ اور سنئے جناب مرزا صاحب نے بھی ان معجزات عیسویہ علیہ السلام سے بنا بر علم و تحقیق انکار نہیں کیا بلکہ ایک مشکل سے بچنے کے لئے حیلہ نکالا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی سرخی اس مضمون کی باندھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام ابن مریم نے مردوں کو زندہ کیا۔ کوڑھیوں کو چنگا کیا اس کے مقابلہ میں مثیل مسیح نے کیا کیا؟ (شروع ازالہ اوہام صفحہ) پھر اس کے ضمن میں ان تو

اور دہ برکات وخیرات جو آپ کے نزول پر ہوں گی مثلاً دشمنی اور بغض اور حسد کا دور ہو جانا اور مال کا کثرت سے ہو جانا اور لوگوں میں دنیا کی نسبت عاقبت کی طرف رغبت کا زیادہ ہونا اور پھلوں اور دودھ کا معمول سے بہت زیادہ ہو جانا اور شیر اور بکری کا امن سے باہم چرنا وغیرہ ذالک ہے۔(صحیح مسلم ودیگر کتب حدیث)

لے معجزات کا انکار کیا ہے۔ پس مرزا صاحب کا یہ انکار اس شعر کا مصداق ہے۔ زاہد نداشت تاب وصال پری رخاں + کنجے گرفت وخوف خدا را بہانہ ساخت۔ ہاں یہ بھی سن لیجئے۔ کہ جناب مرزا صاحب ان معجزات کی نسبت یہ رائے بھی رکھتے تھے۔ "اگر میں ان عملیات کو مکروہ و قابل نفرت نہ سمجھتا۔ تو ان اعجوبہ نمائیوں میں مسیح علیہ السلام بن مریم سے کم نہ رہتا (ازالہ ملخصاً) پھر بھلا' آپ ان معجزات کی حقیقت پر کس طرح ایمان رکھ سکتے ہیں۔ ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں + رو بسوئے خانہ خمار دارد پیر ما۔۱۲ سعادت

لے گستاخی و بے ادبی کی روح خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں شوخی و سوئے ادبی کی روح تمام مرزائیوں میں حلول کئے ہوئے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہتک و بے ادبی اگر مرزا صاحب کی غذا تھی تو مرزائیوں کا مایۂ حیات ہے۔ چنانچہ اکمل صاحب نہایت شوخی سے لکھتے ہیں۔ "وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا میں آسمان کا رفع کس طرح ثابت ہو۔ جب کہ آپ ہی کے ہم خیالوں کی طرف سے آواز آرہی ہے۔ آپ عمر بھر میں نصاب کے مالک نہیں ہوئے۔ پس دنیاوی برکات کا حصہ مال و اولاد کے سوا اور کیا ہے اور یہاں تو اولاد تو درکنار خیر سے آپ کی عورت ہی کوئی نہ تھی۔ نہ صاحب نصاب' نہ رہنے کو مکان۔" (ص ۳۸)

جواب: (۱) جناب عقل کے پیچھے لٹھ لے کر کیوں پڑے ہیں۔ بھلا رفع آسمان کے انکار سے ان امور کا کیا تعلق؟ (۲) جناب والا ہمارے ہم خیال یہ امور اس طریق پر بیان نہیں کرتے یہ طریق قادیانیوں ہی کو مبارک ہو از خدا خواہیم توفیق ادب۔ بے ادب محروم ماند از فضل رب۔ اور جو اس طریق پر بیان کرے وہ ہمارا ہم خیال نہیں۔ (۳) نبی صادق کے مناسب حال تقلیل یا ترک لذائذ اور زہد و درویشی ہے۔ اکمل صاحب کو زہد و درویشی مجمع مصائب و نقائص کے نظر آئے ہیں کیونکہ ان کے نبی و رسول قادیان کے ہاں لذائذ کا استعمال بکثرت تھا۔ لیکن اہل اللہ کے لئے زہد و درویشی صرف مناسب حال ہی نہیں بلکہ ان کو ان سے اکتساب فضائل میں بہت مدد ملتی ہے اور سلوک الی اللہ میں سہولتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ ماسوائے اللہ کے شغل سے چھوٹے رہتے ہیں فتفکر فانہ لطیف جداً پس اگر یہ اسباب دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھے۔ تو اس میں آپ کی منقبت ہے۔ نہ کہ منقصت (۴) اہل اللہ اور انبیاء اللہ کے مبارک ہونے

اور معنی علو آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ میں مصرح ہے وہ بھی آپ کو حاصل ہے پس جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ احوالِ ثلاثہ یعنی قبل رفع اور زمان رفع (عہد مرفوعیت) اور بعد نزول کے ہرسہ سے لحاظ کی ہے اسی لئے اَیْنَمَا کُنْتُ فرمایا جس کا مفاد اتساع ہے فافہم وتدبر۔

لہ ہونے کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ خود ان کے پاس طعام دنیوی کے انبار لگے رہیں' بلکہ ان کی برکت کا اثر لوگوں پر پڑتا ہے۔ اور بعض تفاسیر سے جو آپ نے مبارک کے معنی نفّاعًا لِلْخَیْرِ نقل کیے ہیں۔ اس کے یہی معنی ہیں لیکن آپ اس کو سمجھے نہیں۔ حدیث میں ہے خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ (مشکوٰۃ) (۵) نصاب کے مالک تو آنحضرت ﷺ بھی نہیں ہوئے۔ اب سنائیے کیا ارشاد ہے فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہی طعن کیا تھا کہ وہ مالدار نہیں فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (زخرف پ۲۵) اور آنحضرت ﷺ پر بھی مکہ کے مشرکوں نے یہی اعتراض کیا تھا (زخرف۔ فرقان۔ بنی اسرائیل۔ ہود) یہی چال چال قادیانیوں کی ہے اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ. ۱۲ سعادت الاقران۔

لہ اکمل صاحب بھی سمجھ میں خوب کامل ہیں جو سمجھانے سے بھی نہ سمجھے وہ اکمل کیوں بنے؟ آپ فرماتے ہیں۔ "یہ لفظ برکت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی سے خاص نہیں دیکھو حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے لئے وَ بٰرَکْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ یعنی دونوں نبی مبارک تھے کیا یہ بھی آسمان پر اٹھائے گئے تھے؟ پھر فرماتے ہیں حضرت! یہ لفظ تو اکثر مقامات کے بارے میں بھی آیا ہے الارض الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا الخ (ص ۴۸) جواب۔ ہاں حضرت! لفظ برکت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خاص نہیں بلکہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ تو ان سے خاص ہے۔ آپ شہادۃ القرآن کے اس مقام کو مطلقاً نہیں سمجھے جناب میں نے تو بالتصریح لکھ دیا تھا۔ کہ معنی ثانی یعنی علو آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں مصرح ہے۔ اس پر بھی آپ نہ سمجھیں تو کوئی کیا کرے علمی بات کریں تو۔ اور اگر بالتصریح کھول کر بیان کریں تو۔ آپ کچھ سمجھتے تو ہیں نہیں۔ پھر آپ کو سمجھائیں کس طرح؟ اچھا ایک دفعہ اور کوشش کرتے ہیں۔ شاید آپ سمجھ جائیں۔ سنیے! شہادت القرآن کے اس مقام کا حل یوں ہے کہ برکت کے دو معنی ہیں خیر کثیر اور علو۔ یہ دونوں باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھیں خیر کثیر کی تفصیل میں قرآن و حدیث میں فلاں فلاں امور مذکور ہیں۔ اور علو کا ذکر آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں سے ہے گویا یہ سب مقامات قرآنیہ وحدیثیہ آیت جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ پس اس کی تفسیر قرآن وحدیث میں مذکور ہے اس کے رو سے یہ مراد لی گئی۔ اور چونکہ یہ سب باتیں تین لہ

شہادت القرآن

اس آیت کے ذیل میں رفع الی السماء کی تصریح تفسیر کبیر اور تفسیر سراج منیر[1] میں موجود ہے۔

دوسری قسم:۔

دوسری قسم دلیل کی جس سے ہر سہ امور یعنی صعود الی السماء اور حیات الی الآن اور نزول فی آخر الزمان ثابت ہیں۔ احادیث مرفوعہ صحیحہ صریحہ ہیں جو بموجب آیات مندرجہ ذیل واجب القبول ہیں۔

(۱) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ. (شوریٰ پ ۲۵)

حالات میں پوری ہوئی ہیں۔ اور ان کے مواقع مختلف ہیں اس لئے اینما کنت جو مفید اتساع ہے فرمایا گیا۔ اب بتایئے اب بھی سمجھے یا نہیں؟ اگر اس پر بھی نہ تم سمجھے تو پھر تم سے خدا سمجھے اور چونکہ حضرت ابراہیم اور اسحٰق علیہما السلام کے لئے قرآن و حدیث میں علو کی یہ صورت مذکور نہیں اس لئے ان کی برکت کی بھی یہ صورت نہیں ہوگی۔ فافہم وتدبر لعلک ترشد ۱۲ اسعادت القرآن۔

[1] ہمارے اکمل صاحب جس طرح بات کے نہ سمجھنے میں خوب کامل ہیں۔ اسی طرح نقصانِ مطالعہ میں بھی بہت کامل ہیں۔ اس آیت میں رفع الی السماء کے ذکر کی تصریح کے لئے تفسیر کبیر اور تفسیر سراج منیر کے نام لکھے ہیں۔ اس پر بھی اکمل صاحب فرماتے ہیں "برکت میں علو اور علو بھی جسمانی کا ثابت کرنا ایجاد بندہ سے کم نہیں۔" (ص ۴۸)

جواب:۔ سبحان اللہ اس بے مائگی پر اکملیت کا دعویٰ!!۔

بت کریں آرزو خدائی کی شان تیری ہے کبریائی کی

جناب والا۔ میں نے تو دو تفسیروں کے نام لکھ دیئے تھے۔ پھر ایجاد بندہ کے الزام کے کیا معنی؟ ۱۲ سعادت منہ

"اور کوئی بشر اس لائق نہیں کہ خدا اس سے (بالمشافہ) ہمکلام ہو۔ مگر وحی کے طور پر (ہمکلام ہوتا ہے) یا ازپس پردہ۔ یا وہ کوئی فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے جو کچھ کہ وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے بیشک وہ (اللہ) بڑا عالی ذات اور حکمت والا ہے۔" (۵۱:۴۲)

اس آیت میں نبیٔ برحق کے پاس فرشتے اور آوازِ غیبی کے سوا بھی وحی (پیغامِ الٰہی) پہنچنے کا ذکر ہے جو الہامِ قلبی کی صورت میں ہوتا ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ کوئی امر جو اسے بتانا منظور ہو نبیٔ برحق کے دل پر القا کر دیتا ہے۔

(۲) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (النجم پ ۲۷)

"اور یہ (ہمارا رسول) اپنی خواہش سے نہیں بولتا (امرِ دین میں) جو کچھ بھی بولتا ہے۔ وہ (خدا کی) وحی ہوتی ہے۔ جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔" (۴:۵۳)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے دینی نطق کو وحی کہا ہے۔

(۳) وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ. (حشر پ ۲۸)

"اور جو کچھ تم کو ہمارا رسول دے۔ وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے باز رہو۔ اور (اس کی مخالفت کی صورت میں) خدا سے ڈرو بے شک اللہ سخت عذاب والا ہے"۔ (۷:۵۹)

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کی خلاف ورزی کو موجب عذاب گردانا ہے:-

(۴) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ. (القیامہ پ ۲۹)

پھر (تم کو اے ہمارے رسول) اس (قرآن) کا بیان و تفسیر (سمجھانا) بھی ہمارا ہی ذمہ ہے۔ (۱۹:۷۵)

اس آیت میں فرمایا کہ ہم اپنے رسول کو اپنے کلام کی تفسیر بھی خود

سمجھائیں گے۔

(۵) وَمَآ اَنزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ. (نحل پ۱۴۔۱۶:۶۴)

''اور (اے پیغمبر!) ہم نے (خاص) تم پر (یہ) کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے۔ کہ تم دیگر لوگوں کو وہ باتیں واضح کر کے سمجھا دو۔ جن میں انہوں نے اختلاف کیا ہے''۔

اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اختلاف کے وقت حق اس طرف ہوگا۔ جس طرف رسول اللہ ﷺ کا بیان ہوگا۔

(۶) وَ اَنزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ. (نحل پ۱۴۔۱۶:۴۴)

''اور (اے پیغمبرؐ!) ہم نے تمہاری طرف یہ نصیحت نامہ اس لئے نازل کیا ہے۔ کہ تم لوگوں کو وہ (حکم) جو ان کے لئے اتارا گیا خوب واضح کر کے سمجھا دو۔''

اس آیت سے ثابت ہوا۔ کہ حدیث نبوی آیتِ قرآنی کی تفسیر ہوتی ہے اور مرادِ الٰہی کی مبین۔ پس اگر کوئی شخص کسی آیت قرآنی کی ایسی تفسیر کرے۔ جو کسی حدیثِ نبوی کے خلاف ہو تو اس کی وہ تفسیر غلط اور ناقابلِ اعتبار ہوگی۔

پس ان آیات کے رو سے احادیث ذیل میں اس امر کا فیصلہ ہے کہ نازل ہونے والا مسیح علیہ السلام وہ ہے جو ابن مریم رسول اللہ ہے۔ جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ اور یہ کہ وہ آسمان سے نازل ہوگا۔ اور نزول کے کئی سال بعد فوت ہوگا اور مدینہ طیبہ داخل حجرۂ نبویہ علیٰ صاحبہا السلام والتحیہ مدفون ہوگا۔

حدیث اوّل:۔

عن ابی هریرة قَالَ قَالَ رسول الله صلی الله علیه وسلّم والّذی نفسی بیده لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حَکَمًا

عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر و یضع الحرب و یفیض المال حتّٰی لا یقبله احد حتّٰی تکون السجدة الوَاحدة خیرًا من الدنیا وما فیها ثم یقول ابوھریرة واقرؤا ان شئتم و ان من اھل الکتاب اِلا لیومنن به قبل موته و یوم القیمة یکون علیھم شھیدًا. (صحیح بخاری باب نزول عیسٰی)

''ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم عنقریب ابن مریم (علیہ السلام) تم میں اتریں گے حاکم عادل ہو کر پھر وہ (عیسائیوں کے معبود) صلیب کو توڑ دیں گے۔ اور خنزیر کو قتل کرا دیں گے اور (بوجہ غلبۂ اسلام) جہاد موقوف کر دیں گے۔ اور مال اتنا فراواں ہو جائے گا کہ کوئی شخص قبول نہ کرے گا۔ یہاں تک کہ ایک سجدہ ساری دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہوگا۔ پھر ابو ھریرہؓ نے کہا۔ تم اس کی تصدیق چاہتے ہو تو پڑھ لو یہ آیت کہ ''ہر ایک اہل کتاب حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مرنے سے پہلے ان پر ایمان لائے گا اور دن قیامت کے ان پر گواہ ہوگا۔''

اس حدیث اور اس کے بعد کی احادیث کا جس قدر تعلق مسئلہ نزول مسیح علیہ السلام سے ہے اسے ہم کسی اور رسالہ کے لئے چھوڑتے ہیں۔ یہاں پر صرف حیات ورفع سماوی کا اثبات مقصود ہے۔ اس لئے صرف انہی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سو واضح ہو کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو اس حدیث کی تصدیق میں یہ آیت پڑھی اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک اس حدیث میں اس مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر ہے۔ جس کا ذکر آیت وَ اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ الخ میں ہے اور یہ مسلم فریقین ہے کہ اس آیت میں حضرت عیسٰی بن مریم نبی اللہ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ پس اس حدیث میں بھی اسی عیسٰی بن مریم نبی اللہ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر ثابت ہوئی۔ اور چونکہ زمان قبل النزول میں حیات ضروری

ہے اس لئے ثابت ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت تک زندہ ہیں۔ وھذا ھوالمقصود۔

دیگر یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک اس آیت میں قَبْلَ مَوْتِہٖ کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

ففیه دلالة ظاهرة علٰی منهب ابي هريرة في الآية ان الضمیر فی موته یعود علی عیسٰی علیه السلام.

(ص ۸۷ جلد اوّل باب نزول عیسیٰ)

''اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کے مذہب کی صریح دلیل ہے کہ اس آیت میں مَوْتِہٖ کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جاتی ہے''۔

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:-

وهذا مصير من ابي هريرة الى ان الضمير في قوله ليؤمنن به وكذالك في قوله قبل موته يعود علٰى عيسٰى اى ليومنن بعيسٰى قبل موت عيسٰى وبهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير من طريق سعيد بن جبير عنه باسناد صحيح و من طريق ابي رجاء عن الحسن قال قبل موت عيسٰي والله انه الأن لحيٌّ ولكن اذا نزل امنوا به اجمعون.

(فتح الباری مطبوعہ دھلی جز ۱۲، ص ۲۸۱)

''(اس سے ظاہر ہے کہ) حضرت ابو ہریرہؓ کا مذہب یہ ہے کہ قول الٰہی لیؤمننّ بہ میں اور اسی طرح قول الٰہی قبل موتہ میں ضمیر (ہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ پس معنی اس آیت کے یہ ہوئے کہ (سب اہل کتاب) حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی موت سے پیشتر ایمان لے آئیں گے اور اسی بات پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جزم کیا ہے مطابق اس کے جو امام ابن جریر نے آپ سے بطریق سعید بن جبیر باسناد صحیح روایت کیا ہے اور نیز بطریق ابی رجاء حضرت حسن بصری سے روایت کیا کہ انہوں نے (اس کے متعلق) کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے (ایمان لے آئیں گے) خدا کی قسم آپ اس وقت بالضرور زندہ ہیں۔ جب آپ نازل ہوں گے تو سب (اہل کتاب) آپ پر ایمان لے آئیں گے۔''

چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ اِقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ جمع کے صیغوں سے کہتے ہیں' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجمع عام میں پکار کر یہ آیت پڑھا کرتے تھے اور کسی روایت میں مذکور نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے کسی نے بھی انکار کیا ہو۔ اس لئے سب جماعت صحابہ و تابعین کا یہی مذہب سمجھا جائے گا۔ کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے اور یہ کہ وہ زندہ ہیں۔ اور زمانہ اخیر میں نازل ہوں گے۔ اور یہ بھی اجماع سکوتی کی ایک صورت ہے۔

(۲) اگرچہ حضرت ابو ہریرہؓ کے اس آیت کے پڑھنے سے صاف کھل جاتا ہے۔ کہ اس حدیث میں جس مسیح علیہ السلام کے آنے کی خبر دی گئی ہے وہ وہی مسیح علیہ السلام ہے جس کا ذکر اس آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ الخ میں ہے۔ لیکن ہم اس کے علاوہ ایک اور حدیث بھی ذکر کرتے ہیں۔ جس سے علاوہ حیات مسیح علیہ السلام کے ثبوت کے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آنے والا مسیح وہی نبی اللہ ہے جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہے۔ نہ کہ ان کا کوئی مثیل۔

دوسری حدیث:۔

(۲) عن ابی هريرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال

---

[1] حضرت ابو ہریرہؓ نے نزول عیسیٰ کے متعلق جو یہ آیت پڑھی اس کی مزید تشریح شہادت القرآن حصہ دوم میں دیکھو۔ ۱۲ منہ

ليس بيني و بينه يعني عيسٰى عليه السلام نبي و انه نازل فاذا رايتموه فاعرفوه رجل مربوع إلَى الحمرة والبياض بين مُمَصَّرتين كان راسه يقطرو ان لم يصبه بلل فيقاتل الناس على الاسلام فيدق الصليب و يقتل الخنزير و يضع الجزية ويهلك الله في زمانه الملل كلها الا الاسلام ويهلك المسيحُ الدجالَ فيمكث في الارض اربعين سنة ثم يتوفٰي فصلي عليه المسلمون. (ابوداؤد جلد۲۔ص۲۳۸)

''حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں اور تحقیق وہی اترنے والے ہیں۔ پس جب تم ان کو دیکھو تو (یوں) پہچان لینا کہ ان کا چہرہ سرخی سفیدی لئے ہوگا۔ درمیان دو رنگ دار چادروں کے' ان کا سر (چمک سے) قطرے گراتا معلوم ہوگا اگرچہ اسے تری نہ پہنچی ہو۔ پھر وہ (یہ کام کریں گے کہ) اسلام کی حمایت میں (دیگر) لوگوں سے قتال کریں گے۔ پس صلیب کو پاش پاش کردیں گے۔ اور خنزیروں کو قتل کروا دیں گے اور جزیہ موقوف کردیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا سب مذاہب (باطلہ) کو تباہ کردے گا اور آپ (کانے) دجال کو قتل کریں گے۔ پھر چالیس سال تک زمین پر (باحکومت) رہیں گے۔ پھر فوت ہوں گے اور مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے۔''

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے۔ کہ آنے والا مسیح علیہ السلام وہی نبی اللہ ہے جس کے بعد آنحضرت ﷺ نبی ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی مصرح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد فوت ہوں گے۔

فائدہ:-

یہ حدیث مسند امام احمدؒ میں بھی موجود ہے اور اس کے سب راوی ثقہ اور

مقبول ہیں۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس کی اسناد کو صحیح لکھا ہے۔

تیسری حدیث:۔

عن عبداللّٰہ بن عمرو (بن العاص) قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینزل عیسٰی بن مریم الی الارض فیتزوج ویولد لہ ویمکث خمسا و اربعین سنۃ ثم یموت فیدفن معی فی قبری فاقوم انا و عیسٰی بن مریم فی قبر واحد بین ابی بکر و عمر. (رواہ ابن الجوزی فی کتاب الوفاء) (مشکوٰۃ باب نزول عیسٰی بن مریم ص ۴۷۲)

"عمرو بن عاصؓ (فاتح مصر) کے بیٹے عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عیسٰی بن مریم علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ پس نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی اور پینتالیس سال[1] تک رہیں گے۔ پھر فوت ہوں گے اور میرے پاس میرے مقبرے[2] میں دفن ہوں گے پھر میں اور عیسٰی بن مریم علیہ السلام ایک ہی مقبرے سے اٹھیں گے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان[3]۔" اس حدیث میں بھی صاف طور پر مذکور

---

[1] اس حدیث میں میعاد پینتالیس سال اور حدیث نمبر ۲ میں چالیس اور بعض دیگر میں ان سے کم مذکور ہے۔ اس اختلاف کی وجہ اختلاف لحاظات و اضافات ہے۔ حضرت عیسٰیؑ کے نزول پر بہت سے واقعات عظیمہ واقع ہوں گے۔ پس کسی واقعہ کے بعد مدت کتنی ہوگی۔ اور کسی کے بعد کتنی ۱۲ اھذا دقیق فخذبہ. سعادت منہ

[2] اس جگہ قبر بمعنی مقبرہ ہے۔ یعنی مصدر بمعنی اسم ظرف۔ (مرقاۃ اشعۃ اللمعات) اور مصدر کا اپنے مشتقات کے معنوں میں آنا مسلم کل ہے جیسے "زید عدل" اور قاموس میں نہر کے معنی لکھے ہیں۔ مجری الماء یعنی پانی کے جاری ہونے کی جگہ یعنی مصدر بمعنی اسم ظرف ہے۔

[3] روضۂ اطہر میں قبور ثلثہ (آنحضرت ﷺ کی اور حضرت ابوبکرؓ کی اور عمرؓ کی قبروں کے درمیان ایک قبر کی جگہ خالی پڑی ہے اور مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابو مودود مدنی تابعی سے مروی ہے کہ روضۂ اطہر میں ایک قبر کی جگہ باقی پڑی ہے (جہاں حضرت عیسٰیؑ دفن ہوں گے)۔ ۱۲ سعادت منہ۔

ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نازل ہونے کے بعد فوت ہوں گے اور آنحضرت ﷺ کے روضۂ اطہر میں مدفون ہوں گے۔[1]

نکتہ:-

علاوہ بریں اس حدیث[2] میں ایک نہایت لطیف نکتہ بھی ہے۔ جس سے بلا ریب ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک فوت نہیں ہوئے۔ وہ یہ کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا فَيُدْفَنُ مَعِي یعنی حضرت ابن مریم

---

[1] حضرت عیسیٰ کی قبر کے متعلق ہمارا ایک رسالہ الخبر الصحیح عن قبر المسیح مدت سے شائع ہے۔ ۱۲ منہ

[2] تصحیح حدیث:- اس حدیث کی صحت پر مرزا صاحب قادیانی کے بھی دستخط ہیں۔ وہ اس طرح کہ مرزا صاحب نے کہیں دیکھ لیا یا سن لیا۔ کہ اس حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نکاح اور ان کے ہاں اولاد ہونے کا بھی ذکر ہے۔ ادھر مرزا صاحب نے محمدی بیگم......... کے متعلق الہام شائع کر رکھا تھا۔ کہ یہ میرے نکاح میں آئے گی۔ جس کے انتظار میں دن رات باچشم گریاں و دل بریاں گذرتے تھے۔ اور تحصیل مطلب کے لئے کئی قسم کے اندرونی اور بیرونی ڈورے بھی ڈال رکھے تھے۔ آپ موقع شناس تو تھے ہی' جھٹ لکھ مارا کہ اس پیشگوئی یا نکاح کی تصدیق خود آنحضرت ﷺ نے بھی کر دی ہوئی ہے۔ اور اس نکاح کو مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کی علامت قرار دیا (حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم ص ۵۳ و شہادت القرآن۔ ہر دو مصنفہ مرزا صاحب قادیانی) اگرچہ زندگی بھر مرزا صاحب کی یہ آرزو برنہ آئی۔ اور محمدی بیگم کا نکاح مرزا صاحب کی وفات سے سالہا پیشتر دوسرے شخص سے ہو گیا۔ جسے مرزا صاحب نے اپنے حق میں "ایک تلوار" قرار دیا۔ لیکن اس پیشگوئی سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب نے اس حدیث کی صحت پر مہر لگا دی۔ کیونکہ مرزا صاحب نے اس حدیث کو اپنی پیشگوئی کی تصدیق کے لئے بطور دلیل گذارا۔ اور مستدل مقام احتجاج میں وہ دلیل پیش کیا کرتا ہے۔ جو اس کے نزدیک صحیح ہو پس یہ حدیث مرزا صاحب کے نزدیک صحیح ٹھہری۔ اس لئے مولوی غلام رسول صاحب آف راجیکی مبلغ قادیانی نے اپنی کتاب "تفہید" میں اگرچہ اس حدیث کی تاویلات فاسدہ سے زمین و آسمان کے قلابے ملانے چاہے ہیں لیکن اس کی صحت کو کان دبا کر تسلیم کر گئے۔ فتشکر۔ سعادت منہ

شہادت القرآن

فوت ہونے کے بعد میرے پاس (میرے پہلو میں) دفن کیے جائیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات آنحضرت ﷺ کی وفات سے متاخر ہوگی کیونکہ مقام لحوق پر ملحق یالاحق ملحق بہ سے متاخر ہوتا ہے۔ یعنی پیچھے سے ملنے والا پہلے سے مؤخر ہوتا ہے۔ پس جب زمانہ نبی کریم ﷺ تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات واقع نہیں ہوئی۔ اور آپ ﷺ کے بعد بھی ابھی تک نہیں ہوئی تو اب ہم اس حدیث کے برخلاف کس کے کہنے سے مان لیں کہ وہ (مسیح علیہ السلام) آنحضرت ﷺ سے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ تشکّرُ وَ خُذْبِهٖ فَاِنَّهٗ لَطِيْفٌ جِدًّا۔

چوتھی حدیث:۔

عن ابن هريرة انه قال قال رسول الله صلى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَآءِ فِيْكُمْ وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ. (کتاب الاسماء والصفات للامام البیہقی ص ۳۰۲)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کیسے (اچھے حال میں) ہو گے جب تم میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور اس وقت تمہارا امام (سلطانِ وقت) تم ہی میں سے ایک ہوگا۔"

اس حدیث میں آسمان سے نازل ہونے کی تصریح خود آنحضرت ﷺ کے الفاظ طیبہ میں موجود ہے۔

پانچویں حدیث:۔

(۵) عن ابن عباسٍ فی حدیثٍ طویلٍ فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَنْزِلُ اَخِيْ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَآءِ. (مختصر کنز العمال برحاشیہ مسند احمد)

"ایک لمبی حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ باتیں واقع ہوں گی تو اس وقت میرا بھائی عیسیٰ علیہ السلام بن مریم آسمان سے نازل ہوگا۔"

اس حدیث میں بھی آسمان[1] سے نازل ہونے کی صراحت ہے۔

[1] بہت افسوس ہے کہ اکمل صاحب قادیانی کا ان احادیث پر آ کر بالکل دم ٹوٹ گیا۔ اور ان کے متعلق غلط یا صحیح روایۃً یا درایۃً کوئی بھی اعتراض نہ لکھ سکے۔ اس نیم تسلیم پر ہم ان کو مبارک باد کہتے ہیں۔ لیکن زیادہ تعجب و افسوس کے قابل مرزا صاحب کی دلیری ہے کہ بلا دیکھے بھالے اور علم حدیث پڑھے بغیر اپنی کتاب ''چشمۂ معرفت'' میں نہایت بے خوف ہو کر لکھتے ہیں کہ کسی ضعیف حدیث میں بھی مذکور نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے۔ ملخصاً)

مولوی غلام رسول صاحب قادیانی کی جرأت قابلِ ستائش ہے کہ اصالۃً تو اس حدیث نمبر ۲ کا انکار نہیں کر سکے۔ لیکن اس کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ بحیثیت ایک احمدی (امت مرزا غلام احمد قادیانی) ہونے کے مرزا صاحب کی تحریر کے خلاف وہ صحت کا مطالبہ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ مرزا صاحب سلب کلی کر رہے ہیں۔ یعنی صحیح و ضعیف ہر طرح کی ایسی حدیث سے انکار کر رہے ہیں۔ جن میں حضرت عیسیٰ کا آسمان سے اترنا مذکور ہو۔ اور مولوی غلام رسول صاحب ان کے برخلاف سلب جزئی کرتے ہیں جس سے طرف مقابل میں ایجاب جزئی بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی صرف صحیح حدیث میں وارد ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ اور ضعیف حدیث کا انکار نہیں کرتے۔ لیکن حدیث نمبر ۲ جو امام بیہقی کی روایت سے ہے۔ وہ ایسی ہے جس میں مولوی غلام رسول صاحب کا بھی مطالبہ پورا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ امام بیہقیؒ نے اسے بطریق امام بخاریؒ روایت کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ سے اوپر وہی راوی ہیں جو صحیح بخاری میں ہیں۔ مولوی غلام رسول صاحب اس حدیث کی صحت میں یہ عذر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے۔ ''رواہ البخاری'' حالانکہ صحیح بخاری کے کسی نسخہ میں مِنَ السَّمَآءِ کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ مولوی غلام رسول صاحب نے علم حدیث کسی ماہر استاد حدیث سے نہیں پڑھا۔ اور یہ بات ہم ان کی خدمت میں بارہا مناظروں میں عرض کر چکے ہیں۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ امام بیہقیؒ نے اس حدیث کو بالاستقلال اپنی روایت سے ذکر کیا ہے۔ اور وہ فن روایت کے مستقل صاحب روایت ہیں۔ امام بخاریؒ تک پہنچ کر اوپر کے سب شیوخ وہی ہیں۔ جو امام بخاریؒ کے ہیں۔ گو امام بخاریؒ کی روایت میں مِنَ السَّمَآءِ کے الفاظ نہ ہوں۔ لیکن امام بیہقیؒ کی روایت میں موجود ہیں۔ اور محدثین کے نزدیک حافظ و ثقہ راوی کی زیادت مسلم و مقبول ہے۔ (کتب اصول حدیث) چونکہ امام بیہقیؒ کے سب شیوخ ضابطہ و ثقہ

تیسری قسم:

دلیل کی تیسری قسم اجماع امت[1] ہے۔ ذیل کی آیت اور حدیث میں اس کی

ثقہ ہیں۔ اس لئے ان کی من السماء کی تصریح جو بخاری سے زائد ہے۔ وہ مقبول و مسلم ہوئی۔

اور امام بخاریؒ کی طرف اس روایت کو اس لئے منسوب کیا کہ اصل اس کی صحیح بخاری میں بھی ہے۔ اور امام بخاریؒ کے بعد کے محدثین کا دستور رہا ہے کہ وہ کسی ایسی روایت کو توثیق و تصحیح کے لئے جس کا اصل مضمون صحیح بخاری میں موجود ہو کہہ دیا کرتے ہیں اصلہ فی البخاری. یا اسی طرح کے اور الفاظ۔ اگرچہ الفاظ میں کمی بیشی ہو۔

دیگر یہ کہ بعض وقت احادیث میں تطابق معنوی طور پر دیا جاتا ہے۔ اور مضمون مشترک کے لحاظ سے حوالہ کسی ایک کتاب کا دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ الفاظ میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخر ہوتا ہے۔ اگر مولوی غلام رسول صاحب کتاب مشکوۃ المصابیح بھی کسی ماہر محدث سے پڑھتے تو اس کی قریباً ہر فصل اول میں ان کو کئی ایک احادیث ایسی ملتیں جن میں حوالہ متفق علیہ کا ہے۔ لیکن الفاظ ان میں سے ایک کے ہیں۔ اسی طرح الفاظ "كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ" جو صحیح بخاری میں ہیں اور الفاظ "كيف انتم اذا نزل ابن مريم من السماء فيكم" جو امام بیہقیؒ کے ہیں۔ ان میں از روئے معنی کوئی فرق نہیں۔ اور مضمون مشترک دونوں میں ایک ہی ہے۔ دور نہ جایئے خاتمۃ الحفاظ حضرت حافظ ابن حجر فتح الباری میں باب نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی شرح میں وہ حدیث جو ہم نے متن میں نمبر ۲ پر بروایت امام ابوداؤد لکھی ہے' بروایت احمد وابی داؤد نقل کرتے ہیں' اور حدیث کو جن الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔ وہ الفاظ امام احمدؒ کی روایت میں موجود ہیں' اور ابوداؤد کی روایت میں پورے نہیں ہیں۔

امام احمدؒ کی روایت میں مضمون زیادہ ہے۔ اور امام ابوداؤدؒ کی روایت میں مختصر ہے۔ لیکن حافظ صاحبؒ حوالہ دونوں کتابوں کا دیتے ہیں۔ اسی طرح امام بیہقیؒ کی روایت میں الفاظ زیادہ ہیں۔ اور امام بخاریؒ کی روایت مختصر ہے۔ پس امام بیہقیؒ نے اصل مضمون کے لحاظ سے اپنی روایت کے بعد امام بخاریؒ کی روایت کا بھی حوالہ دے دیا کہ اس کی تصحیح و توثیق میں کسی جاننے والے کو کلام نہ رہے۔ اور اگر کوئی محدثین کے طریق روایت کو نہ جانتا ہوا اور وہ انکار کرے تو بلا سے ۲؎ الحمدللہ و تشکر و لا نکن من القاصرین. سعادت مند۔

[1] قاضی اکمل صاحب قادیانی کمال درجہ کے دلیر ہیں' لکھتے ہیں۔

شہادت ہے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ. (آل عمران پ ۴)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے (نمونہ) بنائے گئے ہو۔'' (۱۰۹:۳)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ. (مشکوٰۃ)

''میری امت گمراہی پر اجماع نہیں کرے گی یعنی جس امر پر میری امت کا اجماع ہوگا وہ امر ضلالت نہیں ہوگا۔''

حجیتِ اجماع کے لئے ضروری ہے کہ وہ اجماعی امر قرآن و حدیث سے ثابت ہو چنانچہ حضرت حجۃ الہندؒ حجۃ اللہ میں فرماتے ہیں:۔

فانّهم اتفقوا علی القول بالاجماع الّذی مستندہ الکتاب والسنۃ او الاستنباط من احدھما. (ج اص ۱۲۰ مطبوعہ مصر)

علمائے (اہلسنت) کا اس اجماع پر اتفاق ہے جس کی سند (اصالۃً) قرآن و حدیث میں موجود ہو۔ یا ان دونوں میں سے کسی ایک سے مستنبط ہو۔''

ہم سابقاً نہایت تفصیل سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مرفوعہ سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ اٹھائے گئے۔ اور آپ قربِ قیامت میں آسمان سے نازل ہوں گے۔ اور چونکہ جمیع صحابہؓ اور جمیع ائمہ اہل بیت

ف ''ہم اجماع امت کے قائل ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرام نے سب سے پہلے وفاتِ مسیح علیہ السلام پر ہی اجماع کیا تھا۔'' (ص ۶۹)

الجواب:۔ یہ محض کذب و افترا ہے۔ ایک صحابی سے بھی وفاتِ مسیح علیہ السلام قبل النزول منقول نہیں۔ اس کی کچھ حقیقت سابقاً اس حصہ شہادت القرآن میں اور کچھ حصہ میں آیت قد خلت من قبله الرسل (آل عمران پ ۴) کے ضمن میں مذکور ہو چکی ہے۔ ۱۲ منہ سعادت الاقران۔

اور جمیع ائمہ اہلسنت[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول عینی کے قائل ہیں۔ اور کوئی بھی ان میں کا نزول مثالی و بروزی کا قائل نہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ قطعاً حق اور پسندیدہ خدا اور رسول ﷺ ہے اور اس میں کسی طرح کی گمراہی کا شائبہ نہیں۔

---

[1] مولوی محمد علی صاحب لاہوری احمدی اپنی کتاب ''عیسویت کا آخری سہارا'' میں سلسلہ ذکر میں فرماتے ہیں۔

''مجمع البحار میں لفظ حکم کی بحث میں نقل کیا ہے۔ قال مالک مات یعنی حضرت امام مالکؒ قائل تھے۔ کہ حضرت عیسیٰ مر گئے۔ اور بہت سے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے تھے۔ مثلاً ایک قول ہے کہ تین گھنٹے آپ مرے رہے اور ایک قول ہے کہ تین دن تک مرے رہے اور یہ سب اقوال تفاسیر میں موجود ہیں۔'' (ص ۹)

الجواب:- ہم مولوی محمد علی صاحب کی زحمت ورق گردانی کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ علوم عربیہ سے ناواقف ہیں۔ اور تقلید مرزا کی آفت ان پر سوار ہے۔ اس لئے وہ صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ سچ ہے ''نکتہ داں نشو دکرم کرکتاب خورد۔'' اس تحریر میں جو انہوں نے تفاسیر کے حوالے سے لکھی ہے۔ کئی ایک دھوکے دیئے یا بوجہ کم علمی کے کھائے۔ سو پہلے ہم ان اقوال کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد امام مالکؒ کے قول کی حقیقت بھی آسان ہو جائے گی۔''

قولہ ''بہت سے لوگ الخ۔ اقول:- یہ محض دھوکا ہے۔ ان 'بہت سے'' لوگوں میں دس بیس کے نام تو گنائے ہوتے۔ ۱۲ قولہ ''ایک قول ہے کہ تین گھنٹے الخ'' اور بر صفحہ دیگر اقول:- اول تو یہ کہ اس روایت کے راویوں میں سے ایک راوی کا نام معلوم نہیں (ابن جریر) پس یہ روایت درجہ صحت سے گر گئی۔ ثانیاً یہ کہ اس کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے ثم احیاہ ثم رفعہ الیہ (خازن و معالم) یعنی پھر خدائے تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو زندہ کیا۔ پھر اپنی طرف اوپر اٹھا لیا۔ مولوی صاحب نے یہ عبارت نقل کیوں نہیں کی؟ اس لئے ''کہ یہ اپنے مطلب کے خلاف ہے۔ ۱۲ قولہ ''ایک قول ہے کہ سات گھنٹے الخ۔'' اقول: اس روایت کے نقل کرنے میں تو مولوی محمد علی صاحب نے یہودیوں کے بھی کان کتر دیئے۔ اور فنا فی المرزا کا پورا ثبوت دے دیا۔ کیونکہ تفاسیر میں تو صاف لکھا ہے کہ یہ قول نصاریٰ کا ہے۔ پس اس نسبت کو چھوڑ دینا اور کسی

چنانچہ تفسیر وجیز میں ہے۔

وَالْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّهٗ حَیٌّ فِی السَّمَآءِ یَنْزِلُ وَ یَقْتُلُ الدَّجَّالَ وَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ. (حاشیہ ص ۳ جامع البیان متعلق آیت یعیسیٰ انی متوفیک الخ)

''اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ ہیں جو نازل ہوں گے۔ اور دجال کو قتل کریں گے اور دین (اسلام) کی مدد کریں گے۔''

اور حضرت نواب صاحب مرحوم امام شوکانیؒ سے نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

فهذه تسعة و عشرون حديثا تنضم اليها احاديث اخر ذكر فيها نزول عيسٰى منها ماهو مذكور في احاديث الدّجال و منها ماهو مذكور في احاديث المنتظر و تنضم الٰى ذلك ايضاً الآثار الواردة عن الصحابة فلها حكم الرفع اذلا مجال للاجتهاد في ذلك. وجميع ما سقناه بالغ حد التواتر كما لايخفي علٰى من له فضل اطلاع فتقرر بجميع

لہ مسلمان امام کا قول جتانا سخت دھوکا ہے جو کسی مومن کا کام نہیں۔ دوم یہ کہ اس کے آگے بھی صاف لکھا ہے ثُمَّ اَحْیَاهُ وَرَفَعَهٗ اِلَیْهِ (خازن و معالم) یعنی پھر خدا نے آپ کو زندہ کیا اور اپنی طرف اوپر کو اٹھالیا۔''

اس تفصیل سے صاف معلوم ہو گیا کہ ائمہ اہلسنت کی طرف یہ نسبت کرنا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں' ضعیف ہے۔ اور اس میں بھی زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر ہے۔ جو مرزا صاحب اور ان کی امت کے دعوے اور عقیدے کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ جب تک ائمہ اہلسنت سے نزول عیسیٰ کا انکار ثابت نہ ہو۔ تب تک مرزا صاحب کو ان روایتوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں۔ یہی حال امام مالکؒ کی طرف منسوب کرنے کا ہے۔ کہ اس کی کوئی سند نہیں۔ وَمَنِ ادَّعٰی فَعَلَیْهِ الْاِثْبَاتُ بِهٖ. اور نہ ان سے نزول عیسیٰ کا انکار مروی ہے۔ اسی طرح علمائے مالکیہ سے بھی کوئی بھی حیات سماوی اور نزول عیسیٰ کا منکر نہیں۔ ۱۲ سعادت۔ منہ۔

ما سقناه في هذا ان الاحاديث الواردة في المهدي المنتظر متواترة والاحاديث الواردة في الدجال متواترة والاحاديث الواردة في نزول عيسٰی متواترة و في هذا المقدار كفاية لمن له هداية. (حجج الكرامه ص۴۳۲)

''پس یہ انتیس حدیثیں ہیں۔ جن کے ساتھ دیگر حدیثیں بھی جن میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے' ملائی جا سکتی ہیں ان میں سے بعض احادیث دجال میں اور بعض احادیث مہدی منتظر میں مذکور ہیں اور اسی طرح وہ آثار بھی ضم کیے جا سکتے ہیں جو صحابہؓ سے مروی ہیں۔ وہ بھی حکما مرفوع ہیں۔ کیونکہ اس امر میں اجتہاد کا دخل نہیں (بلکہ یہ صرف آنحضرت ﷺ سے سننے پر موقوف ہے) اور جو کچھ ہم نے بترتیب بیان کیا۔ وہ حد تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ جیسا کہ اس شخص پر جسے روایات پر کافی عبور ہے۔ مخفی نہیں۔ پس اس سے جو ہم نے بیان کیا مقرر و ثابت ہو گیا کہ جو احادیث امام مہدی منتظر کے بارے میں وارد ہیں وہ بھی متواتر ہیں۔ اور جو احادیث دجال (کے خروج) میں مروی ہیں وہ بھی متواتر ہیں اور جو احادیث نزول عیسیٰ علیہ السلام میں وارد ہیں وہ بھی متواتر ہیں اور اس مقدار میں اس شخص کے لئے جسے (خدا کے فضل سے) ہدایت حاصل ہے کفایت ہے۔''

اسی طرح مولانا عبدالحکیم صاحبؒ سیالکوٹی حاشیہ خیالی میں فرماتے ہیں:۔

''اور شارح التفتازانی نے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر اکتفا کی کہ ان کی حیات اور ان کا زمین پر نازل ہونا اور پھر زمین پر آپ کا رہنا صحیح حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا۔ اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔'' ص۲۵۴ مطبوعہ

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ حیات مسیح علیہ السلام کا مسئلہ بموجب آیات

قرآنیہ واحادیث نبویہ واجماع امت محمدیہ ﷺ ثابت ہے اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جو کچھ اس کے برخلاف وفات مسیح کے متعلق لکھا ہے وہ محض شبہات ومغالطات ہیں جو قواعد علمیہ کے بھی برخلاف ہیں۔

تم والحمدللہ الذی بنعمتہ تتم الصّلحٰت والصلوٰة والسّلام علی رسولہٖ محمّد مع اکرم التحیات وعلی الہ واصحابہ و ازواجہ المطہرات و انا خادم دینہ القدیم ابوتمیم محمد ابراھیم میر سیالکوتی۔

۲۷ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۲۸ء۔

مثبتِ حیاتِ مسیحؑ

مسمّٰی بہ

شہادۃ القرآن

باعلی النداء

بانّ المسیح رفع حیّاً الی السّماء

حصہ دوم

مؤلف:
مولانا محمد ابراہیم میر صاحب فاضل سیالکوٹی

نعمانی کتب خانہ : حق سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَّ قَالَ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا فَمَا اَحْکَمَ مُرَادَهٗ وَ مَا اَتْقَنَ بَیَانَهٗ بِتَصْرِیْفِ الْاٰیَاتِ وَ تَکْرِیْرِ الْکَلِمَاتِ وَقَالَ وَلَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنَاکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ الاطْهَارِ وَاَصْحَابِهِ الْاَخْیَارِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔

سبب تالیف:

امابعد! حضرات انصاف پسند حق نیوش پر واضح ہو کہ رسالہ شہادۃ القرآن کا پہلا حصہ عرصہ کئی سال سے طبع ہو چکا ہے۔ موافقین میں اس کی قبولیت اور مخالفین پر اس کی اتمام حجت اس کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ مطبوع ہو کر ہدیہ ناظرین ہوتا ہے۔ اس میں ان تمیں آیتوں کا جواب ہے جو مرزا صاحب نے اپنے رسالہ ازالہ اوہام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ اس حصہ کے لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ پہلے باب میں اپنا عقیدہ حیات ورفع عیسوی کو قرآن شریف سے ثابت کیا گیا ہے اور چونکہ مرزا صاحب نے رسالہ ازالہ اوہام میں بہت زور سے کہا ہے کہ قرآن کریم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت ہے اور اس سے قرآن شریف کے مضامین میں اختلاف وتعارض پایا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ

اپنے عقیدے کی تائید کے لئے مخالف کے دلائل کو توڑا جائے اور ضعیف بلکہ باطل اور غلط ثابت کیا جائے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ وَاَنَا الْعَبْدُ الْمُفْتَقِرُ.

الی اللہ الکریم محمد ابراہیم میر السیالکوٹی

دیباچہ طبع ثانی

از مصنف

سُبْحَانَ مَنْ لَا یُعَقِّبُ حُکْمَهُ وَلَا یَرُدُّ قَضَاءَهُ وَاُصَلِّي وَاُسَلِّمُ عَلٰی مَنْ شَهِدَتْ لَهُ اَرْضُهُ وَسَمَاءُهُ. صَلٰوةً دَائِمَةً بَاقِیَةً یُوَفّٰی بِهَا جَزَاءُهُ.

شہادۃ القرآن کا دوسرا حصہ بھی پہلے حصہ کی طرح مرزا صاحب قادیانی کی زندگی میں (رمضان ۱۳۲۳ھ میں) طبع ہوا۔

زندگی بھر نہ ان کو اس کے جواب کی ہمت پڑی۔ اور نہ اب تک ان کے مریدوں کو اس کی جرأت ہوئی۔ حتیٰ کہ طبع اوّل کے (۷۰۰) نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور جلد ہی طبع ثانی کی ضرورت پڑی۔ لیکن متواتر کچھ ایسے امور درپیش رہے کہ طبع ثانی کا ارادہ تسویف وتعویق میں پڑتا رہا۔ ملک کے ہر گوشہ سے بکثرت سفارشیں اور فرمائشیں آتی رہیں۔ اور مخلص احباب اپنی آرزومندی کی تقریروں اور کمال اشتیاق کی تحریروں سے اپنی طرح مجھے بھی بے قرار کرتے رہے۔ لیکن میں روز بروز ایسے حالات میں محصور ہوتا گیا کہ دائرۂ عمل بالکل تنگ ہو گیا۔ آخر سردار اہلحدیث جناب مولانا مولوی ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب متعنا اللہ بطول بقائہ نے اس کی طباعت کا اہتمام اپنے ذمہ لیا۔ اور اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہدیہ قارئین کیا گیا۔

خاکسار: ابراہیم میر سیالکوٹی۔ مصنف رسالہ ہذا

بسم الله الرحمن الرحيم
ما كان محمد
أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله
وخاتم النبيين
الاحزاب

شہادت القرآن

حصہ ثانی

در ازالۂ اوہامِ قادیانی و دفعِ وساوسِ شیطانی

مرزا صاحب نے اپنے ازالہ تقطیع خرد جلد ۲ کے صفحہ ۵۹۸ سے صفحہ ۶۲۷ تک وہ تیس آیتیں ذکر کی ہیں۔ جن سے ان کا مقصود برخلاف مراد الٰہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت کرنے کا ہے۔ سو واضح ہو کہ وہ بیان کردہ آیات تین قسم کی ہیں۔ اول وہ آیات جن میں خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ دوم۔ وہ آیات جو دیگر انبیا علیہم السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہیں' اور مرزا صاحب نے اس خیال سے کہ مسیح علیہ السلام بھی ایک پیغمبر تھے۔ ان آیتوں سے آپ کی وفات ثابت کرنی چاہی ہے۔ سوم وہ آیتیں جن میں نہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اور نہ ضمنِ عموم میں۔ بلکہ مرزا صاحب نے اپنی اختراع سے ان سے تمسک کیا ہے۔ ان سب کا جواب حسب ترتیب تقسیم بیان کیا جاتا ہے۔ ناظرین دونوں کو بغور ملاحظہ کریں۔ اور انصاف کریں کہ موافق کتاب اللہ و مطابق بیان رسول اللہ ﷺ کس کی دلیل ہے۔ اور قرآن شریف کی صحیح مراد کو کون پہنچا ہے فَاَقُوْلُ بِحَوْلِ اللّٰهِ وَقُوَّتِهٖ۔

قسم اول میں سے پہلی آیت یہ ہے۔

يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ

الْقِيٰمَةِ الآیة. (پ ۳ ع ۱۴: آل عمران۔۳: ۵۴)

(ترجمہ مندرجہ ازالہ مرزا صاحب) یعنی ''اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور پھر عزت کے ساتھ اپنی طرف اٹھانے والا اور کافروں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں اور تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر قیامت تک غلبہ دینے والا ہوں۔'' انتہیٰ۔

مرزا صاحب کا یہ ترجمہ اور اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول پر استدلال ازروئے آیات قرآن شریف ولغت عرب کئی وجوہ سے بالکل غلط ہے۔

وجہ اوّل:۔

اس آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ کے متعلق حصہ اوّل[1] میں ص ۱۳۹ سے ۲۱۱ تک کافی تحریر ہو چکی ہے۔ جس میں بدلائل ثابت کیا گیا ہے۔ کہ توفی کا اصل وفا ہے۔ اور اس کے اصلی اور وضعی معنی اخذ الشيء وافیا یعنی کسی چیز کو پورا پورا پکڑ لینا ہیں اور رفع یعنی اوپر کو اٹھا لینا اور نیند اور موت اور تعداد اور وصولی قرض سب اس کی انواع ہیں۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ مختلف انواع میں سے ایک نوع معین کرنے کے لئے قرینے کا ہونا ضروری ہے پس جہاں توفی کے ساتھ موت اور اس کے لوازمات کا ذکر ہوگا۔ اس جگہ توفی سے مراد موت ہوگی۔ اور جہاں نیند اور اس کے مقتضیات مذکور ہوں گے وہاں نیند مراد ہوگی۔ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (الم سجدہ پ ۲۱) (۳۲: ۱۱) یعنی ''اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ تم کو ملک الموت جو تم پر مقرر کیا ہوا ہے۔ پورا پورا پکڑ لے گا''۔ اور نیز آیت: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (زمر پ ۲۴۔ ۳۹: ۴۲) یعنی ''اللہ (ہی) جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور جن کی موت کا وقت

---

[1] طبع اول ۷۱ سے ۹۳ طبع دوم ص ۷۰ طبع سوم و چہارم ص ۱۰۴ سے ص ۱۶۴ تک۔

ابھی نہیں آیا۔ان کو ان کی نیند میں (قبض کرتا ہے)'' اور نیز آیت وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمْ بِاللَّيْلِ (انعام پ ۷) یعنی ''اللہ تم کو رات کے وقت قبض کر لیتا ہے''۔ (۶۰:۶) اور نیز شعر فلما توفاہ رسول الکری الخ یعنی ''جب اس کو نیند کے ایلچی نے پورا پورا پکڑ لیا۔''

ان مثالوں میں ملک الموت اور موت توفی سے موت مراد لینے کے قرینے ہیں۔اور منام اور لیل اور کریٰ (نیند) اس سے نیند مراد لینے کے۔اسی طرح اس آیت مذکورہ زیر بحث میں اگر توفی کے متصل موت کا ذکر ہے۔تو اس سے مراد موت ہوگی۔اور اگر نیند کا ذکر ہے تو پھر نیند مراد ہوگی۔اور اگر رفع یعنی اوپر اٹھانے کا ذکر ہے۔تو پھر اس توفی سے مراد رفع یعنی اوپر کو اٹھانا ہوگا۔پس چونکہ اس آیت میں توفی کے ساتھ سوائے رفع کے ذکر کے اور کچھ مذکور نہیں۔لہٰذا اس جگہ توفی سے سوائے رفع کے اور کچھ مراد نہیں ہو سکتی۔جیسا کہ حصہ اول کے ص ۱۵۶ میں بحوالہ تفسیر کبیر گذر چکا ہے۔کہ قول الٰہی

قوله اِنِّیْ متوفیک یدل علیٰ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ حصول التوفی وهو جنس تحتهٗ انواع بعضها بالموت و بعضها بالاصعاد الی السماء فلما قال بعده ورافعک الیّ-کان هذا تعیینا للنوع ولم یکن تکرارًا. (تفسیر کبیر جلد۲)

''اللہ کا قول انی متوفیک صرف توفی کے حاصل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔اور توفی جنس ہے۔جس کی کئی انواع ہیں۔بعض موت کے ساتھ اور بعض آسمان پر اٹھائے جانے سے۔پس جب اس کے بعد رَافِعُكَ اِلَیَّ آیا۔تو یہ تعیین نوع کے لئے قرینہ ہوا۔اور تکرار نہ ہوا۔''

مفسرین علیہم الرحمۃ کا اس امر پر اتفاق اور اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کی دلیل ہے۔

اس جگہ انواع توفی (رفع۔موت۔نیند) میں سے توفی کو خواہ کسی نوع میں

معین کریں رفع جسمی ثابت ہی رہے گا۔ تفصیل اس اجمال کی اس طرح ہے۔ کہ اگر توفی کو نوع موت میں معین کریں۔ تو بموجب مذہب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہوگی۔ جیسے کہ حصہ اول ص ۲۰۳ میں درمنثور سے گذر چکا ہے۔ کہ حضرت ابن عباس رافعک ثم متوفیک فی اخر الزمان (درمنثور) فرماتے ہیں کہ "میں پہلے تجھے اوپر اٹھالوں گا۔ پھر بعد مدت کے (دنیا میں نازل کر کے) آخر زمانے میں ماروں گا۔"

اور نیز تفسیر معالم میں ضحاکؒ شاگرد ابن عباسؓ سے اس کی تصریح موجود ہے کہ

ان فی الأیة تقدیمًا و تاخیرًا معناه انی رافعک الیّ و مطهرک من الذین کفروا و متوفیک بعد انزالک من السمآء. (تفسیر معالم)

"اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی اس کے یہ ہیں کہ میں تجھ کو اپنی طرف اوپر اٹھاؤں گا اور کفار سے تجھے صاف بچالوں گا۔ اور پھر آسمان سے اتارنے کے بعد ماروں گا۔"

اور اگر اس آیت میں توفی کو اس کی دوسری نوع نیند میں معین کیا جائے۔ تو بھی اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اے عیسیٰ! میں تجھ کو سلادوں گا (اور اس نیند کی حالت میں) تجھ کو اپنی طرف اوپر اٹھالوں گا۔ جیسا کہ تفسیر خازن۔ ابن کثیر۔ درمنثور۔ فتح البیان۔ معالم۔ کبیر وغیرہ میں ہے کہ:

(الثانی) المراد بالتوفی النوم و منه قوله اللّٰه یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فجعل النوم وفاة کان

عیسیٰ قد نام فرفعه اللّٰہ وھو نائم لئلا یلحقه خوف.

(تفسیر خازن)

"اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ توفی سے مراد نیند ہے۔ جیسا کہ اس آیت اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ الآیة میں مستعمل ہے۔ (پس اس سے یہ مراد ہوئی) کہ عیسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سوتے ہوئے اوپر اٹھایا تا کہ آپ کو خوف لاحق نہ ہو۔"

(۳) اور اگر اس آیت میں توفی سے اس کی تیسری نوع رفع مراد لی جائے۔ جو بالکل حق اور مطابق واقعہ ہے۔ اور جو جمہور مفسرین کا قول ہے تو اس سے رفع جسمی بالکل ظاہر ہے۔

غرض اس جگہ توفی کو اس کی انواع رفع۔ نیند۔ موت میں سے جو قرآن مجید میں آچکی ہیں۔ جس نوع میں متعین کیا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع جسمی ثابت ہی رہتا ہے۔ اور اس امر پر علمائے سلف و خلف۔ مفسرین و محدثین و فقہاء و مجتہدین رحمہم اللہ سب کا اتفاق و اجماع ہے۔

دوسری وجہ:-

مرزا صاحب نے اس آیت میں واؤ کا ترجمہ پھر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے لغت۔ بلاغت۔ نحو و اصول جملہ علوم کا خلاف کیا ہے۔ خواہ دیدہ دانستہ خواہ غلطی و سہو سے۔ اس کی تفصیل حصہ اوّل کے ص ۱۲۱ پر گذر چکی ہے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ واؤ صرف عطف مطلق جمع کے لئے موضوع ہے۔ اس میں ترتیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ کافیہ میں ہے الواوُ لِلْجَمْعِ الْمُطْلَقِ لَا تَرْتِيْبَ فِيْهَا يَعْنِيْ "واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ اس میں ترتیب نہیں ہوتی" اور اسی طرح دیگر کتب نحو میں ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے اس آیت کے ذیل میں اس امر کی تصریح کی ہے:

ان الواو فی قوله اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ لا تفید الترتیب فالاٰیة تدل علٰی انه تعالٰی یفعل به هذه الافعال فاما کیف یفعل و متی یفعل فالامر فیه موقوف علی الدلیل وقد ثبت بالدلیل انه حی وورد الخبر عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلّم انه سینزل و یقتل الدجال ثم انه تعالی یتوفاه بعد ذلک. (تفسیر کبیر ج۲)

''واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی۔ یہ آیت صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ یہ معاملات کرے گا۔ مگر یہ بات کہ کس طرح کرے گا اور کب کرے گا؟ سو یہ دلیل پر موقوف ہے اور بے شک یہ بات دلیل سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے حدیث بھی آ چکی ہے کہ آپ ضرور اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کو فوت کرے گا۔

تیسری وجہ:-

مرزا صاحب نے اس آیت میں رَافِعُکَ اِلَیَّ کا ترجمہ ''عزت کے ساتھ اپنی طرف اٹھانے والا ہوں'' کیا ہے اور اس سے عزت کی موت مراد لی ہے۔ یہ بھی ان کی سخت غلطی ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس آیت کے معنی میں عزت کا لفظ از خود بڑھا دیا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اور اگر مفہوم رفع سے سمجھ کر لکھا ہے تو بھی اس سے موت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ رفع جسمی اور اعزاز میں مخالفت نہیں بلکہ یکجا جمع ہو سکتے ہیں۔ جیسے آیت وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ میں ہے۔ یعنی ''یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو (عزت کے ساتھ) تخت کے اوپر بٹھایا۔'' پس اس آیت کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عزت کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا۔

دیگر یہ کہ "عزت کے ساتھ اٹھا لینا" سے موت مراد لینی تو لغت کی کسی کتاب سے ثابت ہے اور نہ محاورہ زبان اس کی تائید کرتا ہے۔ اور نہ قرآن شریف میں اس کی شہادت ہے۔ یہ صرف مرزا صاحب کی اپنی من گھڑت بات ہے۔ حصہ اوّل ص میں اس آیت کی تفسیر میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

چوتھی وجہ:-

مرزا صاحب نے مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوْا سے تہمت سے پاک کرنا مراد بتائی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برأت تو بیشک مسلم و ثابت ہے۔ مگر اس آیت میں اس تَطْهِیر سے مراد یہ نہیں۔ بلکہ کفار کے مکروں سے پیغمبر برحق کو محفوظ و پاک رکھنا مراد ہے۔ اس کی تفصیل بھی حصہ اوّل کے ص ۱۹۳ میں اس آیت کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

اس بیان و تفصیل سے ثابت و روشن ہو گیا کہ مرزا صاحب نے اس آیت کے جو معنی کئے تھے۔ اور جو مراد بتائی تھی۔ وہ باطل و غلط ہے پس اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول ثابت نہ ہوئی۔

قسم اوّل میں سے دوسری آیت

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّادُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ.

(مائدہ رکوع اخیر پ ۷۔ ۵:۱۱۷)

حصہ اوّل کے ص ۱۷۹ میں آیت اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اور آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کی تفسیر میں امور مندرجہ ذیل بڑے بسط اور تفصیل کے ساتھ محقق طور پر بیان ہو چکے ہیں۔

❶ توفی کے حقیقی اور وضعی معنی موت نہیں بلکہ اس کے معنی اخذ الشیء وافیا یعنی کسی چیز کو پورا پورا قبض کر لینا اور لے لینا ہیں۔

❷ چونکہ اس پورا پورا لے لینے کی کئی کیفیتیں اور نوعیں ہیں اس لئے توفی کو

شہادت القرآن

ایک نوع میں معین کرنے کے لئے قرینہ کا ہونا ضروری ہے۔

● آیات رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ قطعی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور نیز یہ کہ رَفْعٌ اِلَی اللّٰهِ اور رَفْعٌ اِلَی السَّمَآءِ کے ایک ہی معنی ہیں۔ جیسا کہ آیت اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ. (پ۲۲ فاطر۔۳۵:۱۰) سے ثابت ہے۔

پس قرآن شریف میں جو توفی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں وارد ہے اس کو اس کی نوع رفع میں معین کرنے کے لئے رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ صریح قرینے ہیں۔ پس جب ثابت ہو چکا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی رفع آسمانی سے ہوئی۔ تو اب آیت زیر بحث یعنی فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ میں بھی توفی سے مراد رفع آسمانی ہی ہے۔ نہ کچھ اور کیونکہ یہ اسی قاعدہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کے تحقق ووقوع کی حکایت ہے۔

منصف مزاج ہوشمندوں کے لئے تو اتنا بیان ہی کافی ہے مگر کمزور طبیعت کو سمجھانے اور مجبور مخالف پر حجت پوری کرنے کے لئے اس کی خوب بسط سے تفصیل کی جاتی ہے۔ سو واضح ہو کہ مرزا صاحب کا یہ قول ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے (معاذ اللہ اہانت) صلیب کے بعد (جو وجاہت کے بالکل منافی ہے) کشمیر کی طرف ہجرت کی اور یہاں ستاسی سال زندہ رہ کر فوت ہو گئے۔ اور شہر سرینگر کے محلہ خان یار میں دفن کئے گئے۔ جہاں ابھی تک ان کی قبر شہزادہ یوز آسف کی قبر کے نام سے مشہور ہے[1] اس بیان سے مرزا صاحب نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارا۔ اور اپنے برخلاف حجت پوری کرائی۔ اس اجمال کا بیان اس طرح ہے کہ کلمہ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ سوال ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ کے جواب میں واقع ہے۔ پس اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں لے سکتے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کو اہل کشمیر نے خدا

[1] شائقین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کی بابت رسالہ الخبر الصحیح عن قبر المسیح ملاحظہ فرمائیں۔

اور خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا۔ بلکہ اہل شام اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں نے۔ پس بموجب قول مرزا صاحب اہل شام (جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے سوائے معبود جانا) کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آپ کی وفات سے ستاسی سال پیشتر منقطع ہو چکی تھی۔ اور اس عرصہ ستاسی سال کی حیات (مزعومہ مرزا صاحب) میں آپ علیہ السلام کو اہل شام کے عقائدِ باطلہ کی کوئی خبر نہیں کہ پیچھے انہوں نے کیا بنا لیا۔ پس سوال اَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ کے جواب میں عذر موت صحیح نہیں۔ بلکہ ہجرت کشمیر کا عذر کرنا چاہئے۔ جب اس صورت میں ایک خدائے تعالیٰ کے سکھائے ہوئے پیغمبر برحق کے جواب میں قدح و ضعف واقع ہے۔ تو بالضرور معلوم ہوا کہ اس جگہ توفی سے مراد موت نہیں۔ اور چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کا بوجہ آسمان پر اٹھائے جانے کے نصاریٰ کے باطل اعتقادوں سے بے خبر ہو جانا ایک صحیح عذر اور باصواب جواب ہے۔ اور یہ ثابت بھی ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی آسمان پر اٹھائے جانے سے ہوئی تو اب تَوَفَّيْتَنِيْ کے معنی رَفَعْتَنِيْ ہوں گے یعنی آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ اے الٰہی! جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھا لیا تو اس عرصۂ مرفوعیت میں مجھے ان کے عقائد کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جملہ تفاسیر معتبرہ میں اس مقام پر تَوَفَّيْتَنِيْ سے مراد رَفَعْتَنِيْ لکھا ہے۔ اس سے کسی کو خلاف نہیں ہم بہت خوشی سے قبول کریں گے۔ اگر مرزا صاحب کسی صحابی سے تَوَفَّيْتَنِيْ سے سوائے رَفَعْتَنِيْ کے کچھ اور مراد نقل کر کے دکھائیں گے۔ اب ذیل میں چند معتبر تفاسیر کی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن میں تَوَفَّيْتَنِيْ کے معنی جو اس آیت میں ہے رَفَعْتَنِيْ لکھے ہیں۔

(۱) (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ) بالرفع الی السمآء کما فی قوله تعالٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ فان التوفی اخذ الشیء وافیا والموت نوع منه قال تعالی اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا. انتھی (تفسیر علامه ابی السعود)

یہی عبارت تفسیر بیضاوی و سراج منیر میں ہے۔

(۲) (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي) بالرفع الى السمآء والتوفي اخذ الشيء وافيًا. (تفسیر جامع البیان)

(۳) (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي) اراد اعلامه مصاعد السمآء انتهى (تفسیر فیضی)

(۴) (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي) یعنی فلما رفعتني الى السماء فالمراد به وفاة الرفع لا الموت (تفسیر خازن)

(۵) فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي والمراد منه وفاة الرفع الى السمآء من قوله تعالى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ. ۱۲(تفسیر کبیر)

(۶) (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي) قبضتني ورفعتني اليك (تفسیر معالم)

ان سب عبارات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں توفی سے مراد آسمان کی طرف اٹھا لینا ہے۔ موت نہیں کیونکہ توفی کے معنی کسی چیز کو پورا پورا لے لینا ہے۔ اور موت اس کی نوع ہے اور چونکہ آیت اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی سے مراد ان کا آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔ تو اب اس آیت کے معنی بھی وہی ہوں گے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ "جب عیسیٰ علیہ السلام بموجب عقیدۂ اہل سنت دوسری دفعہ نزول فرما ہوں گے تو نصاریٰ کے افتراؤں اور برے اعتقادوں سے باخبر ہو جائیں گے۔ اور اہل سنت کے نزدیک یہ سوال و جواب بھی قیامت کو ہوں گے۔ تو پھر اس صورت میں قول كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ سے عدم اطلاع کا عذر صحیح نہیں ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے۔ اور نیز یہ کہ یہ سوال و جواب قیامت کو نہیں ہوگا۔ بلکہ عالم برزخ میں ہو چکا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کا اقرار کر چکے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے نصاریٰ وغیرہ بندوں کے اقوال و افعال پر مطلع ہونے کے دو موقع

ہیں۔ اور دونوں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔ اوّل آسمان پر اٹھائے جانے سے پیشتر تبلیغ رسالت کے وقت۔ دوم آسمان سے نازل ہونے کے بعد۔ اور یہ امر ظاہر و مسلم ہے کہ نصاریٰ کے اعتقاد ان دونوں زمانوں کے درمیانی مدت میں بگڑے ہوئے ہیں۔ سو آپ کا قول وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ یا الٰہی جب تک میں ان میں رہا۔ ان کے اقوال و افعال کو دیکھتا رہا۔ ان دونوں زمانوں پر شامل ہے۔ اور فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (یعنی جب تو نے مجھے آسمان پر اٹھالیا۔ تو پھر تو ہی ان کا نگہبان رہا۔ یعنی اس عرصہ کی بابت مجھے کچھ علم نہیں۔) سے درمیانی زمانہ یعنی پہلی اور دوسری بار کی درمیانی مدت رفع میں نصاریٰ کے اقوال و افعال سے واقف نہ ہونے کا اظہار مقصود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور نزول ثانی اور اس کے بعد قیامت کو یہود و نصاریٰ پر آپ کی شہادت کے لئے یہ آیت قرآن شریف میں موجود ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا۔ (نساء پ۶ ع۲)(۱۵۹:۴۔)

"اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہوگا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کی موت سے پیشتر ایمان لے آئے گا۔ اور آپ قیامت کے دن ان پر شاہد ہوں گے۔"

صحیح بخاری باب نزول عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) میں اسی آیت کو دلیل نزول ثانی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث یہ ہے:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّنْزِلَ فِيْكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَ يَضَعُ الْجِزْيَةَ وَ يَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا

مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْ ھُرَیْرَۃَ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ[1]

[1] قولہ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ:-

ناظرین نے ملاحظہ فرمالیا۔ کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو حدیث روایت کی ہے۔ اس کے مضمون کی تصدیق کے لئے وہی آیت قرآنی پیش کرتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوا کہ مسیح موعود وہی ہے۔ جس کا ذکر اس آیت میں ہے نہ کہ کوئی دیگر مثیل۔ پس چونکہ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی اللہ کا ذکر ہے۔ اس لئے مرزا صاحب مسیح موعود نہیں ہو سکتے۔

مرزا صاحب حضرت ابوہریرہؓ کے اس استدلال کے قبول کرنے میں دو عذر پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ کا اپنا فہم ہے۔ اور صحابی کا فہم حجت نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ اِنْ شِئْتُمْ کہتے ہیں اور کلمہ اِن شرطیہ شک کے لئے ہوتا ہے۔ عذر اول کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا اس حدیث کی تصدیق کے لئے اس آیت کو پیش کرنا دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو آنحضرت ﷺ سے سن کر کہا ہے اور یا اپنے فہم واجتہاد سے۔ پہلی صورت میں تو مرزا صاحب کو انکار کی مجال نہیں۔ ہاں دوسری صورت میں وہ کچھ گنجائش سمجھتے ہیں۔ سو اس کا بیان اس طرح ہے کہ قرآن شریف میں سے حدیث نبوی کا ماخذ بیان کرنا اور ان میں آپس میں تطبیق وتوفیق دینا ایک موہوبی اور خداداد ملکہ ہے۔ جو عارفانِ کتاب اللہ و واقفانِ حدیث رسول اللہ ﷺ سے مخفی نہیں۔ اور علم دینی کا کمال اور طبیعت کی ذہانت فطری وصف سے ہے چنانچہ امام ابن قیم جو اسی مذاق کے ہیں۔ اپنی کتاب زادالمعاد میں فرماتے ہیں:-

وَکَانَ الصَّحَابَۃُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اَحْرَصَ شَیْءٍ عَلٰی اِسْتِنْبَاطِ اَحَادِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ اَلْزَمَ نَفْسَہٗ ذٰلِکَ وَ قَرَعَ بَابَہٗ وَوَجَّہَ قَلْبَہٗ اِلَیْہِ وَاعْتَنٰی بِہٖ بِفِطْرَۃٍ سَلِیْمَۃٍ وَ قَلْبٍ زَکِیٍّ رَاَی السُّنَّۃَ کُلَّھَا تَفْصِیْلًا لِّلْقُرْاٰنِ وَ تَبْیِیْنًا لِدَلَالَتِہٖ وَ بَیَانًا لِمُرَادِ اللّٰہِ مِنْہُ وَھٰذَا اَعْلٰی مَرَاتِبِ الْعِلْمِ فَمَنْ ظَفِرَ بِہٖ فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ وَ مَنْ فَاتَہٗ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ وَھِمَّتَہٗ وَ عَجْزَہٗ۔ (زادالمعاد جلد ۲ ص ۱۷۵)

''اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اس امر کے بہت حریص تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا قرآن شریف سے استنباط کیا کریں۔ اور جو کوئی اس کو لازم پکڑے۔ اور اس کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اور اپنے دل کو اس طرف متوجہ کرے۔ اور فطرت سلیمہ اور پاکیزہ دل کو اس کی تلاش میں لگائے تو جان لے گا کہ سنت تو

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

لے نبویہ ﷺ ساری کی ساری قرآن کی تفصیل ہے اور اس کے معنی اور مرادوں کا بیان ہے یہ امر علم کے مراتب میں سے اعلیٰ مرتبہ کا ہے پس جو اس سے کامیاب ہو اسے چاہئے کہ خدا کا شکر کرے۔ اور جسے ہاتھ نہ لگے۔ وہ اپنے نفس اور ہمت اور کمزوری کے سوائے کسی اور کو ملامت نہ کرے۔ واقفان حدیث نبوی پر مخفی نہیں۔ کہ آنحضرت ﷺ بسا اوقات کوئی مسئلہ بیان فرما کر اس کے موافق قرآن شریف کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہؓ کی بھی عادت تھی۔ کہ اس حدیث کو مع اس آیت کے حوالہ کے روایت کیا کرتے تھے اور یہ بات چنداں نظر کی محتاج نہیں۔ کیونکہ یہ امر کہ نبی ﷺ کسی مسئلہ کی تصدیق کے لئے آیت قرآنی پڑھا کرتے تھے۔ تب ہی معلوم ہوا۔ کہ صحابہؓ نے ویسی حدیث روایت کی۔ فافہم۔

اسی طرح ماہرین حدیث پر یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ جس طرح روایت کے رو سے سب سے اوّل نمبر پر ہیں۔ اسی طرح اس وصف یعنی تصدیق حدیث کے لئے آیت کے بیان کرنے میں بھی آپ ایک خاص مذاق رکھتے تھے۔ آپ کی روایات میں اکثر جگہ قرآن شریف کی آیت سے استدلال کرنا پایا جاتا ہے۔ کسی جگہ تو اس آیت کا حوالہ رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر دیتے ہیں۔ اور کسی جگہ آیت کے حوالہ پر بس کرتے ہیں اور اسے رسول اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ ان دونوں طریقوں پر غور و فکر کرنے سے ایک سوچنے والا ہوشمند آدمی نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ جس طرح حضرت ابوہریرہؓ حدیث کو خاص پیغمبر ﷺ سے بالمشافہ روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح روایت کا حوالہ بھی نبی ﷺ کی زبان مبارک سے روایت کرتے ہیں۔ چاہے اس کی تصریح کر دیں چاہے نہ کریں۔ کیونکہ غیر مصرح بھی اسی کے قریب ہے۔ کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سن کر کہا کیونکہ صحابہؓ بغیر نبی ﷺ سے سننے کے کچھ بات اپنی طرف سے کرنے سے بہت پرہیز کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ کتب حدیث کے مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہے۔ خصوصاً ایسے امور میں جن میں رائے محض اور اجتہاد و قیاس کو دخل نہیں۔ مثلاً پیشین گوئی وغیرہ۔ ان میں تو صحابی کا قول حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ پس اس حدیث نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی تصدیق کے لئے حضرت ابوہریرہؓ کا آیت قرآن وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ سے استدلال کرنا علاوہ بہت باریک نکتہ ہونے کے نبی ﷺ کے پاک ارشاد سے باہر نہیں۔

يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا. (صحیح بخاری جلد۲)

اب ذیل میں چند احادیث بطور نمونہ ذکر کی جاتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوگا کہ تصدیق حدیث کے لئے آیت قرآنی کا حوالہ دینا حضرت ابوہریرہؓ کے خاص مذاق میں تھا اور نیز یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کسی حدیث میں اس حوالہ آیت کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اور کبھی صرف حوالے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

حدیث اوّل

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا فَاِذَا طَلَعَتْ وَرَاٰهَا النَّاسُ اٰمَنَ مَنْ عَلَيْهَا فَذٰلِكَ حِيْنَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِیْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا. (مسند امام احمد جلد۲ ص ۱۳۱)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ قیامت قائم نہ ہوگی۔ جب تک آفتاب مغرب سے نہ چڑھے گا۔ پس جب چڑھے گا اور لوگ اس کو دیکھ لیں گے۔ تو سب لوگ ایمان لائیں گے پس یہ وہ وقت ہوگا کہ کہ کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا۔ جو پہلے ایمان نہ لایا تھا۔ یا جس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کی تھی۔"

حدیث دوم

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ اِلَّا نَخَسَهُ الشَّيْطٰنُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ نَخْسَةِ الشَّيْطَانِ اِلَّا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهُ ثُمَّ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اِقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ اِنِّیْ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. (مسند احمد جلد۲ صفحہ ۲۳۳)

حدیث: "ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو کوئی پیدا ہوتا ہے۔ شیطان پیدائش کے وقت اس کو ایذا دیتا ہے۔ پس وہ چیختا ہے مگر ابن مریم اور اس کی ماں کو شیطان یہ ایذا نہیں دے سکا۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ نے کہا۔ کہ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو اِنِّیْ اُعِيْذُهَا بِكَ الآیہ۔

حدیث سوم

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تَفْضُلُ الصَّلٰوةُ فِیْ الج

"ابو ہریرہؓ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجھے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی

الجمیع علی صلوۃ الرجل وحدہ خمسا و عشرین و یجتمع ملائکۃ اللیل و ملائکۃ النھار فی صلوۃ الفجر ثم یقول ابوھریرۃ اقرؤا ان شئتم و قرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشھودا. (مسند امام احمد جلد ۲ ص ۲۳۳)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا با جماعت نماز اکیلے شخص کی نماز سے پچیس درجے بڑھ کر ہے اور فجر کی نماز میں دن اور رات کے فرشتے اکٹھے ہوتے ہیں۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اگر چاہو تو قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ لو و قرآن الفجر الخ"۔

حدیث چہارم

فی حدیث طویل رواہ ابوھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ سئل عن الحمر فقال ما انزل اللہ علی فیھا الا الایۃ الفاذۃ الجامعۃ من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ. (مسند امام احمد ج ۲ ص ۲۳۳)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے گدھے کی بابت پوچھا گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا مجھ پر اس بارے میں کوئی خاص حکم نازل نہیں ہوا۔ مگر یہی ایک جامع آیت فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ الخ"

حدیث پنجم

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ خلق الخلق حتی اذا فرغ من خلقہ قالت الرحم ھذا مقام العائذ بک من القطیعۃ قال نعم اما ترضین ان اصل من وصلک و اقطع من قطعک قالت بلی یا رب قال فھو لک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقرؤا ان شئتم فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض و تقطعوا ارحامکم. (صحیح بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (مثالی طور پر) فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کر لیا تو رحم (رشتے داروں کے ساتھ پیوند رکھنے کے علاقہ) نے کہا کہ الٰہی میں تیرے ساتھ رشتہ قطع کرنے والوں سے پناہ مانگنے والا حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو اس پر راضی نہیں کہ

جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ وقت قریب آتا ہے۔ کہ عیسٰی بن

ہے کہ میں اپنی رضا اس پر رکھوں۔ جو تیرے پیوند کو قائم رکھے اور جو تجھے قطع کرے۔ میں بھی اس سے قطع کردوں؟ کہا ہاں اے میرے رب! فرمایا پس یہ ہو چکا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر چاہو تو آیت قرآنی پڑھ لو۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ الآية''

ناظرین! خود غور فرمالیں کہ ان احادیث سے وہ سب امور جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ ثابت ہوتے ہیں یا نہیں؟

باقی رہا دوسرا عذر یعنی ان شرطیہ شک کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا یہ استدلال شکی ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت ابوہریرہؓ کے کلمہ اِنْ شِئْتُمْ کہنے سے اس استدلال کو شک کی طرف نسبت کر سکتے ہیں تو یہی کلمہ اِنْ شِئْتُمْ اسی طرح تصدیق حدیث کے لئے آیت قرآنی کا حوالہ دیتے وقت خاص رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے اوپر کی حدیثوں میں سے پانچوں حدیث صلۂ رحم میں گذر چکا ہے۔ پس اس نظر سے تو معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ ناطق بالوحی کے استدلال کو بھی شک کی طرف نسبت کرسکنا منع نہ ہوگا۔ وَهَلْ هٰذِهٖ اِلَّا جُرْاَةٌ عَظِيْمَةٌ وَ فِرْيَةٌ قَبِيْحَةٌ اصل بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر کلمہ اِنْ شِئْتُمَا اس بات کے لئے نہیں ہوتا کہ متکلم کو اپنے کلام کی تصدیق میں شک وتردد ہے۔ بلکہ مخاطبین کے حال کی نسبت یہ خیال کر کے کہ وہ زیادہ علم اور دلیل کے طالب ہیں۔ ان کے مزید اطمینان کے لئے آیت قرآنی کو پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے سوال میں وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ یعنے یا الٰہی اس لئے نہیں پوچھتا کہ مجھے مردوں کے زندہ ہوجانے میں کچھ شک ہے۔ نہیں زیادہ اطمینان اور تسلی دل کے لئے پوچھتا ہوں''

جو لوگ علوم میں گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور مذاق صحیح اور فطرت سلیم والے ہیں۔ وہ اس مسئلہ کو خوب پہچانتے ہیں۔ اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی سلامتی اپنے حال پر نہیں رہی۔ اور کجروی اور تعصب سے ان کا مذاق صحیح جاتا رہا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آنے سے یہ بات غلط نہیں ہوسکتی۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

۱۱۲ المصنف۔

مریم تم میں ضرور ضرور اتریں گے۔ فیصلہ کرنے والے ہو کر منصف ہو کر۔ پس صلیب کو توڑ دیں گے۔ اور خنزیروں کو قتل کرائیں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے۔ اور مال و دولت اس کثرت سے ہو جائے گی۔ کہ اس کو کوئی قبول بھی نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ ایک سجدہ دنیا کی سب چیزوں سے بہتر خیال کیا جائے گا۔ پھر ابو ہریرہؓ کہتے ہیں' اگر تم چاہو تو (اس حدیث کی تصدیق کے لئے) یہ آیت پڑھ لو۔ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ. ''

اس آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ کو نزول عیسیٰ علیہ السلام سے بدیں وجہ تعلق ہے کہ آیت وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ (یعنی میں ان کے اعمال واقوال کو دیکھتا سنتا رہا۔ جب تک ان کے بیچ رہا) سے صاف ثابت ہے کہ شاہد کا اس جماعت میں ہونا ضروری ہے۔ جس پر اس نے شہادت دینی ہو پس جب آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (یعنی نہیں ہوگا کوئی اہل کتاب میں سے مگر ایمان لے آئے گا عیسیٰ علیہ السلام پر پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر شاہد ہوں گے) سے ان اہل کتاب پر جو زمانہ اخیر میں ہوں گے۔ اور حضرت عیسیٰ پر سچا ایمان لے آئیں گے۔ بروز قیامت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے ثابت ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ کے لوگوں میں آئیں گے فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى هٰذَا التَّوْفِيْقِ' انشاء اللہ اس آیت کی پوری تفسیر باب نزول المسیح میں کی جائے گی۔

اب اس سوال کی دوسری شق یعنی اللہ تعالیٰ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سوال ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ قیامت کے روز کہنے کی مزید تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

مثال اول:۔

اذ اور اذا دو کلمے ظروف زمانیہ میں سے ہیں۔ اذ ماضی کے لئے آتا ہے

اور کبھی بمعنی مستقبل بھی مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اذا مستقبل کے لئے اور کبھی ماضی کے لئے بھی آتا ہے۔ چنانچہ مغنی میں بحث اذا میں لکھا ہے:-

اَحَدُهُمَا اَنْ تَجِیْءَ لِلْمَاضِیْ كَمَا تَجِیْءُ اِذْ لِلْمُسْتَقْبِلِ مثال اذا بمعنی اِذْ آیت وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَنِ انْفَضُّوْٓا اِلَیْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا. (پ۲۸جمعہ)

ترجمہ "اور جس وقت انہوں نے تجارت یا کھیل کا سامان دیکھا تو اس کی طرف اٹھ گئے اور تجھے کھڑے چھوڑ دیا۔" (۱۱:۶۲)

اور نیز آیت حَتّٰٓی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ. (توبہ پ۱۱) ترجمہ: "حتیٰ کہ جس وقت زمین ان پر باوجود فراخ ہونے کے تنگ ہوگئی۔ اور ان کی جانیں بھی ان کو گراں معلوم ہوئیں"۔ (۱۱۸:۹) مثال اذ بمعنی اذا یعنی مستقبل آیت فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ (مومن پ۲۴) ترجمہ: "پس یہ لوگ اس وقت ضرور جان لیں گے۔ جب ان کی گردنوں میں طوق پڑیں گے"۔ (۴۰: ۷۰، ۷۱) کیونکہ سوف جو خاص استقبال کے لئے موضوع ہے قرینہ موجود ہے۔

مثال دوم:-

اِذْ مَا دَخَلْتَ عَلَی الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَهٗ
حَقًّا عَلَیْكَ اِذَا اطْمَاَنَّ الْمَجْلِسُ (مفصل زمخشری)

کیونکہ صیغہ امر اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ اذ بمعنی اذا ہے۔

مثال سوم:-

ثم جزاک الله عنی اذ جزی
جنتِ عدنٍ فی السموٰتِ العلی

ترجمہ:- جب خدا تعالیٰ جزا دینے لگے۔ تو تجھ کو میری طرف سے اونچے آسمانوں میں جنتیں عطا کرے۔ اس جگہ بھی اذ بمعنی اذا مستعمل ہوا ہے۔ بقرینہ

جُنّبَ عَذِنِ. کیونکہ یہ سب قیامت کو ہوگا۔ اور قیامت زمان مستقبل میں ہوگی۔ نہ کہ ماضی میں ہو چکی ہے۔ (تفسیر خازن وقسطلانی شرح صحیح بخاری)

اسی طرح قرآن وحدیث وکتب ادب میں اس کی بہت مثالیں ہیں کہ اذ بمعنی اذا مستعمل ہوتا ہے۔ اور اذا بمعنی اذ۔ کتب نحو بھی اس کی تائید سے بھری پڑی ہیں۔ طالب تفصیل شرح ملا جامی۔ رضی شرح کافیہ۔ تکملہ مولانا وفخرنا مولوی صاحب سیالکوٹی کا مطالعہ کرے۔

وجہ دوم:۔

مضمون آیت وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عطف ہے۔ مضمون آیت اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ الآیۃ پر۔ اور اس سے پہلے جہاں سے یہ ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَآ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ. (مائدہ پ ۷) یعنی ''جس دن اللہ تعالیٰ کل رسولوں کو جمع کرے گا۔ اور ان سے پوچھے گا کہ لوگوں نے تم کو کیسے قبول کیا اور کیا کچھ کہا تو وہ کہیں گے کہ الٰہی (ہم کو لوگوں کی نیتوں کی حقیقت اور ان کے دلوں کے رازوں کا) کوئی علم نہیں۔ ہر بات کی حقیقت وراز سے واقف ہونا تیرا ہی خاصہ ہے۔'' (۵:۱۰۹) پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو خاص طور پر خطاب کر کے کہے گا کہ مریم کے بیٹے عیسیٰ میری وہ خاص نعمتیں یاد کر جو میں نے تجھ پر اور تیری والدہ پر انعام کیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ سب نعمتیں ذکر کی ہیں۔ اور نعمتوں کے ذکر کے بعد اصل مقصود کا بیان فرمایا۔ کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا لوگوں کو تو نے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوائے معبود مقرر کر لو۔ (۵:۱۱۶)

اب يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ سے تو صاف معلوم ہو گیا کہ یہ سارا معاملہ اس دن ہوگا۔ جس دن اللہ تعالیٰ کل رسولوں کو جمع کرے گا۔ اور وہ دن سوائے قیامت کے کون سا دن ہو سکتا ہے۔ اس کے نظائر قرآن شریف میں بکثرت ہیں

شہادت القرآن

مثلاً فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (اعراف پ ۸) یعنی ''جن لوگوں کی طرف ہم نے رسول بھیجے ہیں۔ ان کو اور خود رسولوں کو بھی ہم ضرور ضرور پوچھیں گے'' (۷:۶) اور یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ (بنی اسرائیل پ ۱۵) یعنی ''جس دن ہم لوگوں کو ان کے امام (نبی وقت) سمیت بلائیں گے۔'' (۱۷:۷۱) اور یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِیْلَ (فرقان پ ۱۸) یعنی ''جس دن اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو اور جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوائے عبادت کرتے ہیں۔ ان سب کو جمع کرے گا۔ تو ان سے کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا یا وہ خود گمراہ ہو گئے تھے''۔ (۲۵:۱۷) اور وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ (سبا پ ۲۲) یعنی ''جس دن اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو جمع کرے گا۔ تو فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟'' (۳۴:۴۰)

یہ سب آیتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنائے گئے ہیں' ان کو یہ سوال قیامت کو پوچھا جائے گا۔ اور اس دن پیغمبروں کو بھی تبلیغ اور لوگوں کی قبولیت کی بابت پوچھا جائے گا۔ تو چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی پیغمبر برحق ہیں۔ اور نیز اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بھی مانے گئے ہیں۔ اس لئے ان کو یہ سوال بروز قیامت ہوگا۔ نہ کہ اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دیگر یہ کہ اس سارے مذکور کے بعد هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ پ ۷) موجود ہے یعنی ''یہ وہ دن ہے جس دن صادقوں کو ان کا صدق نفع پہنچائے گا۔'' (۵:۱۱۹) اور یہ بھی قیامت ہی کا روز ہے۔

لوگوں اور رسولوں سے یہ سوال کرنے کی حکمت یہ ہے کہ رسولِ وقت کے سامنے اس کی امت پر تبلیغ رسالت ثابت کر کے ان پر حجت پوری کی جائے۔ تاکہ عذاب میں گرفتار ہونے کی صورت میں کوئی عذر نہ کر سکیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ بطور

استفہام کے سوال کرنے سے پاک ہے۔ پس اسی طرح نصاریٰ کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کو یہ سوال کرنا کہ ''کیا تو نے ان کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوائے معبود مان لو۔'' اس میں بھی یہی حکمت ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے روبرو تبلیغ رسالت اور تعلیم توحید کی شہادت دیں۔ اور نصاریٰ مشرکین پر الزام قائم ہو کر حجت پوری کی جائے۔ پس ضروری ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت دونوں حاضر ہوں اور یہ حاضری اور سوال و جواب قیامت سے پہلے نہیں ہو سکتے۔ کیا (معاذ اللہ) رسول برحق حضرت مسیح علیہ السلام بری از الزام کو شرمندہ کرنا مقصود ہے کہ ان کی امت کی غیر حاضری میں عالم برزخ میں سوال کیا جائے۔ پس ان سب اگلے اور پچھلے قرائن اور دلائل سے صاف روشن ہو گیا کہ یہ سوال قیامت کو ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر آیت سورہ نساء وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا یعنی ''عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان (اہل کتاب) پر شاہد ہوں گے۔'' تصریح روز قیامت میں ایسی عیاں ہے کہ محتاج بیان نہیں۔ اس سے زیادہ صراحت کیا ہو کہ اللہ تعالیٰ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لفظ فرمادے۔ سُبْحَانَ رَبِّنَآ. رَبَّنَا اٰمَنَّا۔

وجہ سوم:۔

اس سوال کے قیامت کو ہونے کی صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ میں قال بمعنی یقول ہے یعنی بمعنی مستقبل ہے۔ اور جمہور مفسرین نے بھی اس امر کو تحقیق کیا ہے مثلاً تفسیر خازن۔ تفسیر سراج منیر وغیرہ وغیرہ۔ اور شارحین صحیح بخاری مثلاً حافظ ابن حجرؒ اور علامہ قسطلانیؒ اور علامہ عینی حنفی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے بلکہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں ایک مرفوع حدیث بھی لکھی ہے کہ

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا کان يَوْمُ الْقِيٰمَةِ دُعِیَ بالانبیاء واُمَمِهِمْ ثُمَّ يُدْعٰى يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ فَيُذَكِّرُهُ اللّٰهُ نِعْمَتَهُ عَلَيْهِ فَيُقِرُّبِهَا فَيَقُوْلُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ

عَلَیْکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ الآیة ثم یقول ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیُنْکِرُاَنْ یَکُوْنَ قَالَ ذٰلِکَ. (الحدیث) ابن کثیر۔

''جب قیامت کا دن ہوگا۔ کل نبیوں اور امتوں کو بلایا جائے گا۔ پھر خاص طور پر عیسیٰ علیہ السلام کو پکارا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ وہ نعمتیں جو اس نے ان پر کی ہیں۔ ان کو یاد کرائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اقرار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم میری وہ نعمتیں یاد کرو۔ جو میں نے تجھ پر اور تیری ماں مریم پر انعام کیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوائے دو معبود مان لو؟ پس عیسیٰ علیہ السلام اس بات کے کہنے سے انکار کریں گے۔''

پس جب خود اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ کی تصریح کردے۔ اور اس کا رسول بھی فرماوے اور علما بھی اس کی تحقیق کریں۔ اور کتب نحو اور آیات قرآنی اور محاورات زبان بھی اذ کے معنی مستقبل ہونے کی شہادت دیں۔ تو اب اس کا انکار سوائے ضلالت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَال

سوال:-

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ روز قیامت کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ:

يُؤْخَذُ برجالٍ من اصحابي ذات اليمين وذات الشمال فاقول اُصَيحَابِيْ فَيُقَالُ اِنَّهُمْ لَمْ يَزَالُوْا مُرْتَدِّيْنَ عَلٰى اعقابهم منذُ فَارَقْتَهُمْ فاقول كما قال العبد الصالح عيسٰى ابْنَ مَرْيَمَ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّادُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ. الآيه

(صحیح بخاری)

"لوگوں کو دائیں بائیں سے پکڑا جائے گا تو میں کہوں گا۔ ہیں؟ یہ تو میری امت کے لوگ ہیں تو مجھے کہا جائے گا کہ نہیں یہ وہ ہیں۔ کہ جب سے تو ان سے جدا ہوا (یعنی فوت ہوا) یہ دین سے برگشتہ ہو کر (موت تک) مرتد ہی رہے۔ تو میں کہوں گا جس طرح کہا ہو گا عبد صالح عیسٰی علیہ السلام ابن مریم نے کہ الٰہی میں تو ان پر شاہد اس وقت تک رہا جب تک میں ان کے بیچ موجود رہا جب تو نے مجھے بھر لیا۔ تو صرف تو ہی ان پر نگہبان تھا۔"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام سے یہ سوال و جواب ہو چکا ہوا ہے۔ کیونکہ الفاظ حدیث یہ ہیں فَاَقُوْلُ كَمَا قَالَ اور قال فعل ماضی ہے

اور نیز اس حدیث سے یہ حاصل ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی توفی موت سے ہوئی۔ کیونکہ جو الفاظ یعنی فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہیں وہی نبی ﷺ کہیں گے۔ اور معلوم ہے کہ نبی ﷺ کی توفی موت سے ہوئی۔ ھذا تقریر السؤال۔

جواب:۔

اس سوال کا جواب کئی وجوہ سے ہے۔ اول یہ کہ الفاظ فاقول کما قال میں قال کو بلفظ ماضی ذکر کرنا بنا بر حکایت ہے اس قول سے جو قرآن شریف میں مذکور ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ ''کہوں گا میں جس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ وہ یہ کہیں گے۔ دیگر یہ کہ صحیح بخاری ہی سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس جگہ قال بمعنی یقول یعنی ماضی بمعنی مستقبل ہے پس معنی یہ ہوں گے۔ ''پس میں کہوں گا۔ جس طرح کہے گا عبد صالح عیسیٰ علیہ السلام۔''

دیگر یہ کہ جب صحیح بخاری سے ثابت ہو چکا کہ اس جگہ ماضی بمعنی مستقبل ہے۔ تو قیامت کو رسول اللہ ﷺ کا قول عیسیٰ علیہ السلام کے قول سے پہلے ہوگا یا پیچھے۔ اگر پہلے ہوگا تو معنی یہ ہوں گے۔ ''کہوں گا میں جس طرح کہے گا عیسیٰ علیہ السلام'' اور اگر پیچھے ہوگا تو معنی یہ ہوں گے۔ ''کہوں گا میں جس طرح کہا ہوگا عیسیٰ علیہ السلام نے'' پس اس صورت میں حضرت عیسیٰ کا قول بہ نسبت نبی ﷺ کے قول کے قیامت ہی کو زمانہ ماضی میں ہو چکا ہوگا۔ پس قال کو ماضی کے صیغے سے ذکر کرنے سے اس قول کا قیامت سے پیشتر واقع ہونا ثابت نہ ہوا۔ دیگر لفظ ماضی کو يَقُوْلُ مستقبل کے معنی میں لینا خلاف قاعدہ نہیں بلکہ یہ تو زبان کا ایک عام قاعدہ ہے کہ جو امر ضرور ضرور واقع ہو جاتا ہو۔ اس کو صیغہ ماضی سے بیان کرتے ہیں۔ گویا اس کو دوسرے کی نظر میں ہوا ہوا جتانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن شریف اور دیگر کتابوں میں بکثرت ہیں۔ اور نحویوں کے نزدیک اس مسئلہ کا نام نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ہے۔ یعنی جس طرح آیت نُفِخَ فِي الصُّوْرِ میں نُفِخَ فعل

ماضی ہے۔ اور معنی اس کے یُنْفَخُ فعل مستقبل کے ہیں۔ یہ لفظ جو فعل ماضی سے مستعمل ہوا ہے ایسا ہی ہے۔

مستقبل کو بہ سبب تحقق و وقوع کے لفظ ماضی سے تعبیر کرنا زبانِ عربی ہی کا خاصہ نہیں بلکہ ہر زبان میں یہ محاورہ عام پایا جاتا ہے۔ جیسے ہماری اپنی ہندی زبان میں جب کوئی کسی کو بلاتا ہے۔ تو دوسرا شخص ان لفظوں سے جواب دیتا ہے ''جی آیا جی۔'' حالانکہ وہ ابھی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب کوئی کسی کو کسی کام پر بھیجے۔ اور سخت تاکید سے کہے جلدی جانا اور شتاب واپس آنا۔ تو اس کی تسلی کے لئے اور اپنی مستعدی اور شتابی ظاہر کرنے کے لئے اس کو یہ کہا جاتا ہے۔ ''بس جی یہ گیا اور وہ آیا۔'' حالانکہ وہ اس کے روبرو ہی یہ سب کچھ کہہ سن رہا ہوتا ہے۔ یہ صرف اس لئے ہوتا ہے تاکہ مخاطب کو اس امر کا ضرور ضرور واقع ہو جانا متیقن ہو جائے۔ پس آیت اِذْ قَالَ اللّٰہُ میں بھی صیغۂ ماضی کا ذکر کرنا اسی قبیل سے ہے اس جگہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ مرزا صاحب نے اپنے ازالہ میں جو کچھ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ میں لکھا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اِذْ جب ماضی پر داخل ہوتا ہے تو اس کے معنی ماضی کے ہوتے ہیں'' اگر ان کی یہی مراد ہے۔ تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب علم نحو میں پختہ نہیں ہیں۔ صرف سادے طور پر چند مسائل جانتے ہیں۔ اور اس علم کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اذ کے مدخول علیہ کی ماضویت کی کوئی خصوصیت نہیں خواہ اس کا مدخول علیہ صیغہ ماضی ہو۔ خواہ صیغہ مضارع۔ یہ لفظ بحسب الوضع معنی ماضی میں ہوتا ہے۔ جیسے وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (احزاب پ ۲۱۔ ۳۳: ۱۲) اور کبھی مصروف عن المعنی الوضعی ہو کر بمعنی اذا مستعمل ہوتا ہے۔ جیسے کہ اذا موضوع ہے مستقبل کے لئے۔ اور کبھی بمعنی ماضی مستعمل ہوتا ہے۔ وَقَدْ تَقَدَّمَ نَظَائِرُ ذٰلِكَ فَلا طَائِلَ فِی الْاِطَالَةِ [1]

[1] اس کی مثال پہلے بیان کی جا چکی ہیں پس (اب) طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عبدالقیوم میر۔

اگر کہا جائے کہ تمہارے اس بیان سے معلوم ہوا کہ اگر اذ مضارع بھی آئے۔ تب بھی اس کے معنی ماضی ہوتے ہیں۔ تو اگر اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى میں قال کو بمعنی یقول کہیں۔ تو پھر بھی وہ مضارع ماضی کے معنی میں ہو سکتا ہے تو اس کا جواب دو وجہ سے ہے۔ اوّل یہ کہ اذ مضارع کے لفظ پر داخل ہو کر اس کو ماضی کے معنی میں کر دیتا ہے نہ مضارع کے معنی پر داخل ہو کر۔ اسی لئے تقریر میں صیغہ مضارع کہا گیا ہے اور یہاں آیت میں تو قال لفظ مضارع نہیں۔ بلکہ ماضی بمعنی مضارع ہے اور اس قال کو مضارع کے معنی میں ہونے کی وجہیں پہلے گذر چکی ہیں۔

دوم یہ کہ صحیح بخاری میں اس امر کی بابت لکھا ہے کہ یہ اذ صلہ یعنی زائد ہے۔

غرض کسی طرح لو۔ اس قول کا وقوع قیامت ہی کو ہوگا۔

باقی رہی سوال کی شق ثانی یعنی ہر دو پیغمبروں کے لئے لفظ توفی کا آنا اور اس پر لفظ كَمَا کا داخل ہونا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کلمہ كَمَا کے ماقبل و مابعد کے لئے ضروری نہیں۔ کہ وہ ہر طرح اور ہر وصف اور ہر حکم میں ایک جیسے ہوں بلکہ بسا اوقات ان کی کیفیتوں میں بہت مغائرت ہوتی ہے۔ مثلاً آیت كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء پ ۱۷) یعنی "جس طرح ہم نے پہلی دفعہ پیدا کر لیا تھا۔ اسی طرح پھر دوسری دفعہ بھی پیدا کر لیں گے۔ (۲۱:۱۰۴) جو اسی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس پہلی دفعہ کی پیدائش اور قیامت کی پیدائش کو کلمہ كَمَا (جس طرح) سے ذکر کیا۔ تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلے گا کہ پہلی دفعہ ماں کے پیٹ سے باپ کے نطفے سے پیدا ہوئے تھے۔ تو پھر قیامت کو بھی اسی طرح پیدا ہوں گے۔ معاذ اللہ پہلی اور پچھلی پیدائش کی مماثلت صرف اس امر میں جتلائی گئی ہے۔ کہ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہیں۔ جس طرح پہلی دفعہ کی پیدائش کو تم دیکھ چکے۔ اسی طرح دوسری دفعہ موت کے بعد زندہ کرنا بھی اس خالق علیم کی قدرت سے باہر نہیں۔ بلکہ اس میں داخل ہے۔ اسی طرح فاقول كما قال العبد الصالح میں جو لفظ کما مذکور ہے۔ وہ تو صرف اس بات کے اظہار کے لئے ہے

کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرک کی تعلیم سے برأت حاصل کریں گے۔ اسی طرح میں بھی برأت حاصل کروں گا۔ اور اس کے نظائر قرآن و حدیث اور کتب ادب میں بکثرت ہیں۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے مان لیا کہ کلمہ کَمَا کے ماقبل و مابعد کا ہر طرح سے ایک دوسرے کا مماثل و مشارک ہونا ضروری نہیں۔ مگر جب کہ دونوں پیغمبروں کے لئے ایک ہی لفظ توفی آیا ہے۔ تو اب ہم کس دلیل سے رسول اللہ ﷺ کی توفی کو تو موت کہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی کو رفع آسمانی سے تعبیر کریں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پیچھے خاص کر پہلے باب میں بہت تفصیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ توفی جنس ہے اور موت اور رفع وغیرہ اس کی انواع ہیں۔ پس جس لفظ کے مفہوم میں کئی معنی ہوں اس کو ایک معنی میں معین کرنے کے لئے قرائن اور حالات مخصوصہ اور دلائل خارجیہ پر نظر کرنی پڑتی ہے۔ جیسے کہ اسی آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے پیشتر تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ (مائدہ پ ۷) یعنی ''یا اللہ! میرے نفس میں جو کچھ ہے تو اسے خوب جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے نفس میں ہے میں اسے ہرگز نہیں جانتا۔'' (۵:۱۱۶) اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام (بندے) اور اللہ پاک کے لئے ایک ہی لفظ نفس وارد ہوا ہے۔ تو کیا اس سے یہ لازم آیا کہ معاذ اللہ! عیسیٰ علیہ السلام کا نفس اور پاک و بے مثل نفسِ الٰہی ایک جیسے ہیں معاذ اللہ! تعالی اللہ عن ذلک عُلُوًّا كَبِيرًا. اسی طرح گو ایک ہی لفظ (توفی) دونوں پیغمبروں کے لئے مستعمل ہے۔ مگر ہر دو کے حالات مخصوصہ جو دلائل خارجیہ سے ثابت ہیں۔ ان پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی رفع آسمانی سے ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کی توفی موت سے ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توفی بالرفع ہونے کے دلائل حصہ اول میں بہ بسط مذکور ہو چکے ہیں۔ جیسے آیت إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ الآیہ اور بَلْ

رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ طالب تفصیل اس کتاب کا مطالعہ کرے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی توفی بالموت کی دلیل حدیث صحیح بخاری جو باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مرضہ. میں موجود ہے اور نیز دیگر احادیث مثلاً نبی ﷺ کے غسل اور کفن اور جنازے کی۔

پس آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي سے بھی مرزا صاحب کی مراد کے موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے خلاف رفع آسمانی ثابت ہوا۔ فالحمدللہ۔

قسم اول میں سے تیسری آیت: بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ہے۔ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے لئے نص قطعی ہے اور اس کی پوری تفصیل حصہ اول میں ہو چکی ہے۔ اور اس کے متعلق مرزا صاحب کے سب خیالات کو عقلی اور نقلی طریق سے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ اس کے جواب میں اگر مرزائی صاحبان مدتوں سر دھنتے رہیں اور زانوں کوشش کرتے رہیں۔ تو بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ان شاء اللہ۔

مرزا صاحب کے طریق استدلال پر تعجب آتا ہے کہ کیسی دلیری اور بے باکی سے آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ کیا اہل علم و دانش دنیا سے معدوم ہو گئے ہیں!

کس نیاید بزیر سایۂ بوم

درہما از جہاں شود معدوم

اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کو ثابت کرنا ایسا ہے جیسے بعض عیسائیوں نے قرآن شریف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنی چاہی ہے۔ جب ہم اس آیت کے متعلق مرزا صاحب کی تقریر پڑھتے ہیں تو ہمیں بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ اور خیال آتا ہے کہ مرزا صاحب کی حالت دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو آپ علوم عربیہ سے ناواقف ہیں یا جان بوجھ کر ان علوم کا خلاف

کرتے ہیں۔ دوسری صورت پر ظن غالب ہے کیونکہ بالفرض اگر خود ناواقف بھی ہوں تو بھی تبحر علما کے اتنی مدت تک مفید کتابیں تصنیف کرنے سے ایک کم علم انصاف پسند بھی صحیح مراد سے واقف ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ مرزا صاحب ہوں جو معارف قرآنیہ کے سب سے بڑھ کر مدعی ہیں۔

مرزا صاحب نے اس آیت سے موت ثابت کرنے کے لئے جو طریق اختیار کیا ہے وہ علاوہ غلط اور ضعیف ہونے کے خود ان کے مقصود کے بھی خلاف ہے۔

آپ لکھتے ہیں۔

"جاننا چاہئے کہ اس رفع سے مراد وہ موت ہے۔ جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ دوسری آیت اس پر دلالت کرتی ہے۔"وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا"

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

"لہٰذا یہ امر ثابت ہے کہ رفع سے مراد اس جگہ موت ہے۔ مگر ایسی موت جو عزت کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ مقربین کے لئے ہوتی ہے کہ بعد موت ان کی روحیں۔ علیین تک پہنچائی جاتی ہیں۔ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ." انتہی

مرزا صاحب کا اصل مقصود یہ ہے کہ اس آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسانی ثابت نہ ہو۔ اسی لئے کئی دفعہ کہا کرتے ہیں کہ جسم عنصری کے اٹھائے جانے کی کوئی دلیل نہیں اور نہ آسمان کی تصریح ہے۔ تو پھر ضرور رفع روحانی اور عزت کی موت مراد لی جائے گی۔

"ازالہ اوہام" کی جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس سے اس امر کا فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہے کہ رفع کے معنی اٹھانا اور الیہ کے معنی آسمان کی طرف مرزا صاحب کے نزدیک مسلم ہیں۔ کیونکہ آپ جب ارواح کے اٹھائے جانے کے قائل ہیں۔ تو اس صورت میں رفع کے حقیقی معنی اٹھانا ثابت ہیں اور چونکہ ارواح کا اٹھایا جانا آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ بھی اسے علیین کے لفظ سے

تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ میں آسمان کی طرف حقیقی طور پر اٹھایا جانا آپ کے نزدیک مسلم ٹھہرا۔ اب تنازع صرف اس امر میں رہا کہ کیا چیز اٹھائی گئی؟ آیا خود مسیح علیہ السلام مع جسم اٹھائے گئے یا صرف آپ کی روح؟ سو اس کا صاف بیان اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (نساء پ ۶)
یعنی ''یہودیوں پر ان کے اس قول کے سبب لعنت پڑی کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے ضرور ضرور مسیح علیہ السلام ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا اور انہوں نے اس کو نہ تو قتل کیا اور نہ صلیب پر کھینچا۔'' (۴:۱۵۷)

اور ظاہر ہے کہ قتل کرنے اور صلیب پر کھینچنے کے قابل جسم ہوتا ہے نہ روح۔ پس یہود کا دعوائے قتل مسیح علیہ السلام کے جسم کی نسبت ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی قتل اور صلب کی نفی جسم مسیح علیہ السلام کی نسبت کی۔ پس چونکہ سب منصوب ضمیریں جو وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اور وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا مرجع المسيح ہے۔ اس لئے ضرور ضرور مسیح علیہ السلام کے جسم کا اٹھایا جانا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ جس چیز کی نسبت یہود دعویٰ کرتے تھے۔ کہ ہم نے اس کو قتل کر دیا۔ اسی کی نسبت اللہ تعالیٰ تردید کے طور پر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان پر اٹھا لیا۔ اور چونکہ ان کا دعویٰ جسم کے قتل وصلب کی نسبت تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی جسم ہی کو ان کی گزند سے بچانے کے لئے اٹھایا۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. (آل عمران پ ۳)
یعنی ''میں تجھ کو کفار سے پاک رکھوں گا۔'' (۳:۵۵)

اس مقام پر مرزا صاحب کا آیت وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کو پیش کرنا بالکل بے محل ہے۔ اور اس سے ان کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ رَفْع کے معنی ''عزت کی موت۔'' نہ تو بشہادت لغت ثابت ہے۔ اور نہ یہ لفظ عرف عام اور عرف شرع میں ان معنوں میں پایا گیا ہے۔ اور نہ یہ کسی فن کی اصطلاح ہے تو پھر

مرزا صاحب کس قاعدے سے اس سے عزت کی موت مراد لیتے ہیں۔ لغت میں رفع کے معنی ہیں۔ ''برداشتن'' یعنے اوپر اٹھانا۔ اور اس کی ضد ہے وضع اور خفض یعنی نیچے رکھنا جیسے کہ صراح اور نیز مصباح میں لکھا ہے اور اس کی تحقیق حصہ اول میں بالتفصیل گذر چکی ہے۔ باقی رہی حضرت ادریس علیہ السلام کے رفع کی صورت۔ سو قرآن شریف نے انہی لفظوں میں اس کا بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد رفعت منزلت ہے۔ کیونکہ جب رفع کے ساتھ کوئی لفظ جو بلندی رتبہ پر دلالت کرے مذکور ہو۔ تو اس کے مجازی معنی بلندی درجہ لئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ آیت وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ اور اس جیسی دیگر آیات سے ظاہر ہے۔ پس چونکہ اس کے آگے ہی مَكَانًا عَلِيًّا کی تصریح مذکور ہے۔ اس لئے اس کے معنی اس قرینے سے یہ ہوں گے کہ ''عزت دی ہم نے اس کو بلند رتبے پر۔''

اس بیان سے دو امر برخلاف مقصود مرزا صاحب ثابت ہوئے اول یہ کہ رفع کے معنی عزت کی موت نہیں ہوتے۔ دوم یہ کہ رفع سے مراد بلندی رتبہ جب لئے جاتے ہیں جب اس کے ساتھ کوئی قرینہ پایا جائے ورنہ نہیں۔

مرزا صاحب نے مقربین کی ارواح کے علیین تک اٹھائے جانے میں یہ آیت پیش کی ہے۔ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ۔ مرزا صاحب کا یہ استدلال بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے پیشتر یہ ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (قمر پ۲۷) یعنی ''پرہیزگار لوگ باغوں اور نہروں میں ہوں گے اقتدار والے بادشاہ کے پاس صداقت کے گھر (بہشت میں)'' (۵۴:۵۴، ۵۵) پس پہلی آیت کے ساتھ لانے سے واضح ہو گیا کہ اس میں پرہیزگاروں کے لئے جنت میں داخل ہونے کی بشارت ہے۔ اور یہ سب کچھ بروز قیامت ہو گا پس مرزا صاحب کا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ موت کے وقت پرہیزگاروں کی روحیں علیین پر پہنچائی جاتی ہیں۔ صحیح نہ ہوا کیونکہ اس آیت میں اس امر کا ہرگز ذکر نہیں۔

چوتھی آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (نساء پ ٦۔۴:۱۵۹) مرزا صاحب نے برخلاف مراد الٰہی اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت کرنی چاہی ہے۔ حالانکہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لئے قطعی الدلالت آیت ہے۔ اور نیز آپ کے نزول کی صاف شہادت دیتی ہے۔ جیسا کہ عنقریب ثابت کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔ مرزا صاحب نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ''اور کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو ہمارے اس بیان مذکورہ بالا پر جو ہم نے اہل کتاب کے خیالات کی نسبت ظاہر کیا ہے ایمان نہ رکھتا ہو قبل اس کے جو وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ مسیح اپنی طبعی موت سے مر گیا۔'' الخ (ازالہ جلد اول صفحہ ۱۸۸ تقطیع کلاں)

ناظرین! پیشتر اس کے کہ ہم اس آیت کی صحیح تفسیر ذکر کریں۔ اور آپ کو ثابت کر دکھائیں کہ مرزا صاحب کا استدلال بالکل غلط بلکہ باطل ہے (کیونکہ اس میں تو مرزا صاحب کی مراد کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا بیان ہے۔ اور نیز ان کے دعوائے مسیحیت کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر ہے) ہم آپ کی بالانصاف توجہ اس ترجمہ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ جو ہم نے ازالۂ اوہام تقطیع کلاں ص ۱۸۷، ۱۸۸ جلد اول میں سے اوپر نقل کیا ہے۔ مرزا صاحب نے نہ تو قواعد و محاورات زبان کا خیال کیا ہے۔ اور نہ قرآن شریف کے الفاظ کا لحاظ کیا ہے بلکہ اپنے خیال کے پیرو ہو کر جو کچھ جی میں آیا کہہ دیا ہے اگر خواہش نفسانی یہ نہیں۔ تو پھر کس چیز کا نام ہے؟ اللہ اکبر! اگر قرآن شریف کا ترجمہ اسی طرح کرنا درست قرار دیا جائے کہ ایک امر کو پہلے اپنی جی میں ٹھان لیں۔ اور پھر الفاظ کو موڑ توڑ کر اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔ تو پھر شاید کسی الٹی سے الٹی اور باطل سے باطل بات کو بھی ثابت کر لینا مشکل نہیں ہوگا۔ مخاطب و سامع کے لئے ضروری ہے کہ اپنے خیال کو متکلم کے الفاظ کے تابع رکھے۔ نہ یہ کہ متکلم کے الفاظ کو اپنے

خیال کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے کھینچ لے جائے۔ ترجمہ کرنے کا صحیح طریق یہی ہے کہ پہلے مفردات کے معانی پر غور کیا جائے۔ اور پھر ان کی باہمی ترکیب و تعلق کو زیر نظر رکھ کر مراد کو سمجھا جائے۔ مرزا صاحب اس طریق کے بالکل خلاف چلتے ہیں۔ تب ہی رفع اور حیات اور نزول کے ثابت کرنے والی آیات سے موت سمجھتے ہیں۔

جہاں تک میں نے مرزا صاحب اور آپ کی پارٹی کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک مجھے ان کی پارٹی کے بعض مولویوں سے بحث کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی جماعت میں ابھی تک تین آیتوں کے ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ ہمیشہ ان کے ترجمہ میں تنسیخ و ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ جس سے دفع الوقتی کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور بات کسی ٹھکانے نہیں لگتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان آیتوں میں مرزا صاحب کے مذہب اور دعویٰ کی تردید صاف طور پر مصرح ہے پس ان کو ہمیشہ اس بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ ان آیتوں کے مطالب کو پھیر پھار کر ایسے طریق پر بیان کیا جائے کہ اپنے اوپر حجت پوری نہ ہو۔ اور چونکہ جو معنی وہ کرتے ہیں۔ وہ بلحاظ قواعد مقررہ کسی صورت سے ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اس لئے ہر وقت ان کے ردو بدل کی نسبت ان کی طبیعت میں تردد رہتا ہے۔ اور ہمیشہ گرگٹ کی طرح نئے رنگ بدلتے ہیں۔

اوّل ان تین آیتوں میں سے وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ. دوم یہی آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ. سوم سورۂ زخرف کی آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ

حصہ اوّل (شہادت القرآن) ص ۴۴ میں گذر چکا ہے کہ آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا کے صحیح معنی یہی ہیں کہ آئندہ زمانہ میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے۔ جس میں سب اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ضرور آپ کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔ اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔"

موافق محاورہ زبانِ عرب وقواعد علم نحو اس آیت کے صحیح معنی یہی ہیں اور جتنے معنی اس کے سوا ہیں وہ سب غلط ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لَيُؤْمِنَنَّ میں نون ثقیلہ بالام تاکید آیا ہے۔ اور جملہ کتب نحو کیا متن اور کیا شروح سب میں بالاتفاق مذکور ہے۔ کہ نونِ تاکید مضارع کو خاص استقبال کے لئے کر دیتا ہے۔ اور ماضی اور حال کے لئے نہیں آتا۔ اس مسئلہ میں کسی امام لغت ونحو کو خلاف نہیں نہ کسی آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبوی ﷺ یا کلامِ عرب میں اس کے خلاف نونِ تاکید کا استعمال پایا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابن ہشام نحوی اپنی کتاب مغنی اللبیب میں فرماتے ہیں واما المضارع ان کان حالا لم یُؤکّدْ بهما و ان کان مُستقبلا اُکِّدَبهما وَجوبًا نحو قوله تاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ. انتھٰی (مغنی جلد ثانی ص۲۲) یعنی ”مضارع کا صیغہ (جو حال واستقبال دونوں کے لئے آتا ہے) جب حال کے معنی میں ظاہر ہو تو نونِ تاکید ثقیلہ وخفیفہ اس پر نہیں آسکتے۔ اور اگر مستقبل کے معنی میں ہو تو پھر نون کے ساتھ اس کی تاکید واجب ہوتی ہے۔ جب کوئی کلمہ قسم کا آیا ہو۔“

اسی طرح علامہ رضی شرح کافیہ میں تحریر کرتے ہیں وامّا فی المستقبل الذی هو خبر محض فلا یدخل الا بعدان یدخل علی اول الفعل مایدل علی التوکید ایضًا کلام القسم. انتھٰی۔ یعنی ”جو مستقبل صرف خبری ہی ہو۔ اس پر نون تاکید کا نہیں آتا۔ مگر اس وقت جب کہ فعل کے پہلے کوئی ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے۔ جیسے لام قسم۔“

اسی طرح اس قاعدہ کی نسبت۔ مفصل زمخشری اور کافیہ ابن حاجب اور الفیہ ابن مالکؒ اور شرح ملا جامیؒ اور تکملہ مولانا عبدالحکیمؒ وغیرہ جملہ کتب نحو میں ایسا ہی مذکور ہے۔

مرزا صاحب نے اس آیت کے جو معنی کئے ہیں وہ تو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اور ناظرین معلوم کر چکے ہیں کہ وہ علاوہ قواعد زبانِ عرب کی رو سے غلط ہونے کے

"الفاظ قرآن سے بھی کس قدر دور اور نرالے ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے متعلق مولوی محمد احسن صاحب فاضل امروہی اور مولوی مبارک علی صاحب سیالکوٹی نے جو گل کھلائے ہیں اور قواعد نحویہ کی جو رعایت رکھی ہے۔ اس کو بیان کیا جائے۔ تا کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مرزائی پارٹی اس آیت کے ترجمے میں کیسی حیران و سرگرداں ہے۔ چنانچہ مولوی مبارک علی صاحب اپنے رسالہ **القول الجمیل** ص ۴۸ میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح لکھتے ہیں:۔

> "اور ان اہل کتاب میں سے ہر ایک شخص کے لئے ضروری ہے کہ اس بات کو اپنے جانے کے پیشتر ہی تسلیم کرے (کہ مسیح کی ہڈی نہیں توڑی گئی۔ اس واسطے وہ صلیب پر نہیں مرا) ورنہ یہ تو آخر کو ہونا ہی ہے۔ کہ مسیح جس کی نسبت یہ وہم و گمان بھرے ہوئے اعتقادیات اہل کتاب نے تسلیم کر رکھے ہیں ان کا حال بتلا دے گا۔ اور ان کے برخلاف قیامت کے دن اظہار دے گا۔ اس وقت سب اپنی غلطی سے واقف ہو جائیں گے۔"

ناظرین! علاوہ اس امر کے کہ مولوی صاحب کا یہ ترجمہ قرآن شریف کے الفاظ اور قواعد زبان سے کس قدر اجنبی ہے۔ آپ اپنی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں کہ یہ ترجمہ مرزا صاحب کے اپنے ترجمہ سے کیسا صاف نرالا ہے۔ یہ عجیب امر ہے کہ رسول قادیانی کچھ ترجمہ کرتا ہے اور اس کے امتی کچھ اور ہی راگنی گاتے ہیں۔ ان کا آپس ہی میں اتفاق نہیں تو ہم کس کی مانیں؟ یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب نے اس مقام پر لَیُؤْمِنَنَّ کے معنی صیغۂ امر کے کئے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ "ضروری ہے کہ اس بات کو تسلیم کرے۔"

جہاں تک ہمیں تجربہ ہے۔ مولوی صاحب ہمارے بیان سے تو ضرور چڑیں گے اور بوجہ مخالفت کے سیدھے کو بھی ٹیڑھا جانیں گے۔ اور اپنی غلطی کا ہرگز اعتراف نہ کریں گے اس لئے ناظرین! میں آپ کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ آپ میں

سے کوئی صاحب ان کو یہ سمجھائیں۔ کہ مولوی صاحب! بیشک آپ علمی لیاقت کا تو سب سے بڑھ کر دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اپنے مقابلہ میں کسی کو نہیں جانتے۔ مگر یہ تو بتلایئے۔ کہ آپ نے کس قاعدے سے پہچانا کہ لَیُؤْمِنَنَّ صیغۂ امر غائب موکد بنون تاکید ہے؟ ہاہ! ہاہ!! سچ ہے جان بوجھ کر حق کے خلاف چلنے اور ضد اور تعصب سے باطل کی پیروی کرنے سے علم وعقل دونوں جاتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب! یہ امر کا صیغہ نہیں ہے آپ صرف میر وغیرہ ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کریں کہ امر کا لام مکسور ہوتا ہے اور آیت میں تو مفتوح ہے۔

اسی طرح فاضل امروہی نے اور ہی گل کھلایا۔ اور اپنی فضیلت کی پگڑی کو داغ لگایا چنانچہ مباحثۂ دہلی کے متعلق آپ بعنوان بحث لام تاکید با نون تاکید ثقیلہ لکھتے ہیں۔ (دیکھو الحق سیالکوٹ جلد اوّل نمبر ۸ ص ۱۲۱):۔

> ''ازہری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ لام تاکید کا حال کے واسطے آتا ہے۔ اب تسلیم کیا کہ فقط نون تاکید صرف استقبال کے واسطے ہے لیکن جب کہ کسی صیغہ میں لام تاکید بھی موجود ہو جو حال کے واسطے آتا ہے۔ اور نون تاکید بھی ہو چنانچہ ما نحن فیہ میں ہے۔ تو وہاں پر خالص استقبال بالضرور ہونے کی کیا وجہ۔ اس کی کوئی دلیل مولوی[1] صاحب نے نحو سے ارشاد نہیں فرمائی۔ اور تقریب دلیل محض ناتمام رہی۔ یہ مانا کہ صرف نون تاکید استقبال کے واسطے نحو میں لکھا ہے۔ امر۔ نہی۔ استفہام۔ تمنی۔ عرض وغیرہ ان میں صرف نون تاکید ہوتا ہے بغیر لام تاکید کے۔ پس ان صیغوں میں صرف استقبال ضرور مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن جس صیغہ میں لام تاکید بھی ہو اور نون تاکید بھی۔ اس میں

---

1 یعنی فاضل بے نظیر مولانا محمد بشیر سہسوانی جن سے دہلی میں مرزا صاحب کا مباحثہ ہوا تھا۔ اور مرزا صاحب اسی نون ثقیلہ کے بوجھ سے ایسے گھبرائے کہ برخلاف شرائط مقررہ بحث کو ناتمام چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ ۱۲ منہ

خالص ہونے استقبال کی کیا دلیل ہے۔ انتھی۔''

فاضل امروہی صاحب کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ن ثقیلہ کا مضارع کو استقبال کے معنوں میں کر دیا تو مسلم ہے۔ مگر چونکہ لام تاکید کا حال کے واسطے آتا ہے اور لَيُؤْمِنَنَّ پر لام تاکید اور نون تاکید ہر دو آئے ہیں۔ اس لئے اس صیغہ کو حال اور استقبال دونوں کے لئے سمجھنا چاہیے۔ نہ کہ خالص استقبال کے لئے۔'' جب علم نحو کے ابتدائی مسائل میں مولوی محمد احسن صاحب جیسے جید علما کو ایسا التباس و اشتباہ واقع ہو۔ جو علوم رسمیہ میں خود مرزا صاحب اور مولوی حکیم نور الدین صاحب سے کئی درجے زیادہ لائق ہیں۔ تو ہم اس پارٹی کی لیاقت علمی اور عقل و دانش کے کیسے قائل ہوں۔ بھلا مولوی مبارک علی صاحب کی نسبت تو یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ناواقفی کی وجہ سے لَيُؤْمِنَنَّ کو امر کا صیغہ سمجھ لیا ہے۔ مگر مولوی محمد احسن صاحب کی فضیلت میں ایسا گمان تو بہت بعید ہے۔ ان کو اس لام قسم اور لام حال میں کیوں اشتباہ ہوا۔ آخر ماننا پڑے گا کہ فاضل امروہی صاحب نے جان بوجھ کر خلق خدا کو مغالطہ میں ڈالنا چاہا ہے۔ لیجئے ہم فاضل امروہی صاحب کو ایک ایسی بات یاد کراتے ہیں جو وہ بوجہ پیری کے بھول گئے ہیں۔

امروہی صاحب لَيُؤْمِنَنَّ میں لام بمعنی حال نہیں ہے۔ بلکہ یہ لام قسم کا ہے۔ اور استقبال خبری پر نون تاکید آنے کے لئے اس سے پہلے کوئی ایسا کلمہ ضروری ہے۔ جو قسم پر دلالت کرے۔ کیونکہ جو استقبال محض خبر ہو۔ اس پر نون تاکید بغیر اس کے نہیں آ سکتا کہ اس کے اول میں ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے اور جو لام حال کے لئے آتا ہے۔ اس کے ساتھ نون تاکید نہیں آ سکتا۔ کیونکہ نون تاکید استقبال کے لئے آتا ہے اور حال کی تاکید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس کی مفصل بحث شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی میں اس طرح ہے۔ کہ:-

واعلم ان الاصل فی نون التاکیدان تلحق بآخر فعل مستقبل فیہ معنی الطلب الامروا النھی والاستفھام والتمنی

شہادت القرآن

والعرض نحو اضربن زيدا اولا تضربن وهل تضربنه وليتك تضربن مثقلة و مخففة واختص بما فيه معنى الطلب لان وضعه للتاكيد والتاكيد انما يليق بما يطلب حتى يوجد و يحصل فيفتتم هو بوجدان المطلوب ولا يليق بالخبر المحض لانه قد وجد و حصل فلاينا سبه التاكيد واختص بالمستقبل لان الطلب انما يتعلق بمالم يحصل بعد ليحصل وهو المستقبل بخلاف الحال و الماضي لحصولهما والمستقبل الذى هو خبر محض لا تلحق نون التاكيد باخره الّا بعد ان يدخل على اوّل الفعل ما يدل على التاكيد كلام القسم وان لم يكن فيه معنى الطلب لان الغالب ان المتكلم يقسم على مطلوبه. انتهى.

''نونِ تاکید کے متعلق اصل قاعدہ یہ ہے کہ جس فعل مستقبل میں طلب کے معنی پائے جائیں اس کے آخر میں آئے۔ مثلاً امر۔ نہی واستفہام۔ تمنی اور عرض۔ اور یہ طلب کے معنی والے فعل سے اس لئے مختص ہے کہ اس کی وضع تاکید کے لئے ہے اور تاکید اس کے ساتھ مناسب ہوتی ہے۔ جس میں طلب پائی جائے۔ تاکہ وہ حاصل اور موجود ہو۔ اور محض خبر کے مناسب نہیں کیونکہ وہ حاصل وموجود ہوتی ہے۔ اور مستقبل کے ساتھ اس لئے مختص ہے کہ طلب اس کے متعلق ہوتی ہے۔ جو ابھی حاصل نہ ہو۔ اور یہ بات مستقبل میں پائی جاتی ہے۔ برخلاف حال اور ماضی کے کہ وہ دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ اور جو مستقبل محض خبر ہو اس کے آخر نون تاکید نہیں آتا۔ مگر اس صورت میں کہ فعل کے پہلے کوئی ایسا کلمہ ہو جو تاکید پر دلالت کرے۔ جیسے لام قسم اگرچہ اس میں طلب کے معنی نہ پائے جائیں کیونکہ غالباً متکلم ایسے امر پر قسم کھاتا ہے جو

مغلوب ہو۔"

فاضل امروہی صاحب اس عبارت پر غور کریں گے۔ تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ لَیُؤْمِنَنَّ میں لام قسم کا ہے نہ کہ بمعنی حال (دیکھو تفسیر بیضاوی وغیرہ) پس آپ کا اسے حال اور استقبال دونوں کے لئے سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔

پس ہم تشریح اور بسط کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ نون تاکید (ثقیلہ یا خفیفہ) مضارع کو خاص استقبال کے لئے کر دیتا ہے اور نیز یہ کہ لَیُؤْمِنَنَّ میں لام قسم کا ہے۔ جس کا ہونا استقبال خبری پر نون تاکید داخل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ پس آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کا لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ نہیں ہو گا اہل کتاب میں سے کوئی مگر البتہ ایمان لائے گا ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہلے مرنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔" اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ سب اہل کتاب اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔ پس چونکہ ابھی تک اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا اتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے بارے میں نہیں پایا گیا۔ اس لئے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت اہل کتاب کے ایمانی اتفاق کے بعد ہوئی ہے۔ اور جب اب تک وہ ایمان میں متفق نہیں ہوئے۔ تو آپ کی موت بھی واقع نہیں ہوئی۔

اس آیت کے جو معنی ہم نے بیان کئے ہیں۔ محاورہ زبان عرب اور قواعد نحو اور محاورہ کتاب و سنت کی رو سے یہی ایک صحیح ہیں اور اس کے سوائے جس قدر احتمالات ہیں۔ وہ سب غلط اور باطل ہیں کیونکہ کسی معنی کی بنا پر لَیُؤْمِنَنَّ کا لفظ خاص استقبال کے لئے باقی نہیں رہتا۔

اگر جناب مرزا صاحب یا فاضل امروہی صاحب ایک آیت یا ایک حدیث یا کوئی کلام عرب عرباء کا ایسا پیش کریں۔ جس میں نون تاکید حال یا ماضی کے لئے بھی

طور پر آیا ہو۔ یا علم نحو کی کسی معتبر کتاب کی کوئی عبارت جس میں امر مذکور کی تصریح ہو۔ تو میں اس مقدمہ نون تاکید کو جس کی رو سے اوپر ترجمہ کیا گیا ہے غیر صحیح تسلیم کرلوں گا۔

واضح ہو کہ اس آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ میں مَوْتِهٖ کی ضمیر کی بابت دو احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ جیسا کہ اوپر مفصل گذر چکا۔ دوم یہ کہ کتابی کی طرف پھرتی ہے۔ پھر اس کے معنی اس طرح ہوں گے۔ ''نہیں کوئی اہل کتاب میں سے مگر البتہ ایمان لاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے مرنے سے پیشتر۔'' یعنی جان کندن کے وقت۔ اس تقدیر پر لَيُؤْمِنَنَّ کا خالص استقبال کے لئے نہ رہنا صاف ظاہر ہے کیونکہ اہل کتاب اس آیت کے نزول سے پہلے بھی مرتے تھے۔ اور اس کے نزول کے وقت بھی۔ پس یہ کتابی کی طرف ضمیر کو پھیرنا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ مفسرین کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ یہ ضمیر کتابی کی طرف پھرتی ہے۔ اور نیز یہ ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی احتمال کے ذکر سے اس احتمال کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ دوم یہ کہ جب ثابت ہو چکا کہ کتابی کی طرف ضمیر پھرنے کی صورت میں لَيُؤْمِنَنَّ خالص استقبال کے لئے نہیں رہتا۔ اور یہ امر قواعد نحویہ اور محاورہ زبان عرب کے بالکل خلاف ہے تو اب اس قول کو ضعیف ماننے میں کیا تامل ہے۔ سوم یہ کہ جن لوگوں نے اس ضمیر کو کتابی کی طرف مانا ہے۔ انہوں نے اس کے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھیرنے سے انکار نہیں کیا۔ اور نہ حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام سے انکار کیا ہے بلکہ پھر بھی وہ اسی آیت سے حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں (دیکھو شروح صحیح بخاری فتح الباری وعمدۃ القاری وغیرہما)

پس اس سے مرزا صاحب کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ باقی رہی روایت حضرت ابن عباسؓ سو وہ ضعیف ہے۔ اور بروایت صحیح ان سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ ضمیر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس ضمیر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرنے کے ذکر کے بعد لکھا ہے:۔

وبهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير عن طريق سعيد بن جبير عنه باسناد صحيح ومن طريق ابى رجاء عن الحسن قال قبل موت عيسى والله انه الآن لحى ولكن اذا نزل امنوا به اجمعون و نقله عن اكثر اهل العلم ورجحه ابن جرير وغيره. (فتح الباری کتاب بدء الخلق باب نزول عیسیٰ)

کہ "حضرت ابن عباسؓ نے اسی پر جزم کیا ہے جیسا کہ علامہ ابن جریرؒ نے سعید بن جبیر کے طریق سے ان سے روایت کیا ہے۔ اور نیز ابو رجاء کے طریق سے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہا عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے۔ خدا کی قسم اب تک وہ زندہ ہیں لیکن جس وقت نازل ہوں گے۔ اس وقت سب اہل کتاب آپ پر ایمان لے آئیں گے اور اس بات کو اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے اور اسی کو ابن جریر وغیرہ مفسرین نے ترجیح دی ہے۔ انتہی۔

صحیح بخاری کی دیگر شروح مثلاً عمدۃ القاری اور ارشاد الساری وغیرہما میں بھی یہی لکھا ہے اور اسی امر کو ترجیح دی ہے۔ کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ چنانچہ شرح قسطلانی میں ہے کہ:۔

اى و ان مّن اهل الكتاب احد الّا لَيُؤْمِنَنّ بعيسى قبل موت عيسى وهم اهل الكتب الّذين يكونون فى زمانه فتكون الملة واحدة وهى ملة الاسلام و بهذا جزم ابن عباس فيما رواه ابن جرير من طريق سعيد بن جبير عنه باسناد صحيح.

(ارشاد الساری شرح صحیح بخاری)

"کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہوگا مگر البتہ ایمان لے آئے گا ساتھ عیسیٰ

علیہ السلام کے عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اور یہ وہ اہل کتاب ہوں گے جو آپ کے زمانِ نزول میں موجود ہوں گے۔ پس صرف ایک ہی مذہب یعنی مذہب اسلام باقی رہ جائے گا۔ اور اس پر ابن عباسؓ نے جزم کیا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سعید بن جبیر کے طریق سے ان سے باسناد صحیح روایت کیا ہے۔"

محقق مفسرین وشارحین حدیث ہر زمانے میں ابن عباسؓ کی اس روایت کو یعنی کتابی کی طرف ضمیر کے پھرنے والی روایت کو ضعیف کہتے چلے آئے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے اسی امر کو صحیح وثابت قرار دیتے چلے آئے ہیں کہ اس ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور بس۔

دیگر یہ کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اس آیت کی تفسیر کی گئی ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ جیسا کہ صفحہ ۱۴۲ میں اس کا مفصل بیان گذر چکا ہے۔ پس جب حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کو نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حدیث کی تصدیق کے لئے سب صحابہؓ کے سامنے پڑھتے ہیں۔ اور ان کو بآواز بلند پکار کر کہتے ہیں۔ فَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ اور کوئی صحابی ان کے اس استدلال کا انکار نہیں کرتا۔ اور نہ ان کے خلاف قائم ہو کر اس ضمیر کو کتابی کی طرف پھیرنے کے لئے کہتا ہے' تو اب ثابت ہو گیا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اس ضمیر کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرنا بلانکیر مانا گیا ہے۔ اور اس پر ان کا اجماع واتفاق ہے کیا مرزا صاحب یا مولوی محمد احسن صاحب کہیں سے بسند صحیح ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی صحابی نے حضرت ابو ہریرہؓ کے اس استدلال کی تردید یا ان سے خلاف کیا؟ ہرگز نہیں' اور کبھی نہیں۔

اس آیت کے معنی جو ہم نے مضبوط دلائل سے ثابت کر دکھائے ہیں مرزا صاحب نے اپنے ازالہ میں ان کے متعلق چار اعتراض کئے ہیں۔ ان سب کے جواب کے لئے نون ثقیلہ کا قاعدہ جو جمیع ائمہ علم نحو کا اتفاقی واجماعی ہے اور اوپر

بیان ہو چکا ہے۔ کافی ہے لہٰذا تطویل کی ضرورت نہیں۔ اگر مرزا صاحب کے لئے اتنی تحریر کافی نہ ہوئی اور انہوں نے اس کتاب کا جواب لکھا تو ان شاء اللہ جواب الجواب میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا منہ بالکل بند کر دیا جائے گا۔

بیانِ مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ آیت وَ اِن مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول کا واقع ہونا مذکور نہیں بلکہ برخلاف اس کے آپ کے زندہ ہونے کا صاف ثبوت ہے۔ اب اس لطیف نکتہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ جس کی رو سے حضرت ابو ہریرہؓ نے علاوہ قَبْلَ مَوْتِهٖ کی ضمیر کے اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث کی تصدیق کے لئے سب صحابہ کے سامنے پیش کیا۔ اور ان میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کے اخیر میں فرمایا کہ قیامت کو جب حضرت عیسیٰ کو سوال ہوگا کہ کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدائے واحد کے سوا معبود بنا لو؟ تو عیسیٰ علیہ السلام اپنی برأت کے لئے عرض کریں گے کہ یا الٰہی میں نے تو ان کو وہی کچھ کہا تھا۔ جو تو نے مجھے حکم کیا۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ. (مائدہ پ ۷۔۵:۱۱۷)

''اور میں تو ان پر تب تک ہی شاہد رہا۔ جب تک میں ان کے بیچ رہا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ شاہد کا مشہود علیہم کی جماعت میں ہونا ضروری ہے۔

اب اس آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ میں دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان اہلِ کتاب کی نسبت جو عیسیٰ علیہ السلام کے زمانِ نزول میں ان پر ایمان لائیں گے۔ فرماتا ہے کہ:۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا. (نساء پ ۶)(۴:۱۵۹)

''عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر شاہد ہوں گے پس جب عیسیٰ

علیہ السلام اس اخیر زمانے کے اہلِ کتاب پر شہادت دیں گے۔"

تو پہلی آیت کو زیرِ نظر رکھ کر ثابت ہوا کہ آپ اخیر زمانہ کے لوگوں میں نزول فرما ہوں گے۔ تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى حُسْنِ تَوْفِيْقِهٖ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس شہادت سے مرزا صاحب کا اعتراض بھی دور ہو گیا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمانِ اخیر میں نازل ہوں گے تو اہلِ کتاب کے عقائد سے خبردار ہو جائیں گے۔ پھر جنابِ باری میں کیوں نہ کہہ دیں گے کہ الٰہی جب میں پھر دنیا میں گیا تھا۔ تو ان کو ایسا ایسا سمجھا دیا تھا۔"

ناظرین! آپ تھوڑا سا غور کریں گے۔ تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا میں اسی شہادت کی خبر ہے پس مرزا صاحب کا اعتراض بالکل دور ہو گیا۔

پانچویں آیت: مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ (مائدہ پ ۵)(۵:۷۵)

مرزا صاحب اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:- مسیح صرف ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے نبی فوت ہو چکے ہیں اور ماں اس کی صدیقہ ہے جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔" اس کے آگے پھر لکھتے ہیں:-

> "یہ آیت بھی صریح نص حضرت مسیح علیہ السلام کی موت پر ہے کیونکہ اس آیت میں بتصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم طعام نہیں کھاتے۔ ہاں کسی زمانہ میں کھایا کرتے تھے۔ جیسا کہ کانا کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ جو حال کو چھوڑ کر گزشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے۔ اب ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت مریم طعام کھانے سے اسی وجہ سے روکی گئی۔ کہ وہ فوت ہو گئی۔ اور چونکہ کانا کے لفظ میں جو تثنیہ کا صیغہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی حضرت مریم کے ساتھ شامل ہیں۔ اور دونوں ایک ہی حکم کے نیچے داخل ہیں۔ لہٰذا

حضرت مریم علیہ السلام کی موت کے ساتھ ان کی موت بھی ماننی پڑی۔
کیونکہ آیت موصوفہ بالا میں ہرگز یہ بیان نہیں کیا گیا کہ حضرت مریم
علیہ السلام تو بوجہ موت طعام کھانے سے روکے گئے۔ لیکن حضرت ابن
مریم علیہ السلام کسی اور وجہ سے۔''

پیشتر اس کے کہ ہم مرزا صاحب کے استدلال کو غلط ثابت کریں اور اس آیت کی صحیح تفسیر و مراد بتائیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی عبارت منقولہ میں سے علمی اغلاط اور مغالطے ظاہر کریں۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ مرزا صاحب اپنی مطلب برآری کے لئے قرآن شریف کے الفاظ اور سیاق و سباق آیت کا ہرگز لحاظ نہیں کرتے۔ اور نہ دیگر علوم کو جو قرآن شریف کی صحیح مراد کو سمجھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ زیر نظر رکھتے ہیں۔

جناب مرزا صاحب! كَانَا يَاكُلَانِ الطَّعَامَ کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے۔ ''جب وہ دونوں زندہ تھے تو طعام کھایا کرتے تھے۔'' حضرت! قرآن شریف سے ایسی دل لگی نہیں چاہیے۔ ''جب وہ دونوں زندہ تھے۔'' کس لفظ کے معنی ہیں؟ قرآن شریف کی آیت کا ترجمہ تو ذرا ہوش اور خدا کے خوف سے کیا کرو۔ تعجب ہے۔ کہ آپ اس آیت کو موت کے ثبوت کے لئے نص صریح اور تصریح کہتے ہیں۔ کیا علم اصول میں نص اور صریح کی یہی تعریف ہے۔ کہ اس میں مقصود کا ذکر تک نہ ہو۔ مرزا صاحب! یہ کیسا معاملہ ہے؟ کیا آپ علم اصول سے ناواقف ہیں یا عمداً لوگوں کو غلط بیانی سے ایسا کہہ دیتے ہیں؟ فاضل امروہی صاحب! آپ نے تو علم اصول پڑھا ہوا ہے برائے خدا آپ ہی بتلائیں کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے لئے نص صریح ہے۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ یعنی شہادت کو چھپاؤ نہیں اور جو کوئی شہادت کو چھپائے گا۔ پس ضرور ضرور اس کا دل گنہگار رہے۔''

مرزا صاحب! اگر یہ آیت موت پر نص صریح ہوتی تو کیا تیرہ سو برس تک امت

شہادت القرآن

کے علما اور امام اس سے بے خبر رہتے؟ اگر مفہوم کا نام نص صریح ہے تو پھر آپ مفہوم کس کو قرار دیں گے۔ اور جہاں پچ پچ تصریح ہوگی۔ اس کا نام کیا رکھیں گے؟

اب ہم اس آیت کا اصل مطلب بیان کرتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ مرزا صاحب قرآن شریف کے سمجھنے سے کوسوں دور ہیں۔ قرآن شریف منظوم اور مربوط کلام ہے۔ اس کا کلمہ کلمہ اور آیت آیت ایک دوسرے کے ساتھ عجیب طور سے وابستہ ہے لہٰذا ضرور ہے۔ کہ اس سے پہلے کی آیات پر نظر کریں۔ تا کہ ظاہر ہو کہ اس سے مقصود خداوندی کیا ہے۔ سو یہ مضمون یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ. (مائدہ پ۶۔۵:۷۳تا۷۵)

”بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے۔ انہوں نے یہ کفر کا کلمہ کہا اور معبود تو سوائے ایک معبود کے اور کوئی نہیں اور اگر یہ لوگ اس قول سے باز نہ آئے۔ تو ان میں سے کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔ کیا (یہ لوگ اصرار کرتے ہیں) پس اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں آتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ مسیح علیہ السلام ابن مریم علیہا السلام تو صرف رسول ہیں۔ ان سے پیشتر کئی رسول گذر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ ہے۔ وہ تو کھانا کھایا کرتے تھے (اے پیغمبر) دیکھو ہم ان کے لئے کیسی واضح طور پر آیتیں بیان کرتے ہیں پھر دیکھو یہ لوگ کدھر کو بھٹکے جاتے ہیں۔“

ناظرین! آپ کے ذہن نشین ہو گیا ہوگا۔ کہ ان آیات سے مقصود خداوندی

صرف اثبات توحید اور ابطال الوہیت حضرت مسیح ہے نہ کچھ اور۔ اثبات توحید اور تردید تثلیث کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی ''الٰہ تو صرف ایک ہی ہے۔'' کیونکہ الٰہ اس کو کہتے ہیں۔ جسے غایت کمال حاصل ہو اور ظاہر ہے۔ کہ غایت درجے کا کمال صرف ایک ہی ذات میں ہو سکتا ہے۔ متعدد میں نہیں ہو سکتا۔ پس توحید ثابت ہوگئی اور تثلیث باطل اور حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے ابطال میں فرمایا مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ یعنی مسیح ابن مریم علیہ السلام تو صرف رسول ہے (خدا نہیں ہے) اس سے پیشتر کئی رسول گذر چکے ہیں۔ اور اس کی ماں صدیقہ تھی۔ وہ تو دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علاوہ اس بات کے کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک عورت سے پیدا ہوئے ہیں اس بات سے ان کی الوہیت کا رد کیا کہ وہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ بدن کی پرورش ہوتی رہے۔ تاکہ کچھ مدت تک بقا حاصل ہو پس جب مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ اپنے بقا میں کھانے کے محتاج تھے۔ تو یہ پھر ان کو معبود ماننا بالکل باطل ہے۔ کیونکہ خدا تو کسی چیز کا محتاج نہیں۔ اور نہ معبود برحق کے لئے کسی چیز کا محتاج ہونا جائز ہے۔ کیونکہ پھر یہ نہیں کہہ سکتے کہ غایت کمال حاصل ہے۔ پس مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ الٰہ نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ صدیقہ کے متعلق باوجود ان کے بہت سی اشیا کے محتاج ہونے کے صرف ایک امر احتیاج طعام کا ذکر کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف احتیاج ثابت کرنے کا ہے۔ نہ حاجتوں کے گننے کا۔ اثبات مدعا کے لئے بطور مثال صرف ایک امر کا بیان کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا سب کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ناظرین! اس بیان سے آپ یہ بھی سمجھ جائیں گے کہ اس ذکر احتیاج کو زندگی یا موت سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس کا ذکر خواہ محتاج کی زندگی میں کیا جائے۔ خواہ اس کی موت کے بعد۔ مقصود ہر دو حالت

میں یکساں حاصل ہے۔ پس مرزا صاحب کا اس آیت کو عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے لئے نص صریح کہنا عجیب قسم کی بے سمجھی ہے۔

اس آیت میں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر بھی اس لئے کیا کہ عیسائیوں کے بعض فرقوں کے نزدیک حضرت مریم علیہا السلام بھی خدائی کے رتبے تک پائی جاتی ہیں' جیسا کہ اس سورت کے اخیر میں وارد ہے أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَ أُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ یعنی "اے عیسیٰ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوائے مجھے اور میری ماں کو معبود جانو؟" (مائدہ پ ۷۔ ۵:۱۱۶)

پس اس مقام پر حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کی تردید کا بھی ساتھ ہی ذکر کیا تاکہ تثلیث کا اچھی طرح ابطال ہو جائے۔ اور توحید ثابت ہو جائے۔ کیونکہ اوپر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ جن لوگوں نے خدائے پاک کو تینوں میں سے تیسرا خدا مانا ہے۔ وہ کفر پر ہیں۔ اور اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت کی تردید کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض نصاریٰ کے نزدیک تثلیث کے ارکان یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام۔ اور جب ثابت ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام بوجہ محتاج ہونے کے الٰہ نہیں ہو سکتے۔ تو بس صرف ایک اللہ ہی باقی رہا جو سچا معبود ہے اور خدائی کے لائق ہے۔ کیا ہی خوب کہا گیا ہے

خدا یا جہاں پادشاہی تراست
زما خدمت آید خدائی تراست

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مرتبۂ رسالت بیان کیا اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے مرتبہ صدیقیت کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ کو حضرت عیسیٰ اور مریم علیہا السلام کی نسبت الوہیت کا خیال و وہم ان کے معجزات و کرامات پر نظر کرنے سے ہوا ہے سو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید اس طرح کی۔ کہ اظہار معجزات و کرامات سے انسان مرتبۂ رسالت سے بڑھ نہیں سکتا۔

شہادت القرآن

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو اپنے معجزات کی رو سے منجملہ دیگر رسولوں کے ایک رسول ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام بوجہ کرامات صدیقہ ہیں۔ خدا کس طرح بن گئے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ فرمایا۔ یعنی اس سے پیشتر کئی رسول گذر چکے۔" اس ذکر سے یہی مقصود ہے کہ جس طرح دیگر پیغمبروں کو خاص خاص معجزات عطا کئے گئے۔ اور وہ ان کے سبب سے خدا نہیں بن گئے۔ بلکہ رسول ہی رہے۔ اسی طرح مسیح علیہ السلام بھی بوجہ ظہور معجزات خدا نہیں بن سکتے۔ بلکہ صرف رسول ہی ہو سکتے ہیں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کئے گئے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں دیئے گئے۔ مثلاً سونٹے کا سانپ بن جانا اور ید بیضا وغیرہ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا باذن الٰہی سونٹے کا سانپ بنا دینا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باذن الٰہی مردے زندہ کر دینے سے زیادہ عجیب ہے ان دلائل کے ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّى يُؤْفَكُونَ یعنے "(اے پیغمبر ﷺ!) دیکھو ہم کس طرح صاف صاف توحید کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ لوگ راہ راست سے کدھر بھٹکے جاتے ہیں اور باطل پر ضد اور اصرار کرتے ہیں اور حق کو قبول نہیں کرتے۔" (پ ۶ مائدہ۔۵:۷۵)

پس ناظرین اصل مقصود اور صحیح مراد اس آیت کی یہ ہے۔ جو بیان کی گئی ہے۔ نہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے اور نہ کچھ اور مذکور ہے۔ مفسرین علیہم الرحمۃ نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ جو ہم نے کی ہے۔ باقی رہا مرزا صاحب کا یہ استدلال کہ "کانا ماضی کا صیغہ ہے اور نیز تثنیہ کا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ دونوں زمانِ گذشتہ میں کھانا کھایا کرتے تھے۔ اور اب نہیں کھاتے۔ اور جس طرح بوجہ موت کے حضرت مریمؑ کھانے سے روکی گئی ہیں۔ اسی طرح موت ہی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی روکے گئے ہیں۔" سو یہ استدلال نہایت ہی ضعیف اور مضحکۂ اطفال ہے۔ علما کے نزدیک مرزا صاحب ایسے ہی استدلالات کی وجہ سے ہلکے شمار کئے گئے ہیں۔ اوّل اس لئے کہ کسی امر کے کسی

زمانے میں مذکور ہونے سے دوسرے زمانے میں اس کی نفی لازم نہیں آتی۔ بلکہ قاعدہ یہی ہے کہ جس امر کو جس زمان میں ثابت کیا گیا ہے۔ یا اس کی نفی کی گئی ہے۔ اسے اس زمان کے متعلق ویسا ہی جانیں۔ اور باقی زمانوں کے لئے اس کی نسبت دلائل خارجی پر نظر کریں۔ ان کی رو سے جیسا ثابت ہو ویسا اعتقاد رکھیں۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کھانے کی نسبت زمانِ ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ لوگ اب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد کھانے کا محتاج نہیں جانتے۔ لیکن یہ مانتے ہیں کہ زمین پر ہونے کے ایام میں کھاتے تھے۔ پس اگر زمانِ حال کو بھی ساتھ شامل کیا جاتا تو ان پر حجت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا زمانِ حال کو ترک کر کے زمانِ ماضی کا ذکر کیا۔ اور اس زمانِ ماضی میں حضرت مریم علیہا السلام کو بھی اس لئے ذکر کیا کہ وہ بھی اس کھانے کی احتیاج میں ان کی شریک تھی۔ پس ایک ہی لفظ اور ایک ہی امر سے دونوں کی الوہیت کے وہم کو دور کر دیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانِ حال میں کھانا۔ سو اس سے اس آیت میں بحث ہی نہیں اور نہ اس کے ذکر کی ضرورت ہے۔ باقی رہا مرزا صاحب کا یہ لکھنا کہ جس طرح یعنی موت سے حضرت مریم علیہا السلام کھانے سے روکی گئی ہیں۔ اسی طرح یعنی موت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی روکے گئے ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی مرزا صاحب کی علو نظر کی وجہ سے ہے۔ مرزا صاحب! آیت میں تو کَانَا یَاْکُلَانِ وارد ہوا ہے۔ اور آپ ان کے نہ کھا سکنے کی کیفیت کو ایک نہج پر لانے کا استدلال کرتے ہیں عقل تو یہ کہتی ہے کہ کَانَا یَاْکُلَانِ جس میں ان دونوں کی مشارکت وصفِ کھانا میں صاف مذکور ہے۔ اس میں بھی ایک کیفیت پر ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ تثنیہ کے صیغے سے صرف اتنی مراد ہوتی ہے کہ اس حکم میں فاعل کے ساتھ ایک اور بھی شریک ہے اور اس حکم میں ان دونوں کی کیفیت اور حیثیت خارجی دلائل کے ثبوت پر موقوف ہوتی ہے۔ اس کی نظائر قرآن وحدیث اور ہر زبان کے روز مرہ میں بکثرت ہیں۔ مثلاً

جب ہم کہتے ہیں کہ کل زید اور بکر میرے پاس دونوں آئے تھے۔ لیکن آج نہیں آئے تو کیا اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جو وجہ زید کے آج نہ آنے کی ہے وہی بکر کے نہ آنے کی بھی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا استدلال مرزا صاحب کی نازک خیالی کہو تو اور علوم رسمیہ سے ناواقفی کہو تو بہرصورت من گھڑت ہے۔ عقل سلیم اور قواعد مقررہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ اول تو ضرور نہیں کہ ہم تسلیم کر لیں کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کھانا نہیں کھاتے۔ کیونکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو جنت سے کھانا پہنچتا ہے اور اگر مان بھی لیں' کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اب کھانا نہیں کھاتے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب بوجہ آسمانی رہائش کے اور صحبت ملائکہ کے ان کا مایہ حیات ذکر و عبادت الٰہی ہے نہ طعام اہل دنیا۔ پس حضرت مریم علیہا السلام کا کھانے سے باز رہنا دوسرے سبب سے ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کھانے سے باز رہنا دوسرے سبب سے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کھانے سے باز رہنے سے آپ کی موت کا نتیجہ ضروری نہیں۔ کیونکہ کھانے سے باز رہنے کی صورت اور وجہ صرف موت ہی نہیں۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام اور اکابر اولیائے کرام کے لئے ذکر و عبادت الٰہی بھی طعام کا فائدہ دے کر ان کے لئے مایہ حیات بن جاتی ہے۔ جیسے نبی ﷺ وصال کے روزوں میں کچھ نہ کھاتے تھے۔ اور پھر توانا بھی رہتے تھے۔ چنانچہ اسی کی نسبت فرمایا۔ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ فَھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِیْ یعنی ''میں رات کو اپنے رب کے پاس ہوتا ہوں وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔'' اس بیان سے مرزا صاحب کا وہ وہم بھی دور ہو گیا۔ جو ان کو آیت وَمَا جَعَلْنٰھُمْ جَسَدًا لَّا یَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ میں پڑا ہے۔ تَمَّ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ۔

قسم اول میں سے چھٹی آیت یہ ہے۔ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم پ ۱۶) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ مجھے خدا نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم کیا ہے۔ جب تک میں زندہ رہوں۔'' (۳۱:۱۹) مرزا صاحب کو اس آیت کے متعلق دو وہم ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کو زندگی بھر تک نماز اور زکوۃ کا حکم ہو رہا ہے۔ اور جب وہ آسمان پر زندہ ہیں تو اس حکم کی تعمیل کس طرح کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو انجیلی طریق پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ اور اگر وہ آخری زمانہ میں نازل ہو کر اس امت میں داخل ہوں گے۔ تو آپ کو مسلمانوں کے مطابق نماز پڑھنی پڑے گی۔ اور نتیجہ ان ہر دو وہموں سے یہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ پھر ہر دو اعتراض مذکور میں سے کوئی بھی نہیں عائد ہوتا۔

ہم ذیل میں ان دونوں وہموں کو دور کر کے اس آیت کی صحیح تفسیر بیان کرتے ہیں' جس سے ناظرین کو علاوہ مرزا صاحب کے استدلال کے ضعیف بلکہ غلط ہونے کے اس امر کا بھی علم ہو جائے گا کہ مرزا صاحب اسرار شریعت سے ناواقف تھے۔ ورنہ ان کو ایسے وہم پیش نہ آتے۔

پہلے وہم کا ازالہ کئی طریق پر ہے۔ اول یہ کہ ان احکام شرعیہ کے مکلف وہ لوگ ہیں۔ جو زمین پر آباد ہیں' نہ وہ جو آسمان پر ہیں۔ کیا فرشتے بھی ان ہی احکام کے اسی طرح مکلف ہیں۔ جس طرح ہم ہیں؟ دوم یہ کہ آسمان پر عبادت کا ہو سکنا کیوں بعید نظر آتا ہے۔ کیا آسمان جائے عبادت نہیں؟ اور شب و روز فرشتے تسبیح و ذکر الٰہی میں مشغول نہیں رہتے؟ اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام بھی ان فرشتوں کی جماعت میں عبادت کریں تو کیا تعجب ہے؟ سوم یہ کہ اس آیت میں زکوۃ سے مراد صدقۂ مفروضہ نہیں بلکہ طہارت و صلاحیت مراد ہے جیسے کہ اس سے پیشتر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ذکر میں فرمایا وَ حَنَانًا مِنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً یعنی ہم نے یحییٰ (علیہ السلام) کو اپنے پاس سے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی۔" اس جگہ تو قطعاً زکوۃ سے صدقۂ مفروضہ مراد نہیں ہے۔ اور نیز چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت اس سے پیشتر بشارت دی گئی تھی۔ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو کہا کہ میں تیرے پاس اس لئے آیا ہوں تاکہ تجھے ایک لڑکا عطا ہونے کی بشارت سنا کر اس بخشش کے لئے ایک نوع کا سبب بن

سکون' اس لئے اگر اس آیت وَ اَوْصَانِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا کے معنی یہ کیے جائیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حکم کیا ہے' کہ جب تک زندہ رہوں نماز ادا کرتا رہوں اور پاکیزہ رہوں تو بالکل لغت اور قرآن کے مطابق ہوں گے بلکہ اس صورت میں تو قرآن شریف ہی سے اس کا ثبوت ہے۔ پھر جائے انکار ہی کیا ہے؟ اگر کہا جائے کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے۔ اس جگہ زکوٰۃ سے مراد یہی صدقۂ مفروضہ ہوتا ہے نہ کہ لغوی معنی یعنی پاکیزگی۔ تو اس کا جواب کئی طرح سے ہے اول یہ کہ یہ استدلال استقرائی ہے۔ اور استقراء ظنی دلیل ہوتی ہے۔ یقینی نہیں ہوتی۔ پس اس سے اتنا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بیشک قرآن شریف میں اکثر جگہ ایسا ہی وارد ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس جگہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آئے اس جگہ خواہ مخواہ صدقۂ مفروضہ ہی مراد لیا جائے۔ کیونکہ لغت اور عقل اس کی شہادت نہیں دیتے۔ دوم یہ کہ معترض کے قاعدے کو تسلیم کر کے بھی اس جگہ زکوٰۃ سے طہارت مراد لینی خلاف محاورۂ قرآن شریف نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن شریف میں نماز کے ساتھ کسی جگہ ایسی عبادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اس کے سوائے ہے۔ جیسے صدقۂ مفروضہ اور کسی جگہ ایسی عبادت کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کی جزو اور اس کی جنس سے ہے۔ مثلاً آیت فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ میں اگر نحر سے مراد قربانی لی جائے۔ تو یہ پہلی صورت یعنی نماز کے علاوہ زکوٰۃ کی طرح مالی عبادت ہے۔ اور اگر اس سے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا یا رکوع کے وقت رفع یدین کرنا مراد لیا جائے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے تو یہ دوسری صورت یعنی نماز کے افعال میں سے ایک فعل ہے۔ پس جس طرح اس آیت میں نماز کے ساتھ اس کے بعض امروں کا ذکر مستحسن ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے حکم کے متعلق بھی نماز کے ساتھ طہارت وصلاحیت کا ذکر ممنوع نہیں کیونکہ طہارت و پاکیزگی نماز کے لئے ضروری اور شرط ہے۔

اور زکوٰۃ کے دوسرے معنی یعنی صلاحیت تو نماز کے ساتھ بہت ہی چسپاں

ہیں۔ کیونکہ صلاحیت اور صلوٰۃ میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔

اس آیت میں زکوٰۃ سے مراد جو طہارت وصلاحیت بتائی گئی ہے اس کو تاویل نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ زکوٰۃ کے لغوی معنیٰ ہی یہی ہیں۔ جیسا کہ

قال صاحب القاموس و الزکوٰۃُ صفوۃ الشیء وما أخرجتَهٗ من مالک لتطهره به وقال صاحب المصباح' زکا الرجل یزکوا اذا صلح وقال اللّٰه صَدَقَةً تُطَهِّرُ هُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بها فضم التزکیة بالتطهیر وقال صاحب الصراح زکوٰۃ م (تزکیۃ زکوٰۃ دادن و پاکیزہ کردن وستودن خود را و زکوٰۃ از کسے گرفتن قولہ تعالیٰ تزکیهم ای تطهرهم انتهی ما فی الصراح)

قاموس میں ہے کہ "زکوٰۃ کسی شے کے صاف کرنے اور اس شے کو کہتے ہیں جو پاک صاف کی گئی ہو۔ اور جو کچھ مال میں سے پاکیزگی کے لئے نکالا جائے۔ اور مصباح میں ہے کہ زکا الرجل کے معنی یہ ہیں کہ وہ مرد صلاحیت والا ہو گیا۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ اے پیغمبر! ان سے صدقہ لو جس سے تم ان کو پاک صاف کرو۔ اور صراح میں ہے کہ تزکیہ کے معنی زکوٰۃ دینا اور پاک کرنا اور اپنے آپ کو سراہنا اور کسی سے زکوٰۃ لینا ہیں جیسے کہ قرآن میں ہے تزکیهم یعنی ان کو پاک کرے۔"

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ لغت میں زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی اور صفائی کے ہیں۔ اور شریعت میں جو اس سے ایک مخصوص مالی عبادت مراد رکھی گئی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عبادت طہارت و پاکیزگی کا سبب بنتی ہے۔ یعنی بخل اور مال کی محبت سے دل پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ اور یہ امر مسلم ہے کہ لغوی اور منقولی مضمون میں مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ پس بیان بالا سے واضح ہو گیا کہ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ میں زکوٰۃ سے طہارت وصلاحیت مراد لینی لغت اور قرآن

شریف کے بالکل مطابق بلکہ موید بالقرآن ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جواب جو بہت معقول اور محکم ہے یہ ہے کہ اگر اس آیت زیر بحث میں زکوۃ سے صدقۂ مفروضہ ہی مراد لیں۔ تو بھی اس سے مرزا صاحب کی مراد کے موافق عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ علم اصول کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ امر کی تعمیل اس وقت واجب ہوتی ہے۔ جب اس کی شرائط پائی جائیں۔ اور شرطیں موجود نہ ہونے کی صورت میں واجب نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی مسلم ہے۔ کہ زکوۃ کے وجوب کے لئے نصاب یعنی اتنا اور ایسا مال جو وجوب کی حد تک پہنچ جائے شرط ہے پس جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر مالک نصاب نہیں تو ان پر زکوۃ بھی واجب نہیں۔ غور وفکر کو کام میں لایئے اور انصاف کیجئے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہونے کے ساتھ ہی باذن الٰہی اس امر کو ظاہر کر رہے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے زندگی تک نماز پڑھنے اور زکوۃ کا حکم کیا ہے۔ کیا آپ پر اس وقت بھی نماز اور زکوۃ فرض تھے؟ کیونکہ بچپن بھی تو زندگی میں داخل ہے۔ پس جس طرح آپ عیسیٰ علیہ السلام پر بچپن میں اس حکم کی تعمیل واجب نہیں جانتے۔ اسی طرح آسمان پر بھی اس حکم کی تعمیل ان پر واجب نہیں۔

باقی رہا مرزا صاحب کا یہ وہم کہ عیسیٰ علیہ السلام کو انجیلی طریق پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ اور اگر وہ آخری زمانے میں نازل ہوں گے۔ تو اس امت میں داخل ہوں گے۔ تو آپ کو مسلمانوں کے مطابق نماز پڑھنی ہوگی۔ سو اس کا ازالہ اس طرح ہے کہ مرزا صاحب جب تک انجیلی اور قرآنی نماز میں فرق ثابت نہ کر لیں' تب تک ان کو اس اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ قرآن شریف میں شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ کی نماز کے ارکان قیام۔ رکوع اور سجود بتائے گئے ہیں۔ اور یہی ارکان حضرت مریم علیہا السلام کی نماز کے بتائے گئے ہیں۔ جیسا کہ تیسرے پارے میں ذکر ہے کہ:۔

یَا مَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرَّاکِعِیْنَ.

(آل عمران پ ۳)

"اے مریم! اپنے پروردگار کے لئے قیام کر اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے۔" (۴۳:۳)

پس قرآن شریف سے تو پہلی امتوں کی نماز اور ہماری امت کی نماز میں کوئی فرق ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر مرزا صاحب اپنے الہام سے فرمادیں تو یہ دیگر امر ہے۔

دوم یہ کہ اگر بالفرض انجیلی نماز اور قرآنی نماز میں کسی نوع کا فرق بھی ہو تو کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ دین کی اصل توحید ہے اور عبادت اس کا ایک عملی نشان ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ ہر نبی کے زمانہ میں اس کی ایک ہی کیفیت پائی جائے۔ بلکہ جس کیفیت سے خدا تعالیٰ چاہے۔ اپنی عبادت کے لئے حکم دے۔ پس اگر عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد انجیلی کیفیتِ عبادت کو بوجہ اس کے منسوخ ہو جانے کے ترک کر دیں اور شریعتِ محمدی ﷺ کی کیفیت سے نماز ادا کریں تو اس میں کیا جائے اعتراض ہے؟ اس کی نسبت تو اللہ تعالیٰ نے شریعتِ موسوی اور شریعتِ عیسوی کے ذکر کے بعد فرمادیا ہے کہ:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيمَا اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ.

(مائدہ پ ۶۔ ۴۸:۵)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ طریقہ اور شریعت مقرر کی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک شریعت پر جمع کر دیتا مگر (اس میں ایک حکمت ہے) کہ تم کو ہر زمانہ میں اپنی فرمودہ شریعت کی تعمیل کی بابت آزمائے۔ پس تم نیکیوں میں بڑھو۔ (اور ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ دو)۔"

اس آیت سے دو مفید امر ثابت ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر اس مقام پر چھوڑنا گویا ناظرین کو موقع پر بڑے بھاری فائدے سے محروم کرنا ہے۔

اوّل نسخ کی حقیقت کہ کس امر میں نسخ واقع ہوتا ہے۔ دوم نسخ کی حکمت کہ کیوں کیا گیا۔

نسخ اصولِ دین میں نہیں ہوتا۔ اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہاں دستور العمل ضابطے اور قانون اور عبادت کی کیفیت میں ہر زمانے کے لوگوں کے لئے ان کی حالت کے مناسب اگر تبدیلی کی جائے۔ تو اس کی کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ عین حکمت ہے۔ نسخ میں ایک یہ بھی حکمت ہے کہ سچے مطیع دوسروں سے متمیز ہو جاتے ہیں۔ اور فرمانبرداری کے عادی حیلے بہانے کرنے والوں سے الگ ہو پڑتے ہیں۔ عبادات کی کیفیتوں میں فرق ہونے سے کوئی بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ جب خود عبادت کئی انواع پر ہے۔ تو اس کی انواع کی کیفیت کے فرق میں کیا اعتراض ہے۔ یہ ایک بہت باریک راز ہے۔ جس سے ہمارے مرزا صاحب بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ ایسا اعتراض نہ کرتے۔ پس اس آیت سے مرزا صاحب کی مراد کے موافق مسیح علیہ السلام کی وفات ثابت نہ ہو سکی۔ اور نہ ان کے نزول کے انکار کی کوئی وجہ نکل سکی۔ کیونکہ اس کی بنا صرف انہی دو وہموں پر تھی۔ جن کا ازالہ ہو چکا ہے۔

قسم اوّل:۔

قسم اوّل میں سے ساتویں آیت یہ ہے وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ ''میں جس دن پیدا ہوا ہوں اس دن بھی مجھ پر سلام ہے۔ اور جس دن مروں گا اس دن بھی۔ اور جس دن میں پھر زندہ کھڑا کیا جاؤں گا اس دن بھی۔'' (مریم پ ۱۶۔ ۱۹:۳۳)

اس آیت کے متعلق مرزا صاحب یوں ارقام فرماتے ہیں:۔

''اس آیت میں واقعات عظیمہ جو حضرت مسیح کے وجود کے متعلق تھے صرف تین بیان کئے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر رفع اور نزول واقعات صحیحہ

میں سے ہیں تو ان کا بیان بھی ضروری تھا۔ کیا نعوذ باللہ رفع اور نزول حضرت مسیح علیہ السلام کا مورد اور محل سلام الٰہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سو اس جگہ پر خدا تعالیٰ کا اس رفع اور نزول کو ترک کرنا جو مسیح ابن مریم کی نسبت مسلمانوں کے دلوں میں بسا ہوا ہے۔ صاف اس بات پر دلیل ہے کہ وہ خیال ہیچ اور خلاف واقعہ ہے۔ بلکہ وہ رفع یَوْمَ اَمُوْتُ میں داخل ہے اور نزول سراسر باطل ہے۔'' انتہٰی۔

مرزا صاحب کے اس وہم کا ازالہ دو طریق سے ہے۔ اوّل یہ کہ سب عقلا کے نزدیک مسلم ہے۔ اور معقولات میں مصرح ہے کہ کسی امر کے مذکور نہ ہونے سے اس کے وقوع کی نفی نہیں کر سکتے۔ اور قرآن و حدیث میں بلکہ ہر شخص کے روزمرہ میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں یہ آپ کی نئی منطق ہے کہ کسی امر کے مذکور نہ ہونے سے اس کے عدم وقوع کا نتیجہ نکالتے ہیں[1] ہاں اگر قرآن شریف میں رفع کا ذکر مطلقاً کہیں بھی نہ ہوتا۔ تو بھی آپ کہہ سکتے تھے۔ مگر جب دوسرے مقام پر اس کی تصریح موجود ہے۔ تو اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ تصریح کو چھوڑ کر خلاف عقل و نقل خود ساختہ قاعدے سے تمسک کرنا ھویٰ اور تفسیر بالرائے نہیں تو پھر تفسیر بالرائے اور خواہش کی تابعداری کسے کہیں گے؟ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام ہی کے ذکر میں فرمایا کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ یعنی ''وہ دونوں کھانے کے محتاج تھے۔'' تو صرف طعام کی احتیاج کے مذکور ہونے اور کسی اور احتیاج کے مذکور نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکل نہیں سکتا کہ وہ کسی اور چیز پانی وغیرہ کے محتاج نہ تھے۔

مرزا صاحب کے قاعدہ کے مطابق تو یہاں احتیاج کی جمیع جزئیات اور جملہ انواع شمار کر دینی چاہئیں۔ کیونکہ اس جگہ ان کے محتاج ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] حالانکہ براہین احمدیہ میں لکھ چکے ہیں کہ عدمِ علم سے عدمِ شی لازم نہیں آتا۔ (ص ۵۴۵) ابوالوفاء ۱۲

دوم:۔

دوم یہ کہ آیات اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ بآواز بلند مسیح علیہ السلام کے رفع جسمانی کو ثابت کر رہی ہیں اور آیت وَ اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتَابِ الآیہ ان کے نزول کی شہادت دے رہی ہے۔ تو اب دوسرے مقام پر اس کے مذکور نہ ہونے سے کیا حرج لازم آیا اور تصریحات کے مقابلہ میں مرزا صاحب کو اس عدم ذکر سے انکار کا حق کس طرح حاصل ہوا؟ ثبوتِ رفعِ جسمانی کے لئے دیکھو شہادت القرآن حصہ اوّل یعنی باب اوّل اور ثبوتِ نزول کے لئے دیکھو حصہ دوم صفحہ ۲۲۲ سے ۴۴ تک بذیل چوتھی آیت یعنی وَ اِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ الآیہ۔

سوم:۔

یہ کہ آیت زیر بحث سے پیشتر رفع کا ذکر موجود ہے۔ جو مرزا صاحب کو قرآن کریم میں تدبر نہ کرنے کی وجہ سے معلوم نہیں ہو سکا۔ چنانچہ فرمایا وَ جَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَمَا کُنْتُ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبارک کیا ہے۔ جہاں کہیں میں ہوں" اس آیت کی تفسیر حصہ اوّل کے ص ۴۳ ۲۰ میں گذر چکی ہے کہ لغت میں برکت کے معنی خیر کثیر یعنی بہت سی بھلائی اور علو یعنی بلندی ہے۔ جیسا کہ آیات ذیل سے بھی ثابت ہے لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (اعراف پ۹) یعنی "ہم ان پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے" (۹۶:۷)۔ اور فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ اور فَتَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ اور تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ میں برکت سے مراد علو اور بلندی ہے۔ برکت کے یہ دونوں معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں باحسن وجہ پائے جاتے ہیں۔ خیر کثیر تو مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے اور نزولِ مائدہ یعنی آسمان سے تیار کھانا اترنے کی دعا کے قبول ہونے سے ظاہر ہے اور وہ برکات و خیرات جو آپ کے نزول پر ہوں گی۔ مثلاً دشمنی اور بغض اور حسد کا دور ہو جانا اور مال کا کثرت سے ہو جانا۔ اور پھلوں اور

دودھ کا معمول سے زیادہ ہو جانا۔ جو صحیح مسلم میں وارد ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اور دوسرے معنی یعنی بلندی' آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ میں بالتصریح مذکور ہے۔ پس جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَمَا كُنْتُ میں ہر سہ اقوال قبلِ رفع اور زمانِ رفع اور بعد نزول مذکور ہیں۔ اسی لئے اَیْنَمَا كُنْتُ جس کے معنوں میں بہت وسعت ہے۔ فرمایا میں اس آیت سے رفع آسمانی ثابت کرنے میں اکیلا نہیں ہوں اور نہ یہ کوئی تفسیر نئی ہے۔ بلکہ پچھلی تفسیروں میں مفسرین برابر لکھتے چلے آئے ہیں۔ (دیکھو تفسیر کبیر و تفسیر سراج منیر)۔

اس بیان سے ثابت ہوا کہ اس آیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اور نزول سے انکار کرنا محض جہالت ہے۔ چہ جائیکہ اس کو دلائلِ وفات میں پیش کیا جائے۔

اس مقام پر عیسیٰ علیہ السلام کی بعض برکتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ مرزا صاحب بھی مدعیٔ عیسویت ہیں۔ اس لئے مناسب ہے۔ کہ آپ کے ظہور پر جو کچھ ''برکتیں'' ظاہر ہوئیں۔ ان کا بھی کچھ ذکر کیا جائے۔ تا کہ ایک سوچنے والے کے لئے دونوں میں مباینت بلکہ ضدیت کی نسبت[1] ظاہر ہو:۔

نمبر	عیسیٰ علیہ السلام کی برکتیں	نمبر	مرزا صاحب کی شامتیں
۱	دشمنی۔ حسد اور بغض کا دور ہو جانا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں مروی ہے۔ وَ لَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَ التَّبَاغُضُ وَ التَّحَاسُدُ. (صحیح مسلم و مشکوٰۃ باب نزول عیسیٰ).	۱	ہندوستان کے عام باشندوں خصوصاً مسلمانوں میں دشمنی' حسد اور بغض کی آگ لگ جانی اور ایسی عداوت کا پیدا ہو جانا جس سے ایک دوسرے سے جدائی اور قطع تعلق بلکہ قطع رحم تک نتائج نکل رہے ہیں۔

[1] یہ کتاب رمضان ۱۳۲۳ھ میں متحدہ ہندوستان کے وقت لکھی گئی۔ عبدالقیوم مہر۔

۲	مال کا کثرت سے ہو جانا۔ حتیٰ کہ زکوٰۃ کے قبول کرنے والے نہیں ملیں گے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) وَ يَفِيضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهُ اَحَدٌ. (مشکوٰۃ باب نزول عیسٰی)	۲	مسلمانوں کا سخت محتاجی اور فقر کی حالت میں ہونا۔ اگر ایک شخص خیرات کا دروازہ کھولے تو اس کثرت سے فقرا کا جمع ہو جانا کہ اسے دروازہ بند کرنا پڑے اور بعض کا افلاس کے مارے بے دینی کی طرف مائل ہو جانا۔
۳	دلوں میں آخرت کی تیاری کی فکر اور دنیا سے بے رغبتی کا پیدا ہو جانا۔ (صحیح مسلم) حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِّنَ الدُّنْيَا. (مشکوٰۃ)	۳	لالچ اور طمع نفسانی کا بڑھ جانا۔ حتیٰ کہ حلال و حرام میں تمیز نہ رہنا' رشوت ستانی اور خیانت اور غبن کا کثرت سے وقوع میں آنا۔ اور بعض کا لالچ کے مارے بے دینی اختیار کر لینا' عاقبت کو بھلا دینا اور دنیوی فائدوں کو پیش نظر رکھنا۔
۴	کثرت سے بارش کا ہونا اور دودھ اور پھلوں کا معمول سے زیادہ ہونا اور جوامر عام خلق اللہ کے حق میں مضر ہوں ان کا رک جانا۔ (" ")	۴	خشک سالی اور ہر جنس کی گرانی خصوصاً گھی دودھ کا کم ہو جانا۔ اور آئے دن نئی بیماریاں اور وبائیں اور طاعون اور زلزلے اور بہت سی مصیبتیں۔ دنیا میں عام طور پر بد امنی اور بے آرامی کا ہونا۔

قسم اوّل کی سب آیتوں کا بیان ہو چکا اب قسم دوم کی آیتیں ذکر کی جاتی ہیں:۔

قسم دوم:۔

قسم دوم میں وہ آیتیں ہیں۔ جو مرزا صاحب کے خیال میں عموماً دیگر انبیاء علیہم السلام کی وفات پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اس نظر سے کہ مسیح علیہ السلام بھی ایک نبی ہیں۔ لہٰذا وہ ان آیتوں کے حکم میں داخل ہیں۔ ایسی سب آیتوں کے جواب کے لئے تمہیدی طور پر علم اصول کے دو قاعدے بیان کرنے ضروری ہیں۔ جن سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ مرزا صاحب قواعدِ علم اصول سے کس قدر دور چلتے ہیں۔ اور اپنی مطلب برآری کے لئے اس علم کو کیسے بھلا دیتے ہیں۔

پہلا قاعدہ یہ ہے کہ ایک امر صراحت کے ساتھ منطوق عبارت سے ثابت ہو۔ تو اس کے خلاف کسی عبارت میں سے بطور اشارہ یا دلالت استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ مقابلے کے وقت منطوق کا اعتبار مفہوم پر مقدم ہوتا ہے۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ کوئی امر کسی خاص دلیل سے ثابت ہو تو اس کے خلاف عام دلیل سے تمسک کرنا جائز نہیں۔ یہ دونوں قاعدے نہایت معقول ہیں۔ اور علم اصول کی کتابوں میں ان کی تصریح موجود ہے۔ پس ان کے متعلق زیادہ تفصیل اور نقلِ عبارت کی ضرورت نہیں۔

قسم دوم میں سے پہلی آیت یہ ہے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ یعنی ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پیشتر کئی رسول ہو چکے ہیں۔ پس اگر یہ فوت ہو جائیں۔ یا مارے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر لوٹ کر (بے دین) ہو جاؤ گے؟''

(پ۴ آل عمران۔۳:۱۴۴)

اس آیت سے مرزا صاحب نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ جب محمد ﷺ سے پہلے رسول سب کے سب فوت ہو چکے ہیں تو بس مسیح علیہ السلام بھی

ان میں آ گئے۔

اس آیت کے جواب کے لئے چار امروں کی تحقیق ضروری ہے۔ اوّل تحقیق لفظ خلت کہ لغت میں اس کے کیا معنی ہیں۔ دوم مِنْ قَبْلِهٖ ترکیب کیا واقع ہوا ہے۔ سوم الرُّسُلُ کا الف لام کیسا ہے۔ چہارم اگر ان ہر سہ امور کو مرزا صاحب کی مراد کے موافق تسلیم کر لیں۔ تو کیا اس آیت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

تحقیق لفظ خلت:۔

خلت مشتق ہے۔ خلو سے اور موضوع مکان کی صفت کے لئے اور مراد اس سے جگہ خالی کرنا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے۔

(خلا) خلا المكان والشيء يخلوا خلوًا وخلآء واخلى اذا لم يكن فيه احد ولا شيء فيه وهو خال۔ اسی طرح قاموس اور صراح میں بھی ہے۔ اور قرآن شریف میں بھی نقلِ مکان کے لئے آیا ہے۔ جیسے وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ۔ یعنی جس وقت یہ منافق اپنے بڑے شیطانوں یعنی رئیسوں کے پاس جاتے ہیں"۔ اور اسی طرح اس آیت زیر بحث سے تھوڑا سا پیشتر ہے۔ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ (پ ۴ آل عمران) یعنی منافق لوگ جس وقت تم سے الگ ہوتے ہیں۔ تو تم پر غیظ و غضب کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں" (۱۱۹:۳) اور اسی طرح یہ آیت ہے۔ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ یعنی مشرک لوگ جب ایمان لے آئیں۔ اور احکام اسلامی کے پابند ہو جائیں۔ تو ان کا رستہ خالی کر دو"۔ یعنی ان سے تعرض نہ کرو۔

ان سب آیات میں ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جانا جسے انتقال مکانی کہتے ہیں۔ دوسرے معنی لفظ خلو کے جو زمانے کے متعلق ہوتے ہیں۔ گذرنا ہیں۔ جیسے آیت بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ یعنی جو کچھ تم نے ایام گذشتہ میں کیا اس کے عوض میں جنت کی ان نعمتوں میں رہو"۔ اور ہر ذی علم سمجھ سکتا ہے کہ گذرنا

زمانے کی صفت بالذات ہوا کرتی ہے۔ اور جن چیزوں پر زمانہ گذرتا ہے۔ یہ معنی یعنی گذرنا بعلاقۂ ظرفیت و مظروفیت ان چیزوں کی صفت بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بالذات نہیں بلکہ بالعرض۔ پس بہر تقدیر آیت زیر بحث کے معنی یہ ہوں گے کہ ''جگہ خالی کر گئے اور گذر چکے ہیں پیشتر اس کے کئی رسول'' اور یہ معنی زندوں اور مردوں ہر دو پر آ سکتے ہیں۔ کیونکہ جگہ خالی کرنے اور گذرنے کی کیفیت صرف موت ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ لفظ خلو مردوں کے حق میں انتقال بالموت کے معنوں میں معین ہو گا۔ اور زندوں کے حق میں جگہ تبدیل کرنے کے معنوں میں۔ جس طرح ہم کہا کرتے ہیں۔ کہ ''اس شہر میں ایسے حاکم کئی ہو گذرے ہیں'' پس جس طرح یہ جملہ خواہ وہ حاکم مر گیا ہو۔ خواہ وہاں سے تبدیل ہو کر دوسری جگہ چلا گیا ہو۔ ہر دو حال میں صحیح المعنی رہتا ہے۔ اسی طرح آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں بدلالت آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وغیرہ دوسرے معنی یعنی جگہ کے تبدیل کرنے میں معین ہو گا۔

خلو کے معنی مرنا اور معدوم ہونا نہیں۔ کیونکہ پھر آیات سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ اور آیت وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا میں تناقض واقع ہو گا۔ کیونکہ بموجب مذہب مرزا صاحب پہلی آیت کا مفاد یہ ہے۔ کہ سنت اللہ معدوم ہو چکی ہے اور دوسری آیت کا یہ کہ سنت الٰہی تبدیل بھی نہیں ہو سکتی۔ یعنی اسے ہمیشہ کے لئے اپنے حال پر بقا حاصل ہے۔ پس خلت سے موت اور عدم مراد سمجھنا بالکل باطل ہیں۔

امر دوم یعنی مِنْ قَبْلِهِ کو مرزا صاحب اور مولوی محمد احسن صاحب امروہی نے الرُّسُلُ کی صفت بنایا ہے۔ چنانچہ اس کے معنی یہ کرتے ہیں کہ ''جو پیغمبر محمد ﷺ سے پیشتر تھے وہ مر گئے۔'' یہ ان کی صریح غلطی ہے اور علم نحو سے ناآشنا ہونے یا دیدہ دانستہ لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی صاف شہادت ہے۔ کیونکہ آیت میں مِنْ قَبْلِهِ لفظ الرُّسُلُ پر مقدم ہے۔ اور مبتدی بھی جانتے ہیں کہ موصوف صفت سے پہلے

ہوتا ہے۔ پس مرکب من قبلہ لفظ الرُّسل کی صفت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ محل ظرف میں واقع ہے۔ اور متعلق ہے بہ فعل خلت کے کیونکہ ظرف کے لئے ضروری ہے کہ کسی فعل کے متعلق ہو۔ پس آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ ''اس سے پیشتر کئی رسول گذر چکے۔''

امر سوم۔ یعنی الرُّسل کے الف لام کی تحقیق اس طرح ہے کہ مرزا صاحب اور مولوی محمد احسن صاحب امروہوی اس الف لام کو استغراقی قرار دیتے ہیں۔ اور اس بنا پر اس طرح استدلال کرتے ہیں۔ کہ ''چونکہ آنحضرت ﷺ سے پیشتر کے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔'' فاضل امروہی اور مرزا صاحب کے اس قیاس کی بنا غلط مقدمات پر ہے۔ اور اس الف لام کو استغراقی قرار دینے میں انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ مِنْ قَبْلِهٖ فعل خلت کے متعلق ہے۔ اور الرُّسُلُ کی صفت نہیں ہے۔ پس یہی ترکیب اس الف لام کے استغراقی نہ ہونے کے لئے کافی حجت ہے کیونکہ اگر مِنْ قَبْلِهٖ کو خَلَتْ کے متعلق ظرف ٹھہرائیں۔ جو بالکل درست ہے' اور الرُّسُل کے الف لام کو استغراقی مانیں۔ جو بالکل غلط ہے۔ تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اندریں صورت پہلے قضیہ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ کے خلاف رسول اللہ ﷺ جماعت مرسلین سے خارج ہوں گے۔ کیونکہ پھر تو اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جتنے اشخاص صفت رسالت سے موصوف تھے۔ وہ محمد ﷺ سے پیشتر فوت ہو چکے ہیں۔ پس آپ معاذ اللہ رسول برحق ثابت نہ ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جس معنی سے قرآن شریف کی آیات میں تعارض واقع ہو خصوصاً کسی نبی برحق کی رسالت کا انکار لازم آتا ہو' وہ معنی بالکل باطل ہیں دیگر یہ کہ یہی الفاظ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں دربارۂ نفی الوہیت وارد ہوئے ہیں۔ پس اگر جہالت سے الف لام کو استغراقی مانا جائے۔ تو لابد تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نزول کے وقت فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ بالکل باطل ہے یا معاذ اللہ

انکار نبوت محمدیؐ و عیسوی لازم آئے گا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا۔ کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ کہ سب رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر فوت ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح علیہ السلام کی رفع کے کئی زمانے بعد پیدا ہوئے اور شرف نبوت سے ممتاز ہوئے اور اس آیت کے نزول کے وقت زندہ موجود تھے۔ کیونکہ یہ آیت آپ ﷺ ہی پر اتری۔ یہ ایک دقیق نکتہ ہے۔ اس کا ادراک کسی علم نحو کے مذاق سے خالی اردو خوان کا کام نہیں۔

تنبیہ:۔

اس تقریر کے جواب میں جلدی کر کے مِنْ قَبْلِهٖ کو الرُّسُلُ کی صفت نہ کہہ دینا چاہیے۔ کیونکہ اس کا ابطال ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔

دوسری وجہ:۔

جس سے الرُّسل کے الف لام کو استغراقی کہنا غلط ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اس آیت وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کا شان نزول یہ ہے کہ آں سرور ﷺ کی نسبت جنگِ احد میں غلط خبر اڑ گئی کہ شہید ہو گئے۔ اور بعض لوگوں نے نبوت اور موت میں منافات سمجھی اور ارتداد کا رستہ اختیار کرنے لگے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی اور ظاہر کر دیا۔ کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں۔ کیونکہ جس طرح بعض دیگر رسولوں کے حق میں ان کے مر جانے سے ان کی نبوت میں کوئی قدح واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر آنحضرت ﷺ بھی طبعی موت سے فوت ہو جائیں۔ یا میدان جنگ میں شہید ہو جائیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ آپ ﷺ نبی برحق نہیں۔ پس چونکہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ نبوت اور موت میں منافات نہیں ہے۔ اس لئے استغراق افرادی یعنی سب رسولوں کو فوت شدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں[1]

[1] معقولی طور پر اس کا بیان اس طرح ہے کہ مشککین کا قول سالبہ کلیہ ہے کہ کوئی نبی مر نہیں سکتا۔ اور خدا تعالیٰ کو اس کی تردید منظور ہے اور معلوم ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہے

صرف ایک رسول یا چند رسولوں کی موت کے ذکر سے مقصود حاصل ہو سکتا ہے پس الرُّسُلُ کا الف لام استغراق کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے پیشتر کئی رسول ہو چکے ہیں۔ اور الف لام جنسی ہے کیونکہ اسم پر الف لام داخل ہو کر ہمیشہ استغراق۔ افراد کا فائدہ نہیں دیتا۔ بلکہ تین معانی میں سے کسی معنی میں سے ہوتا ہے عہد استغراق اور تعریف جنس۔ جیسا کہ علم نحو کے مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں ہے الرُّسُلُ کا الف لام عہدی اس لئے نہیں کہ اس سے اوپر ان رسولوں کا ذکر نہیں ہے اور اس کے استغراقی نہ ہونے کے لئے مِنْ قَبْلِهٖ اور شانِ نزول کا مانع ہونا بیان ہو چکا ہے۔ پس بقاعدہ تردید و دوران جنسی ہوا اور یہی ہماری مراد ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''الف لام جمع کے صیغے پر جب بھی آتا ہے۔ تو مفید استغراق ہی ہوتا ہے۔'' جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کر دیا ہے کہ الف لام کے ہمیشہ استغراقی نہ ہونے کے لئے آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ کو غور سے پڑھنا چاہیے۔ کہ یہی لفظ الرُّسُل بصیغہ جمع با الف و لام موجود ہے اور یہاں استغراق افراد قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی۔ اور اس کے پیچھے اس کے آئین پر کئی رسول بھیجے۔ نہ یہ کہ سب رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے' کیونکہ یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے پہلے رسول نہیں ہیں۔ بلکہ کئی رسول آپ سے پہلے

له ہوتی ہے نہ کہ موجبہ کلیہ پس الف لام الرسل کا استغراق کے لئے نہ ہوا۔ بلکہ تعریف جنس کے لئے ہوا اور چونکہ الرسل کل ہے۔ اور اس پر کوئی کلمہ حاضر نہیں۔ اس لئے قد خلت من قبله الرسل قضیہ مہملہ ہوا۔ اور معلوم ہے کہ مہملہ قوت جزئیہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا آیت کے معنی ہوئے۔ تحقیق گزر چکے ہیں۔ پیشتر اس سے کئی رسول۔'' قادیانی خلافت سے پہلے جناب مولوی نور الدین صاحب نے بھی اس آیت کا ترجمہ اپنی کتاب فصل الخطاب میں یہی کیا ہے جو ہم نے کیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۳۳ حصہ اول) پس الف لام کے استغراقی نہ ہونے کے سبب سب رسول فوت شدہ ثابت نہ ہوئے بلکہ بعض رسول۔ لہٰذا یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کی دلیل نہ ہو گی۔ ۱۲ منہ

ہوئے اور کئی آپ کے بعد۔ پس ہر دو آیت میں اَلرُّسُلُ سے مراد کئی پیغمبر ہیں نہ کہ سارے۔ فافہم۔

اسی طرح قرآن شریف میں کئی مقام پر جمع کا لفظ الف لام کے ساتھ آیا ہے۔ اور وہاں استغراق افراد مراد نہیں بلکہ کثرت کے معنی ہیں جیسے اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ (حم سجدہ) اور وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ میں خلت اور من قبلهم اور المثلٰت صیغہ جمع با الف لام سب کچھ موجود ہے۔ اور مرزا صاحب اور فاضل امروہی صاحب کی تحقیق ان سب کے خلاف ہے [1]

اس آیہ کے متعلق مرزا صاحب نے ایک اور گل کھلایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

> ''اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ اگر نبی کے لئے ہمیشہ زندہ رہنا ضروری ہے تو کوئی ایسا نبی پہلے نبیوں میں سے پیش کرو۔ جو آج تک زندہ موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اگر مسیح ابن مریم زندہ ہے۔ تو پھر دلیل جو خدا تعالیٰ نے پیش کی صحیح نہیں ہوگی۔'' انتہیٰ۔

مرزا صاحب! یہ نئی منطق کہاں سے پڑھی؟ کیا الہام سے تو نہیں سیکھی؟ آپ ہر علم دینی و دنیوی میں تجدید کرتے ہیں۔ خواہ اسے جانیں یا نہ جانیں۔ ایسی منطق سے تو آپ نے معلم اول (ارسطو) اور معلم ثانی (ابونصر فارابی) اور بوعلی سینا کو بھی مات کر دیا۔

حضرت! واقعہ اور لوگوں کو زیر نظر رکھ کر آیت کی صحیح مراد یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں نبی ﷺ کی شہادت کی خبر سن کر بعض لوگوں نے نبوت اور موت میں منافات کا گمان کر کے ارتداد کی راہ اختیار کرنی چاہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان کے زعم کی تردید میں نازل کی۔ پس اس کا ماحصل یہ ہوا۔ کہ اگر رسالت اور موت میں منافات ہوتی تو کوئی رسول بھی نہ مرتا۔ کیونکہ جب مقصود یہ ہے کہ وصفِ

---

[1] کیونکہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ ۱۲ منہ

رسالت اور موت میں منافات کے گمان کو دور کیا جائے۔ تو خواہ ایک رسول فوت شدہ کو بطور نظیر پیش کریں۔ خواہ زیادہ کو بہر دو صورت مقصود حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ پس آپ کا یہ وہم کہ "اگر مسیح ابن مریم زندہ ہے تو پھر دلیل صحیح نہ ہوگی۔" باطل ہے۔ اس لئے کہ جب کئی رسول فوت ہو جائیں اور ایک زندہ رہے تو اس کا زندہ رہنا دوسرے کی زندگی کے لئے علتِ موجبہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ وصفِ رسالت اور موت میں منافات ہو سکنے کی وجہ بن سکتا ہے۔ بلکہ اس سے تو منافات کا ابطال صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر منافات ہوتی تو کوئی شخص بھی جو وصفِ رسالت سے موصوف ہو نہ مرتا۔ حالانکہ ایسے کئی شخص جو اس صفت سے موصوف ہیں مر چکے ہیں [1]

اس بیان سے یہ بھی واضح ہو کہ قضیہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کلیہ نہیں ہے۔ بلکہ مہملہ ہے۔ جو جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ پس امروہی[2] صاحب نے جو منطقی طور پر اس آیت سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات ثابت کرنی چاہی ہے۔ وہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شکل اوّل کے انتاج کے لئے کلیتِ کبریٰ شرط ہے

---

[1] کیونکہ منافات ہونے کی صورت میں سلبِ کلی ضروری ہے اور جب معلوم ہو چکا کہ بعض فوت ہو چکے ہیں۔ تو کلیت ٹوٹ گئی اور منافات کا دعویٰ باطل ہو گیا۔ اور سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہونے کے بھی معنی ہیں۔ فافہم ولا تکن من القاصرین۔ ۱۲ منہ

[2] (دیکھو رقیمہ الوداد نمبر سوم صفحہ ۳۰۔ جو رسالہ دافع البلاء مصنفہ مرزا صاحب مطبوعہ سیالکوٹ کے ساتھ شامل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ "ہاں بپاس خاطر طلبہ و مدرس صاحب کے قیاس منطقی ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ سو واضح خاطر عاطر ناظرین ہو کہ ہم نے نہایت بسط کے ساتھ شمس بازغہ میں شکل اول بدیہی الانتاج سے حضرت عیسٰیؑ کی وفات ثابت کر دی مگر یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف دو تین سطروں میں شکل اوّل کو لکھ دیتے ہیں۔ عیسٰی بن مریم کان نبیا من الناس الذین کانوا قبل نبینا و مات الناس الذین کانوا قبلہ کلھم حتی الانبیاء فعیسی ابن مریم ایضا مات مقدمہ صغریٰ تو اس کا مسلم فریقین ہے۔ اور مقدمہ آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبلھم الرسل سے بھی ثابت ہو چکا۔ انتہی۔

جیسا کہ کتب منطق میں مصرح ہے۔و شرط انتاجه ایجاب الصغرے و کلیة الکبری. پس جب شکل اوّل کی رو سے قیاس کے صحیح ہونے کی ایک شرط موجود نہ ہوئی۔تو قیاس صحیح نہ ہوا۔قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کے کلیہ نہ ہونے کی وجوہ اوپر مذکور ہو چکی ہے۔اَلرُّسُلُ میں الف لام استغراقی نہیں۔کیونکہ مِنْ قَبْلِهٖ جو خَلَتْ کے متعلق ہے۔اس کا انکار کرتا ہے۔نیز یہی آیت حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں وارد ہے۔قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ نیز آیت بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اس کی مخصص موجود ہے۔نیز شانِ نزول اور زاعمین کے زعم پر نظر رکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ قضیہ قَدْ خلت من قبله الرسل موجبہ جزئیہ ہے۔

پہلے تین امروں کی تحقیق بخوبی ہو چکی ہے۔جس سے صاف ثابت ہو گیا کہ آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قبلِهِ الرُّسل کے یہ معنی نہیں کہ جو پیغمبر رسول اللہ ﷺ سے پیشتر تھے۔وہ سب مر گئے ہیں۔بلکہ اس کے معنی جو لغت عرب اور قواعد نحو اور علم منطق کے لحاظ سے صحیح ہیں۔یہ ہیں کہ "تحقیق گذر چکے پیشتر اس کے کئی رسول۔"

اب امر چہارم کی تحقیق کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس کے معنی مرزا صاحب کی غلط تحقیق کے موافق ہیں۔تو بھی اس سے مرزا صاحب کی مراد یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہیں ہوتی۔کیونکہ پھر بھی یہ آیت وفات مسیح کے بارے میں عام رہے گی۔خاص نہ ہوگی۔لیکن آیات اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اور وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ جن کی تفسیر پیچھے گذر چکی ہے۔آپ کی رفع آسمانی اور نزولِ بار ثانی کے لئے خاص دلائل اور نصوص قطعیہ ہیں۔جن کے مقابلے میں مرزا صاحب کا استدلال جو اس آیت زیر بحث کے عموم سے کیا گیا ہے۔مفید مطلب نہیں۔ کیونکہ ہم اس آیت کے شروع میں دوسرے قاعدے میں بیان کر آئے ہیں۔کہ دلیل خاص کے مقابلے میں اس کے خلاف عام دلیل سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے۔مثلاً سورۂ دہر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ

(پ۲۹) یعنی ''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔'' (۲:۷۶) اور چونکہ آدم علیہ السلام بھی انسان ہیں۔ اس لئے بموجب امروہوی صاحب کی منطق کے آدم علیہ السلام کی پیدائش بھی مادۂ نطفہ سے ثابت ہوئی (جو بالکل باطل ہے) کیونکہ بروئے شکل اوّل اس کا قیاس اس طرح ہے ''آدم انسان ہے اور سب انسان نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں پس آدم بھی نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔''

اس وہم کا ازالہ اس طرح ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش دوسرے مقام پر دلیلِ خاص سے ثابت ہے کہ مادۂ مٹی سے ہوئی۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش نفخ روح القدس سے ہوئی۔ پس آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام۔ اور عیسیٰ علیہ السلام۔ جن کی پیدائش کی کیفیت خاص دلیل سے اور طرح پر ثابت ہے۔ اس آیت سورۂ دہر سے مستثنیٰ رکھے جائیں گے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے انسانوں پر اس آیت کا حکم لگایا جائے گا کہ وہ مادۂ منی سے پیدا ہوئے۔ اس بیان سے مرزا صاحب اور فاضل امروہی صاحب انکار نہیں کر سکتے۔ پس اسی طرح جب دوسرے مقام پر حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام خاص دلیل سے ثابت ہے تو عیسیٰ علیہ السلام اس آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ کے عموم سے باہر رہیں گے۔ پس آپ کی وفات ثابت نہ ہو سکی۔ اور مرزا صاحب کی مراد پوری نہ ہوئی۔

اس آیت کے متعلق مرزا صاحب اور مولوی محمد احسن صاحب ایک اور مغالطہ دیا کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات شریف پر یہی آیت پڑھ کر آپ کی وفات ثابت کی اور لوگوں کے دلوں سے شبہ دور کیا جو یہ تھا۔ کہ آنحضرت ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ اس وہم کے ازالہ کے لئے بیانِ بالا کافی ہے۔ مگر نیا سوال ہونے اور عام لوگوں کی تسلی کے لئے ہم اس کو کچھ تفصیل سے لکھتے ہیں۔ کہ جو وہم بعض لوگوں کو جنگ احد کے دن پڑا تھا۔ کہ رسول کو مرنا نہیں چاہئے۔ اسی طرح کا وہم بعض کو آنحضرت ﷺ کی وفات پر ہوا۔ کہ آپ ﷺ وفات نہیں پا سکتے۔ خواہ نبی ﷺ کی وفات کا واقعہ

عظیمہ کے سبب طبیعت پر سخت صدمہ گذرنا اس کا موجب ہوا یا کچھ اور۔ غرض وہم یہی تھا۔ کہ آنحضرت ﷺ پر موت نہیں آ سکتی پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اس وہم کو دور کرنے کے لئے اس آیت کو پڑھنا اسی طرح کا ہوا جیسے خدائے تعالیٰ نے نازل کی تھی۔ اور معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے مرادِ خداوندی صرف یہی ہے کہ رسالت اور موت میں منافات نہیں ہے۔ پس جس طرح اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح خطبہ صدیقیہ سے بھی نبی ﷺ کے لئے موت کا آ سکنا ثابت ہوا۔ نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات جسے مقصود سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہاں امکان ثابت ہو سکتا ہے مگر وقوع نہیں۔

دوم:۔ یہ کہ اسی آیت میں آگے اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ موجود ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی نظر آنحضرت ﷺ کی موت کے ممکن ہونے کے لئے اِنْ مَّاتَ پر ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں موت کو ممکن فرماتا ہے۔ اس وجہ کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے۔ جو حضرت ابوبکرؓ نے اسی وقت حاضرین کو پڑھ سنائی تھی۔ وہ آیت یہ ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ یعنی اے پیغمبر تو (بھی اپنے وقتِ مقررہ پر) مرنے والا ہے اور یہ (کفار بھی اپنے اپنے اوقاتِ مقررہ پر) مرنے والے ہیں''۔ (پ۲۳ زمر۔ ۳۹: ۳۰)

دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر میت کا لفظ فرمایا ہے پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا استدلال اَفَاِئِنْ مَّاتَ سے ہے۔ نہ کہ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ سے کہ وفاتِ مسیح کے لئے ضعیف اور غلط طور پر بھی مفید ہو سکے۔

سوم:۔ یہ کہ دجال کا خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ایک طرح سے دونوں آپس میں ایسے لازم و ملزوم ہیں۔ کہ ایک کا ماننے والا ضرور دوسرے کا مصدق ہے پس جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دجال کے خروج کی حدیث کے راوی ہیں۔ تو آپ نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کب غافل

ہیں۔(دیکھو سنن ابن ماجہ باب خروج الدجال)

چہارم:۔ یہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غرض ان آیات کے پڑھنے سے اس وہم کا ازالہ ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ فوت نہیں ہو سکتے پس چونکہ وصفِ نبوت وموت میں منافات کے ہونے کو علیٰ سبیل الحکایت باطل کرنا مقصود بالذات ہے۔ پس خطبۂ صدیقی اس امر پر تو بعبارۃ النص دلالت کرتا ہے۔ لیکن یہ امر کہ سب انبیاء مر چکے ہیں۔ نہ تو خطبۂ صدیقی کا مفاد ہے اور نہ اس پر مخاطبین کے مزعوم کی تردید موقوف ہے [1] پس اس سے وفاتِ مسیح علیہ السلام پر اجماعِ صحابہؓ کا دعویٰ کرنا خلافِ روایت بلکہ درایت بھی ہے۔ کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بالتصریح پکار رہی ہے۔ کہ وہ سب صحابہؓ کے درمیان آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ میں مَوْتِهٖ کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام قرار دے کر آپ کا نزول ثابت کر رہے ہیں۔ اور اس تصریح نزول کے موقع پر کوئی صحابی نہ تو نفس مضمون یعنی نزول حضرت مسیح علیہ السلام سے انکار کرتا ہے۔ اور نہ حضرت ابوہریرہؓ کے ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دینے کو غلط کہتا ہے اور نہ آپ کے استدلال کو ضعیف قرار دیتا ہے۔ پس اجماع حیات ونزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا نہ کہ وفات پر۔ قطع نظر اس سے کہ یہ روایت صحیح بخاری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیات ونزول پر اجماعِ صحابہؓ کو ثابت کر رہی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا اس آیت کا حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث کی تصدیق کے لئے پڑھنا کم سے کم مولوی محمد احسن صاحب کے خیالی اجماع کے توڑنے کے لئے تو کافی ہے۔

قسم دوم میں سے دوسری آیت یہ ہے۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پارہ اوّل رکوع اخیر۔ ۲:۱۴۱) اس آیت کا ترجمہ مرزا صاحب اس طرح کرتے ہیں۔

[1] کیونکہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے نہ کلیہ۔ کما مرّ مرارًا۔

''اس وقت سے جتنے پیغمبر پہلے ہوئے ہیں۔ یہ ایک گروہ تھا جو فوت ہو گیا۔ ان کے اعمال ان کے لئے تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ان کے کاموں سے تم نہیں پوچھے جاؤ گے''۔ انتہی

صفحہ ۳۲۲ میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مرزا صاحب قرآن شریف کے ترجمے میں الفاظ کی رعایت بالکل نہیں رکھتے اور سلسلہ عبارت اور ماقبل و مابعد کو بالکل بھلا دیتے ہیں۔ اور الفاظ قرآن شریف کو موڑ توڑ کر اپنے ٹھانے ہوئے مطلب کے پیچھے لے جاتے ہیں۔ زبان کے قواعد پر نظر اور اصول ترجمہ سے واقفیت رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ ترجمہ کرنے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ اور تفسیر بالرائے اور اتباع ھوی یعنی اپنے خیال ورائے سے تفسیر کرنا اور اپنی خواہش کی پیروی کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ناظرین انصاف سے قرآن مجید کے الفاظ اور مرزا صاحب کے ترجمہ پر نظر کریں گے۔ تو ان کو ہماری تصدیق کرنی پڑے گی۔ جناب مرزا صاحب! ''اس وقت سے جتنے پیغمبر پہلے ہوئے ہیں'' کس عبارت کا ترجمہ ہے اور قرآن شریف میں اس کے لئے کون سے الفاظ ہیں؟ آپ ترجمہ میں اور پھر قرآن شریف کے ترجمہ میں ایسی صریح بے دلیل زیادتیاں کرتے ہیں۔ اور ذرا نہیں جھجکتے۔ آپ کی مثال میں یہ کہنا ٹھیک ہے۔ ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

کیا دنیا میں آپ کے سوائے کوئی دوسرا شخص عربی زبان نہیں سمجھتا؟ کہ آپ ایسے دھوکے سے مطلب برآری چاہتے ہیں۔ خلت کے معنی مرزا صاحب نے اس جگہ بھی ''فوت ہو گئے ہیں'' کئے ہیں۔ اس کی تحقیق پہلی آیت میں گذر چکی ہے اس مقام پر مرزا صاحب سے صرف اتنا پوچھا جاتا ہے کہ خلو کے معنی موت کس زبان کا محاورہ ہے؟ اور کون سی کتاب اس کی شاہد ہے؟

اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت وغیرہ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ نہ عموماً اور نہ خصوصاً کیونکہ لفظ تلک (یہ) جو اس آیت کے شروع میں ہے۔ اس کا

شہادت القرآن

اشارہ ان کی طرف ہے۔ جو اس سے پیشتر مذکور ہیں اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے ہیں اور بس۔

اس آیت کی صحیح تفسیر اس طرح ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام وصیت کر گئے تھے کہ یہودیت کو نہ چھوڑنا۔ اور نیز اس بات پر بڑا فخر کرتے تھے۔ کہ ہم پیغمبروں کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے ان کے ان دونوں وہموں کو دور کرنے کے لئے پہلے تو فرمایا۔ کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام نے تو اپنے اپنے بیٹوں کو اسلام کی وصیت کی تھی۔ خاص کر یعقوب علیہ السلام نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم اسی ایک معبود کی عبادت کریں گے۔ جس کی عبادت آپ اور آپ کا باپ اسحٰق اور چچا اسمٰعیل اور دادا ابراہیم علیہم السلام کرتے رہے۔ اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کے دوسرے وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ ان لوگوں کے اعمال (یعنی ابراہیم۔ اسحاق اور یعقوب علیہم السلام جن کے بھروسے پر تم جرأت سے بداعمالیاں کرتے ہو) ان کے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے۔ آیت کا صحیح مطلب یہ ہے۔ جو بیان کیا گیا ہے۔ اور مرزا صاحب کچھ اور کا اور ہی مطلب لے اڑتے ہیں۔ اور اپنی رائے سے قرآن شریف کے مطالب کو بگاڑ بگاڑ کر مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ ناظرین! قرآن شریف میں سے یہ مقام نکال کر شروع مضمون سے اخیر تک مطالعہ کریں اور انصاف سے حق کی داد دیں۔

اگر خلت کی رو سے اس آیت کو کسی کی موت سے کچھ تعلق ہے بھی۔ تو اول چونکہ عیسیٰ علیہ السلام تِلْکَ کے مشار الیہم میں داخل نہیں ہیں۔ اس لئے اسے ان کی وفات کی دلیل گردانا بالکل باطل ہے۔ دوم یہ کہ یہی آیت اس سے آگے پارے کے اخیر پر بھی آئی ہے۔ اور اس سے پہلے تِلْکَ کے مشار الیہم حضرات ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ یعقوب (علیہم السلام) اور ان کے بیٹے ہیں اور عیسیٰ علیہ

السلام ان میں داخل نہیں۔اس سے پیشتر حضرت ابراہیم۔اسمٰعیل۔اسحٰق۔یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر ہے۔اور وہاں خلت یا موت وغیرہ کا کوئی ذکر تک نہیں۔پس جس جس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خلت کا لفظ فرمایا ہے۔وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں۔اور جہاں ان کا ذکر ہے۔وہاں لفظ خلت نہیں۔پس یہ آیت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کی دلیل نہ ہوئی۔

سوم یہ کہ اگر کسی طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کو اس آیت کے عموم میں داخل بھی سمجھ لیں۔تو پھر بھی یہ آیت عام رہے گی۔پس بموجب قاعدۂ دوم یہ دلیل آیت وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ. الآیہ اور اس جیسی دیگر آیتیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر شاہد ناطق ہیں۔ان کے مقابلہ میں ہرگز قابل قبول نہیں کیونکہ دلیل خاص کے مقابلہ میں دلیل عام کا اعتبار نہیں ہوتا۔

قسم دوم میں سے تیسری آیت وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ (انبیاء پ ۱۷۔۲۱:۳۴) اس آیت کا بیان مرزا صاحب اس طرح کرتے ہیں۔"ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو زندہ اور ایک حالت پر رہنے والا نہیں بنایا پس کیا اگر تو مر گیا۔تو یہ لوگ باقی رہ جائیں گے۔"

اس آیت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی موت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔کیونکہ اس میں ہمیشہ رہنے کی نفی ہے۔اور ہم عیسیٰ علیہ السلام کے ہمیشہ زندہ رہنے کے قائل نہیں۔بلکہ بموجب حدیث صحیح اعتقاد رکھتے ہیں۔کہ آپ علیہ السلام بعد نازل ہونے کے دنیا میں آباد رہ کر فوت ہوں گے۔اور مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔قادیانی کی مماثلت کی تردید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی تائید میں یہ حدیث کافی ہے۔پس عیسیٰ علیہ السلام کی موت قبل النزول ثابت نہ ہوئی۔

تیسری قسم کی وہ آیتیں ہیں۔جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہیں ہے' نہ عموماً اور نہ خصوصاً۔اور نہ علم اصول کی رو سے ان سے اس امر

پر استدلال جائز ہے۔ بلکہ صرف مرزا صاحب کی اپنی اختراع ہے۔ ان سب کی تردید کے لئے صرف وہی دو قاعدے جو ہم نے صفحہ ۳۵۲ میں بیان کئے ہیں۔ کافی ہیں کہ جب کوئی امر خاص اور صریح دلائل سے ثابت ہو جائے۔ تو ان کے مقابلہ میں ان کے خلاف عام دلائل اور قیاسی ڈھکوسلے نہیں چل سکتے۔ کیونکہ پھر متکلم کی تصریح کا کوئی فائدہ و اعتبار نہیں رہتا۔ مگر ناظرین کی تفہیم کے لئے ان آیات کو بھی ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا صاحب کے استدلال کس قدر ضعیف ہیں۔

تیسری قسم میں سے پہلی آیت یہ ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (بقرہ پ ا۔۲:۳۶) مرزا صاحب اس آیت کا بیان اس طرح فرماتے ہیں۔

> ''تم اپنے جسم خاکی کے ساتھ زمین پر ہی رہو گے۔ یہاں تک کہ اپنے تمتع کے دن پورے کر کے مر جاؤ گے۔ یہ آیت جسم خاکی کو آسمان پر لے جانے سے روکتی ہے کیونکہ لَكُمْ جو اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ اس بات پر بصراحت دلالت کر رہا ہے۔ کہ جسم خاکی آسمان پر جا نہیں سکتا۔ بلکہ زمین سے ہی نکلا اور زمین میں ہی رہے گا۔ اور زمین میں ہی داخل ہوگا۔ انتہی۔''

اس بیان سے ہر ذی علم مرزا صاحب کی قوت استدلال کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ استدلال کی صحت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ قرآن و حدیث کی تصریح کے خلاف نہ ہو۔ مگر مرزا صاحب اس امر کی ہرگز پرواہ نہیں کرتے۔ اور اپنی بے تکی ہانکے جاتے ہیں۔ ہاں مرزا صاحب! بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مستقر طبعی زمین ہی بنائی ہے۔ اور اسی میں وہ دفن کئے جاتے ہیں۔ اور اسی سے قیامت کو اٹھائے جائیں گے۔ یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس سے وفات مسیح علیہ السلام پر استدلال ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اصلی اور طبعی طور پر کسی جگہ کا جائے رہائش

ہونا امر دیگر ہے۔ اور عارضی طور پر کچھ مدت کے لئے کسی اور جگہ کا جائے رہائش ہونا امر دیگر ہے۔ مثلاً ملائکہ کا طبعی اور اصلی مستقر آسمان ہیں مگر باوجود اس کے وہ زمین پر بھی آمدورفت رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگر عیسیٰ علیہ السلام بھی عارضی طور پر کچھ عرصہ تک کرۂ زمین سے باہر دوسرے کرے میں رہیں۔ تو کوئی جائے تعجب نہیں۔

اس کے علاوہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا بھی ان کے مادہ طبعی وفطرتی کے سبب سے ہے۔ کیونکہ آپ کی پیدائش عام اسباب معتادہ کے خلاف نفخ روح القدس سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ باب اول ص ۲۲۷ اور ص ۲۲۹ میں بھی گذر چکا ہے۔ علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیدائشی طور پر ملائکہ سے مشابہت تھی۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا اور اس آیت کے حکم سے خارج ہونا ان کے اپنے مادۂ فطرتی کے لحاظ سے ہے۔ جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں ہے۔

مرزا صاحب اس آیت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ ''لَکُمْ'' اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔'' بے شک مرزا صاحب! لَکُمْ اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے۔ مگر یہ تو آپ کے مدعا کے خلاف ہے۔ آپ نے اسے کیوں معرضِ دلیل میں پیش کیا۔ اسی کو قواعد سے ناواقفی کہا کرتے ہیں۔ کہ اپنے مطلب کے خلاف دلیل بیان کی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کو کہنا یہ چاہئے تھا کہ اس جگہ فِی الْاَرْضِ ظرف مقدم واقع ہے۔ اور یہ تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔''

اس کے جواب میں اول تو ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر فی الارض کی تقدیم سے آپ حصر کا فائدہ اٹھا کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ صرف زمین ہی آدمی کے لئے جائے قرار ہے۔ اور اس کے سوائے اور کوئی جگہ نہیں تو اسی طرح لکم بھی مقدم واقع ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ زمین صرف انسانوں ہی کے لئے جائے قرار ہے۔ کسی دیگر حیوان کے لئے نہیں۔ حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ ناظرین انصاف کریں کہ

لکم کی تخصیص مرزا صاحب کو مفید ہوئی یا مضر؟ حقیقت الامر اس طرح ہے۔ کہ جو حصر فِی الْاَرْضِ سے حاصل ہوتا ہے۔ جو بہ نسبت استقرار اصلی کے ہے۔ اور تخصیص لکم سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ اس بنا پر ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد باذن الٰہی زمینی اشیاء میں خلیفے اور متصرف ہیں۔ لہٰذا ان کو زمین کی آبادی میں ایک ایسی خصوصیت حاصل ہے۔ جو دوسرے حیوانوں کو نہیں۔ اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا اور اوروں کا نہ کیا۔ علاوہ اس کے یہ کہ روئے سخن بھی انہی کی طرف ہے اور علم معقول پر تظر رکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ ایسی صورت میں جہاں جعل تکوینی پایا جائے۔ اس کا مجعول الیہ لازم نہیں ہوتا۔ بلکہ عارض ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ فرمایا ہے۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (نباپ ۳۰)(۷۸:۱۰،۱۱)

''ہم نے رات کو آرام کا وقت بنایا ہے۔ اور دن کو معاش کمانے کا۔''

وَقَالَ وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (قصص پ ۲۰۔۲۸:۷۳)

''اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات کو اور دن کو بنایا تا کہ تم اس میں آرام کرو۔ اور (اس میں) اس کا فضل تلاش کرو۔''

تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کہ دن کو آرام نہیں کر سکتے اور رات کو معاش کے لئے کام کاج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ روز مرہ کے معاملات اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اسی قرآن شریف میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے کسی فائدہ کے لئے بنایا ہے تو وہ فائدہ اس سے مخصوص نہیں بلکہ کسی دوسری چیز سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں اصلی طور پر اور عارضی طور پر ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً اسی دن اور رات کو معاش اور آرام کا وقت بتانے میں یہی قول ٹھیک ہے۔ کہ معاش کا اصلی وقت دن ہے مگر عارضی طور پر رات کو بھی کما سکتے ہیں۔ اور آرام اور نیند کا اصلی وقت رات ہے۔ مگر عارضی طور پر دن کو بھی آرام و

نہ کر سکتے ہیں۔ پس اسی طرح اس آیت زیر بحث میں ہے کہ رہائش کا اصلی مقام انسان کے لئے زمین ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو عارضی طور پر کسی خاص مدت تک آسمان پر رکھے تو کیا تعجب ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ کسی شخص کا مادہ فطرتی بھی اس انعام کے قابل ہو۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں بھی ہوں۔ جیسا کہ باب اوّل میں ص ۲۲۷ سے ص ۲۲۹ تک بیان ہوئی ہیں۔ پس مرزا صاحب کا اس آیت کو وفات مسیح کے لئے پیش کرنا بالکل بے جا ہے۔

قسم سوم میں سے دوسری آیت یہ ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.

(رحمٰن پ ۲۷۔ ۵۵:۲۶، ۲۷)

"ہر ایک چیز جو زمین میں موجود ہے اور زمین سے نکلتی ہے۔ وہ معرض فنا میں ہے۔ یعنی دمبدم فنا کی طرف میل کر رہی ہے۔"

اس آیت کو بھی زیر بحث وفات مسیح علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام آخر کار فوت ہوں گے۔ جس سے ہم کو انکار نہیں' کیونکہ ہر شے کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اسی طرح جو وقت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ہے آپ ضرور ضرور اسی وقت فوت ہوں گے۔ نہ اس سے آگے نہ اس سے پیچھے۔ چنانچہ یہ امر مرزا صاحب کے اپنے الفاظ "معرض فنا" سے بھی ثابت ہے۔ اور اس کے بعد آپ کا یہ فرمانا کہ فَانٍ کا لفظ اس لئے اختیار کیا اور یفنی نہیں کہا تا کہ معلوم ہو کہ فنا ایسی چیز نہیں کہ کسی آئندہ زمانہ میں ایک دفعہ واقع ہو گی۔ بلکہ سلسلہ فنا کا ساتھ ساتھ جاری ہے۔ فَانٍ کا نکتہ نہ سمجھنے اور اپنے لکھے ہوئے "معرض فنا میں ہے" کو بھول جانے کے سبب سے ہے کیونکہ فَانٍ پر کوئی شخص اعتراض کر سکتا ہے کہ جو چیز دنیا پر قائم اور موجود نظر آ رہی ہیں ان کو صفت فنا کی حاصل نہیں تو پھر ان کے لئے بھی فَانٍ کیوں فرمایا۔

اس اعتراض کا جواب اس طرح ہے کہ صفت کا حاصل ہونا دو طرح پر ہوتا

ہے ایک بالفعل دوم بالقوت' اگرچہ سب موجودات پر بالفعل فانی کا لفظ نہیں آ سکتا۔ مگر اس لحاظ سے کہ ہر ایک چیز سوائے معبود حقیقی کے معرض فنا میں ہے۔ اور آخر کار فنا ہو جائے گی۔ سب کے لئے فان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اسم فاعل اور فعل مضارع کے صیغے میں فرق کر کے جو نکتہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ اسم فاعل اور فعل مضارع کی مشابہت کو نظر انداز کر کے لکھا گیا ہے۔ اگر آپ اس طرف توجہ کریں گے۔ تو پھر ایسے نکتے بیان نہ کریں گے۔ پس جب قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا وقت قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہونے کے بعد ہے۔ تو پھر قبل نزول کے اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر استدلال کرنا بالکل غلط ہے۔

قسم سوم میں سے تیسری آیت یہ ہے:

وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا. (نحل پ۱۴۔۱۶: ۷۰)

اس آیت کا بیان مرزا صاحب یوں کرتے ہیں:-

"اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ سنت اللہ دو ہی طرح سے تم پر جاری ہے۔ بعض تم میں سے عمر طبعی سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ اور بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف رد کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہو جاتے ہیں۔"

مرزا صاحب نے ترجمہ بالکل غلط کیا ہے اور قرآن شریف کے مطلب کو بالکل بدل دیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ۔

قسم سوم میں سے چوتھی آیت یہ ہے

وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (یٰس پ۲۳۔۳۶: ۶۸)

"یعنی جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں تو اس کی پیدائش کو الٹا دیتے ہیں۔"

قسم سوم میں سے پانچویں آیت یہ ہے:-

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَۃً۔ (الروم پ۲۱۔۳۰:۵۴)

یعنی خدا وہ خدا ہے۔ جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا۔ پھر ضعف کے بعد قوت دی۔ پھر قوت کے بعد ضعف اور پیرانہ سالی دی۔

قسم سوم میں سے چھٹی آیت یہ ہے:-

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ۔ والآیہ (یونس پ۱۱)

یعنی "اس زندگی دنیا کی مثال یہ ہے کہ جیسے اس پانی کی مثال ہے جس کو ہم آسمان سے اتارتے ہیں۔ پھر زمین کی روئیدگی اس سے مل جاتی ہے۔ پھر وہ روئیدگی بڑھتی اور پھولتی ہے۔ اور آخر کار کاٹی جاتی ہے۔" (۱۰:۲۴)

قسم سوم میں سے ساتویں آیت یہ ہے:-

ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ (مومنون پ۱۸)

یعنی "اوّل رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ نے تم کو کمال تک پہنچایا۔ اور پھر تم اپنا کمال پورا کرنے کے بعد زوال کی طرف میل کرتے ہو۔ یہاں تک کہ مر جاتے ہو۔" (۲۳:۱۵)

قسم سوم میں سے آٹھویں آیت یہ ہے:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ۔

(زمر پ۲۳۔۳۹:۲۱)

ان آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ذکر نہ تو صراحتاً ہے اور نہ اشارۃً۔ مرزا صاحب اپنی الٹی منطق سے ان کو بھی وفات مسیح کے دلائل سمجھتے ہیں۔

ان کے طریق استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں انسان کی ترقی وکمال اور پھر تنزل وزوال کا بیان ہے۔ پس ضرور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر بھی بوجہ انسان ہونے کے یہ سب حالات گذریں' وہ بوڑھے بھی ہوں۔ اور پھر بڑھاپے کے بعد فوت بھی ہوں۔ کیونکہ ان آیتوں میں ان کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ نیز فرماتے ہیں کہ بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ کر انسان کے حواس جاتے رہتے ہیں۔ اور وہ عالم ہونے کے بعد نادان محض ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے۔ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا یعنی "بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف رد کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہو جاتے ہیں۔"

نیز فرماتے ہیں:-

"اور اگر پھر فرض کے طور پر اب تک زندہ رہنا ان کا تسلیم کر لیں تو کچھ شک نہیں کہ اتنی مدت کے گذرنے پر پیر فرتوت ہو گئے ہوں گے اور اس کام کے ہرگز لائق نہ ہوں گے کہ کوئی خدمتِ دینی ادا کر سکیں"

(ازالہ اوہام تقطیع کلاں ج ا ص ۲٦)

یہ ہے مرزا صاحب کے استدلال کا طریق جس کی بنا بالکل قیاسی ڈھکوسلوں اور آیات کو غیر محل پر استعمال کرنے پر ہے۔

اب اس کی تردید اور جواب ٹھنڈے دل سے سنیں اور انصاف کریں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ ان آیتوں میں انسان کے کمال و ترقی' تنزل و زوال کا ذکر ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس کے جواب میں اول تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کو ہمیشہ کے لئے موت سے بچنے والا نہیں جانتے بلکہ مانتے ہیں کہ آخر ایک وقت وہ بھی فوت ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ "میرے پاس حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان دفن کئے جائیں گے۔" ہاں ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ مرزا صاحب ان

آیتوں کی رو سے جب چاہیں کسی پر موت لے آئیں اور جیتے جی اس کو مردہ بنا دیں۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے جس کے قبضے میں موت اور زندگی ہے ہر ایک کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ جس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور ہم کو مرزا صاحب کی تحریروں سے تجربہ ہو چکا ہے۔ کہ جب وہ کسی خاص میعاد تک کسی کے مرنے کی خبر دیتے ہیں تو وہ اس مدت کے بعد تک زندہ رہتا ہے مثلاً مسٹر آتھم عیسائی کی موت کی نسبت آپ نے بڑے زور سے پیشگوئی کی تھی کہ وہ پانچویں ستمبر ۱۸۹۴ء تک مر جائے گا یا مسلمان ہو جائے گا مگر وہ اس میعاد کے بعد تک مذہب عیسائی پر لوگوں میں زندہ موجود رہا۔ اور اسی طرح آپ نے اپنے رقیب اور اپنی منکوحۂ آسمانی کے شوہر مرزا سلطان محمد کی نسبت بھی پیشگوئی کی تھی کہ وہ عرصہ اڑھائی سال تک مر جائے گا۔ اور مساۃ محمدی بیگم آپ کے پاس آئے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کی زوجہ بنا دیا ہوا ہے مگر آج ستمبر ۱۹۲۲ء تک وہ زندہ موجود ہے اور آپ کی ''منکوحۂ آسمانی'' سے اللہ تعالیٰ نے مرزا سلطان محمد کو اولاد بھی عطا فرمائی ہے[1] ان واقعات سے ہمیں کامل یقین ہے کہ مرزا صاحب کسی کی اجل وقت سے پیشتر نہیں لا سکتے پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخرکار مرنا امر دیگر ہے۔ اور اس وقت قبل نزول فوت شدہ ہونا امر دیگر ہے پس ان آیات سے بھی آپ کی وفات زیر بحث ثابت نہ ہوئی۔ اور مرزا صاحب کا مدعا پورا نہ ہوا۔

دوم یہ کہ صورت مستثنیٰ کے لئے ضروری نہیں کہ اسی عبارت میں موجود ہو بلکہ سارے قرآن وحدیث میں جہاں کہیں جس امر کو کسی عام حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔ وہ مستثنیٰ ہی شمار کیا جاتا ہے۔ خواہ عبارت کے ساتھ ہو خواہ کسی اور جگہ پر۔ کیونکہ سارا قرآن مجید اور ساری حدیث شریف کَکَلِمَةٍ وَّاحِدَةٍ یعنی مثل ایک

---

[1] مرزا سلطان محمد صاحب ۱۹۴۹ء میں بمقام لاہور فوت ہوئے۔ اور اپنے پیچھے ۵ لڑکے اور ۲ لڑکیاں چھوڑیں۔ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ ابھی تک خدا کے فضل سے زندہ سلامت عارف والا ضلع منٹگمری میں مقیم ہیں۔ عبدالقیوم میر۔ ۲۸ مئی ۱۹۵۸ء۔

کلمہ کے ہے قرآن وحدیث میں اس کی نظیریں بکثرت ہیں۔خوف طوالت سے صرف چند ذکر کی جاتی ہیں۔

اوّل:- دوسرے پارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ یعنی ''طلاق والی عورتیں دوسرے نکاح کے لئے تین حیض تک انتظار کریں'' اب ظاہر ہے کہ اَلْمُطَلَّقٰتُ جمع کا لفظ ہے۔اور حاملہ اور غیر حاملہ اور شوہر دیدہ اور شوہر نادیدہ سب قسم کی مطلقہ عورتیں اس لفظ میں داخل ہیں۔ تو بس مرزا صاحب کی منطق کی رو سے ان سب کی عدت یہی تین حیض ہونی چاہئے۔اور یہ بالکل غلط ہے۔کیونکہ حاملہ اور شوہر نادیدہ مطلقہ عورتیں اور جن کو حیض نہیں آتا۔اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔اور ان کا حکم دوسری جگہ پر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ غیر ممسوسہ یعنی شوہر نادیدہ کی نسبت سورۂ احزاب پارہ بائیس میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا یعنی اے مسلمانو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو اور پھر ان کو مجامعت سے پیشتر طلاق دے دو تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدت نہیں۔جسے تم کو گن کر پورا کرنا پڑے۔'' (احزاب پ ۲۲۔۳۳:۴۹)

دیکھئے اس آیت میں شوہر نادیدہ مطلقہ کی عدت بھی مقرر نہیں کی۔ایک طرف سے طلاق ہوا اور دوسری طرف نکاح کر لینے کا اختیار دیا ہے اسی طرح سورۂ طلاق پارہ اٹھائیس میں وہ مطلقہ عورتیں جو اب بڑھاپے کی وجہ سے حیض سے مایوس ہیں۔اور جن کو ابھی حیض آیا ہی نہیں۔اور جو حاملہ ہیں ان کی نسبت فرمایا۔ وَالّٰٓـِٔىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔىْ لَمْ يَحِضْنَ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق پ ۲۸ یعنی ''تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو جائیں۔اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔اور ایسے ہی جن کو ابھی حیض نہیں آیا۔اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔'' (۶۵:۴)

شہادت القرآن

اسی طرح اللہ تعالی نے محرمات کے بیان میں فرمایا وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ (نساء پ ۴) یعنی دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔" (۴:۲۳) اور سب محرمات کے ذکر کے بعد فرمایا وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ یعنی "ان مذکورہ بالا عورتوں کے سوائے تم پر حلال ہیں"۔ حالانکہ صحیح بخاری میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھوپھی' بھتیجی اور خالہ' بھانجی کو ایک نکاح میں جمع سے بھی منع فرمایا ہے۔

ان مثالوں سے صاف ثابت ہو گیا کہ مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان آیتوں میں مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان کے حکم میں وہ بھی داخل ہیں۔ معقول وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ آیات یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ اور وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ اور اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ اور وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا آپ کے آسمان میں اب تک زندہ موجود ہونے اور قرب قیامت میں نازل ہونے اور جب تک بوڑھے نہ ہونے پر دلائل واضحہ ہیں۔ جن سے کسی منصف کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان آیات کی تفسیر تفصیل واختصار سے پیچھے گذر چکی ہے لہٰذا دوبارہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ اسی طرح احادیث صحیحہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر بالصراحۃ شہادت دیتی ہیں۔ اور بعد اس کے آپ کی وفات ظاہر کرتی ہیں۔ اور آپ کا مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن[1] ہونا بیان کرتی ہیں۔ آپ کو ان زیر بحث آیات کے حکم سے مستثنیٰ کر رہی ہیں۔

ان آیات زیر بحث میں سے پہلی آیت یعنی وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا کا ترجمہ ایسا کیا ہے۔ جو قواعد زبان کی رو سے غلط اور اصول اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ اور مرزا صاحب نے اس میں

---

[1] حضرت عیسیٰ کی قبر اور مدفن کی تحقیق کے لئے دیکھو رسالہ اَلْخَبَرُ الصَّحِیْحُ عَنْ قَبْرِ الْمَسِیْحِ۔ ۱۲

ہر دو امر کا لحاظ نہیں کیا۔ مرزا صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

''اور بعض عمر طبعی کو پہنچتے ہیں۔ یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف رد کیے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادانِ محض ہو جاتے ہیں۔''

یہ ترجمہ قواعد زبانِ عرب کی رو سے اس لئے غلط ہے کہ مرزا صاحب نے لِکَیْلَا یَعْلَمَ میں لِکَیْ کے معنی کیے ہیں ''اس حد تک نوبت پہنچتی ہے۔'' حالانکہ کتب نحو میں مصرح ہے۔ کہ کَیْ پر جو لام داخل ہوتا ہے وہ علت کے لئے ہوتا ہے (دیکھو مغنی اللبیب) پس اس آیت کے صحیح معنی یہ ہیں۔ ''بعض تم میں سے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ارذل عمر کی طرف پھیرے جاتے ہیں تاکہ وہ بعد جاننے کے کچھ بھی نہ جانیں۔'' یعنی بعض شخصوں کو اللہ تعالیٰ اس لئے بوڑھا کرتا ہے کہ وہ اپنی جانی ہوئی باتیں بھول جائیں اور سب اشیا میں خدا تعالیٰ کا تصرف ظاہر ہو۔ دیکھئے امام رازیؒ تفسیر کبیر میں سورۂ نحل کی تفسیر میں فرماتے ہیں فقوله وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا. يدل على انه تعالىٰ انما رده إلىٰ ارذل العمر لاجل ان يزيل عقله الخ یعنی ''اللہ تعالیٰ جو بعض انسانوں کو لمبی عمر تک پہنچاتا ہے تو اس کی علت یہ ہوتی ہے کہ اس کی عقل کو زائل کر دے۔''

پس جب حضرت روح اللہ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے لئے آسمان پر اٹھایا۔ اور قرب قیامت تک ان کی حیات مقرر کی جیسا کہ حصہ اول ص ۲۲۴ میں وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔ تو مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ اگر بالفرض عیسیٰ علیہ السلام اتنی مدت تک زندہ بھی رہیں۔ تو پیر فرتوت ہو جانے کے باعث ان کا نزول کچھ مفید نہیں ہوگا۔ بالکل باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اتنی لمبی عمر اس لئے نہیں دی کہ وہ اپنا علم بھول جائیں۔ بلکہ کئی مفید امروں اور حکمتوں کے لئے دی ہے۔ نہایت بڑھاپے کو پہنچ کر بھی علم نہ بھولنا اور عقل کا زائل نہ ہونا۔ حضرت آدم اور حضرت نوح

علیہما السلام کے ہزار ہزار برس تک لمبی عمر پانے سے ثابت ہے اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں بعض کا سو سو سال اور اس سے زیادہ تک عمر پانا اور ان کے حواس کا برابر ٹھیک رہنا۔ اور اسی طرح مقبولان بارگاہ رب العلمین حضرات بابرکات محدثین رحمہم اللہ اجمعین کا بڑی بڑی لمبی عمر پانا۔ اور حدیث نبوی ﷺ کی تدریس میں برابر مشغول رہنا واقفانِ سنت نبویہ ﷺ پر پوشیدہ نہیں ہے خاص کر ہمارے زمانہ میں حضرت شیخنا و شیخ الکل ناصر سنتِ سید الثقلین ناشر حدیثِ رسولِ رب الخافقین سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی نور اللہ ضریحہ کا ایک سو دس سال تک عمر پانا اور اس وقت تک حدیثِ نبوی ﷺ کی تعلیم کرتے رہنا چھوٹے بڑے پر ظاہر ہے۔ ہائے افسوس! پھر مرزا صاحب کے قلم سے کس طرح نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی برحق' خاص خدا تعالیٰ کے سکھائے ہوئے پیغمبر' حضرت روح اللہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اتنی لمبی عمر پانے سے پیر فرتوت ہو کر نادانِ محض ہو جائیں گے اور کسی کام کے نہ رہیں گے آہا! مولانا روم صاحب نے کیا سچ کہا ہے

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

جناب مرزا صاحب! اگر ہر شخص کے لئے ارذل عمر کو پہنچنے پر نادانِ محض ہو جانا ضروری ہے تو آپ بھی اس سے بچ نہیں سکتے۔ کیونکہ آپ نے اپنی عمر پہلے اسی سال تک بتائی تھی۔ اور پھر اس پر پندرہ سال اور بڑھا لئے ہیں اور ارذل عمر کی ادنیٰ حد پچھتر سال ہے۔ تو پھر کیا آپ بیس سال تک ارذل عمر میں نہیں رہیں گے اور پیر فرتوت ہو کر نادانِ محض نہیں رہیں گے۔ اور پھر آپ دینی خدمت کیا کریں گے؟

اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ مرزا صاحب کا ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس آیت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اب یہ امر بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ ترجمہ اصول وعقائد اسلامیہ کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ

مرزا صاحب عمر طبعی کے قائل ہیں۔ اور اس کے بعد موت کو ضروری جانتے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا صاحب موت کو ایک عدمی امر جانتے ہیں۔ علم عقائد پر نظر رکھنے والوں پر مخفی نہیں کہ عمر طبعی کو ماننا اور اس کے بعد موت کا ضروری ہونا۔ اور موت کو ایک عدمی امر جاننا حکمائے یونان کا مذہب ہے' نہ کہ مسلمانوں کا۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ نے سورۂ نحل کی تفسیر میں عمر طبعی کے متعلق حکما کا مذہب اور ان کے دلائل ذکر کیے ہیں اور پھر عقلی دلائل سے بہت تفصیل کے ساتھ ان کا رد لکھنے کے بعد فرمایا کہ:-

''ایک دن میں سورہ والمرسلات پڑھ رہا تھا جب آیت اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ پر پہنچا اور وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ پڑھا (یعنی قیامت کے روز ان جھٹلانے والوں کے لئے ویل ہوگا) تو میں نے کہا بے شک ان مکذبین سے مراد وہی لوگ ہیں۔ جو حیوانات کے بدن کی ساخت کو طبیعت کی طرف اور رطوبت اور حرارت کے اثر کرنے کی طرف نسبت کرتے ہیں (اور کہا) اے رب العزت میں سچے اور پختہ دل سے ایمان رکھتا ہوں۔ کہ یہ تدابیر طبیعت کے اثر سے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ تیرا فعل ہے۔ جو خالق اور علیم اور احکم الحاکمین اور اکرم الاکرمین ہے۔''

اور اس کے بعد ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

''ہم نے (اس سے اوپر) بیان کر دیا ہے کہ حکمانے موت کا سبب جو ذکر کیا ہے وہ فاسد اور باطل ہے۔ اور اس سے دور لازم آتا ہے اور جب ثابت ہو گیا کہ حکما کا مذہب باطل ہے تو ظاہر ہو گیا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے اور مقدر کرنے سے ہوتی ہے۔''

میں (مصنف) کہتا ہوں امام رازی کے اس قول کی تصدیق قرآن شریف میں کئی جگہ موجود ہے جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورہ ملک میں اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ یعنی خدا نے موت اور زندگی کو پیدا کیا (ملک پ ۲۹) (۶۷:۲) اس

کے بعد رازیؒ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"ہم نے (اوپر) بدلائل بیان کر دیا ہے کہ انسان کے حالات کمال سے نقصان اور قوت سے ضعف کی طرف انتقال کرنے کی علت (فاعل) طبیعت نہیں ہے۔ پس قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ انسان کا حالتِ جوانی سے بوڑھا ہونا اور عقل کامل کے بعد پیرانہ سالی کی وجہ سے نادان ہو جانا بمقتضائے طبیعت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ فاعلِ مختار کے فعل سے ہے۔ (اس کے بعد إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ کی تفسیر میں فرماتے ہیں) کہ یہ بات یعنی اللہ تعالیٰ علم والا اور قدرت والا ہے۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا۔ اس کی اصل اصول ہے۔ کیونکہ طبیعت تو ایک جاہل چیز ہے۔ جو مصلحت اور فساد کے وقت میں تمیز نہیں کر سکتی۔ اس لئے یہ سب انتقالات جو انسان میں ہوتے ہیں۔ ان کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ لیکن سب جہان کا معبود اور تدبیر کرنے والا اور سب کو پیدا کرنے والا (خداوند تعالیٰ) اپنے علم اور قدرت میں کامل ہے پس اپنے کمالِ علم کی رو سے بہتری اور خرابی کے اندازوں کو جانتا ہے۔ اور کمالِ قدرت کی رو سے بہتری عطا کرنے اور خرابی کے دور کرنے پر قادر ہے۔ پس ضرور ضرور حیوانات کی بناوٹ کو اس معبودِ حقیقی کی طرف منسوب کرنا چاہئے اور طبیعت کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں ہے۔"

مرزا صاحب! دیکھئے قرآن شریف کے نکتے ایسے ہوتے ہیں۔ جو امام رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں نہ کہ جو آپ بیان فرماتے ہیں۔ اور محاوراتِ عرب اور اصول اسلام کے بھی خلاف ہوتے ہیں۔

قسم سوم میں سے نویں آیت یہ ہے:-

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ. (انبیاء پ ۱۷۔۲۱:۸)

مرزا صاحب اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

"کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔"

ناظرین! خیال فرماسکتے ہیں کہ یہ ترجمہ قرآن شریف کے الفاظ سے کس قدر اجنبی ہے اور اس کی اردو بھی صحیح نہیں۔

قسم سوم میں سے دسویں آیت یہ ہے:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَاْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ یَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ.

یعنی "ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر رسول بھیجے ہیں۔ وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے۔ اور بازاروں میں پھرتے تھے۔"

(فرقان پ ۱۸۔ ۲۵: ۲۰)

ان دونوں آیتوں سے مرزا صاحب حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ انسان بغیر کھانے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر کھانا نہیں مل سکتا۔ اس لئے وہ فوت ہو چکے ہیں۔

مرزا صاحب معارف قرآنی تو درکنار مراد قرآنی کے سمجھنے سے بھی کئی منزلیں دور رہتے ہیں۔ نہ سمجھتے ہیں نہ سوچتے ہیں اور نہ سلسلۂ کلام پر نظر کرتے ہیں۔ اپنی بے تکی ہانکتے ہیں۔

ان آیتوں کی صحیح مراد یہ ہے کہ کفار نے رسول اللہ ﷺ کے کھانے پینے اور بازاروں میں چلنے پر اعتراض کیا تھا۔ کہ یہ کام منصب نبوت کے منافی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان کے شروع میں ذکر کیا کہ

وَقَالُوْا مَا لِھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ.

(فرقان پ ۱۸)

"(کفار مکہ) کہتے ہیں کہ یہ رسول کیسا ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے۔" (۲۵: ۷)

گویا کفار نے رسول برحق کے لیے ضروری مانا ہوا تھا کہ وہ کھانے اور بازاروں میں چلنے سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب فرمایا کہ اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پیشتر جس کسی کو اپنا رسول کر کے بھیجا ہے۔ ان میں بھی یہ باتیں پائی جاتی تھیں۔ جب وہ باوجود ان باتوں کے رسول تسلیم کیے جاتے ہیں تو اگر تم میں بھی یہ اوصاف پائے گئے ہیں۔ تو انکار کی کیا وجہ ہے؟

دوسرا جواب یہ دیا ''وَمَا جَعَلْنَا هُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو بے جان دھڑ نہیں بنایا۔ کہ ان کے لئے نہ کھانا ضروری ہو۔'' جس کا ترجمہ مرزا صاحب یوں کرتے ہیں ''کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔''

دیکھئے تو علاوہ بے ڈھنگی اردو ہونے کے الفاظ و مراد قرآنی سے کس قدر اجنبیت ہے۔ علاوہ بریں اس طرف خیال فرمایئے۔ کہ ان آیتوں کو اور اس مضمون کو حضرت مسیح علیہ السلام کی موت قبل النزول سے کیا تعلق و نسبت ہے؟

آیئے مرزا صاحب! ہم آپ کو ایک نکتہ بتاتے ہیں۔ اگر خود سمجھ نہ سکیں۔ تو فاضل امروہی کو پاس بٹھا کر سمجھ لیں۔ کہ آیت وَمَا جَعَلْنَا هُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ میں جملہ لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ صفت ہے جَسَدًا کی اور جسد اور جسم آپس میں ہم معنی ہیں۔ اور دلیل ان کے ہم معنی ہونے کی یہ ہے کہ دونوں کے فاکلمہ اور لام کلمہ میں جیم اور سین ہے۔ پس اس آیت سے یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جسد محض (بے جان دھڑ) سے بالضرورت طعام سے فائدہ مند ہونے کی نفی کی ہے۔ اور اس کے لئے نہ کھانا ضروری قرار دیا ہے لیکن زندہ جسد سو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کھائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ نہ کھائے کیونکہ لغت میں جسد انسانوں اور فرشتوں اور جنوں سب کے جسم کے لئے ہے۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اَلْجَسَدُ مُحَرَّكَةً جسم الانسان والجن والملائكة اور معلوم ہے کہ فرشتے فطرۃً طعام وغیرہ حاجات بشریہ کے محتاج نہیں ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اس

آیت میں یہ ہرگز ملحوظ نہیں کہ ہر زندہ چیز کے لئے کھانا ضروری ہے۔ ہاں یہ ضرور ملحوظ ہے کہ ہر بے جان جسم کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ کھائے۔ سو اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات سے کچھ تعلق نہیں۔

پس جب آسمان پر فرشتے بغیر طعام کے زندہ ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام بھی جو پیدائش کے لحاظ سے فرشتوں کے مشابہ ہیں اور اسی مشابہت کی وجہ سے آسمان پر اٹھائے گئے ہیں بغیر طعام کے زندہ رہ سکتے ہیں۔

مرزا صاحب کا یہ ترجمہ کہ "کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو۔" علاوہ اس کے کہ قرآن شریف کے الفاظ کا ترجمہ نہیں ہے۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ فرشتے اجسام ہی ہیں۔ اور زندہ بھی ہیں اور ان پر جسد کا لفظ بولا بھی جاتا ہے اور پھر وہ کھانا نہیں کھاتے۔

اس آیت پر اور زیادہ بھی لکھ سکتے ہیں مگر اتنا بیان کافی معلوم ہوتا ہے۔

قسم سوم میں سے گیارھویں آیت یہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ.

(نحل پ ۱۴) (۱۶: ۲۰، ۲۱)

"یعنی جو لوگ بغیر اللہ کے پرستش کئے جاتے اور پکارے جاتے ہیں۔ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ ہیں۔ مر چکے ہیں زندہ بھی تو نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

مرزا صاحب اس آیت سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ جو کوئی اللہ کے سوائے پرستش کیا جاتا ہے۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ مردہ کہتا ہے۔ اور چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں۔ اس لئے ثابت ہوا کہ وہ بھی فوت شدہ ہیں۔

مرزا صاحب نے نہ تو آیت کا ترجمہ ٹھیک کیا ہے اور نہ اس کی مراد صحیح کو پہنچے ہیں۔ جناب مرزا صاحب! "بغیر اللہ کے" میں ب کس قسم کی ہے؟ اور اس کے کیا

معنی ہیں؟ آیا آپ غیر اللہ اور بغیر اللہ میں فرق نہیں جانتے؟

اس آیت پر مرزائی پارٹی بڑا فخر کیا کرتی ہے۔ اور اسے مسیح علیہ السلام کی وفات کے لئے جلالی[1] آیت کہا کرتی ہے۔ مگر جس طرح سے مرزا صاحب محاورات عربیہ کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح ان کے مرید بھی اس کمال سے بے بہرہ ہیں ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت بتوں کے حق میں ہے۔ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ کفار مکہ اللہ کے سوائے جن کو پکارتے ہیں۔ وہ بے جان ہیں۔ کیونکہ سورت نحل جس کی یہ آیت ہے مکی ہے۔ لہٰذا یہ آیت مکہ کے کفار کی تردید کے لئے نازل ہوئی۔ نہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید کے لئے۔ اس پر مرزائیوں کی طرف سے یہ جواب ہوا کرتا ہے۔ کہ آیت میں اَلَّذِین کا لفظ ہے۔ جو ذوی العقول کے لئے آیا کرتا ہے۔ پس اس میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تردید ہے جن کے معبود ذوی العقول اشیاء میں سے ہیں۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت عزیر علیہما السلام۔ ہم کہتے ہیں اَلَّذِیْنَ کا ذوی العقول سے مخصوص ہونا کسی کتاب علم نحو یا لغت میں تو نہیں لکھا۔ مرزا صاحب اور ان کے ذریت کی اپنی عربی بولی میں ہوگا۔ جو ہم پر حجت نہیں بلکہ زبان عربی میں اَلَّذِیْ اور اس کی مؤنث اَلَّتِیْ کا استعمال جاندار و غیر جاندار، ذوی العقول وغیر ذوی العقول دونوں طرح کی اشیاء پر آیا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل۔

پہلی آیت:۔

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ. (انعام پ ۸)

ترجمہ ''پھر (سنا ان کو کہ) دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب پوری کر کے ایسے طریق سے جو بہت خوبصورت ہے اور تفصیل ہر شے کی۔''

(۱۵۴:۶)

[1] دیکھو الدلیل الصریح مصنفہ مولوی مبارک علی سیالکوٹی بر حاشیہ صفحہ اخیر۔ ۱۲ منہ۔

اس آیت میں لفظ اَحْسَنَ کی نسبت مفسرین کے دو قول ہیں۔ اول یہ کہ اَحْسَنَ اس جگہ صیغہ ماضی معلوم از باب افعال ہے۔ دوم یہ کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ پس اَحْسَنَ کو صیغہ ماضی جاننے سے اَلَّذِیْ ذی عقل کے لئے ہوگا اور اس کے اسم تفضیل ہونے پر اس کا غیر عاقل کے لئے ہونا صاف ظاہر ہے۔ مغنی اللبیب باب الموصول ص ۱۳۷ جلد دوم میں اس آیت کی نسبت لکھا ہے ویکون احسن حینئذٍ اسم تفضیل لا فعلا ماضیا وفتحته اعراب لابناء وھی علامة الجر۔

دوسری آیت:۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ.

(انعام پ ۸ و بنی اسرائیل پ ۱۵)

''یعنی یتیم کے مال کے نزدیک نہ جاؤ۔ مگر ایسے طریق سے جو بہتر ہو۔'' (۶:۱۵۲ اور ۱۷:۳۴)

تیسری آیت:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا.

(نساء پ ۴ ع ۱)

''یعنی اپنے وہ مال جو اللہ نے تمہارے لئے گذران کا سبب بنائے ہیں بے عقلوں کو نہ پکڑا دو۔'' (۴:۵)

اسی طرح اَلَّذِی کا غیر ذوی العقول کے لئے بھی مستعمل ہونا شعرا کے کلام سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ متنبی جس نے مرزا صاحب کی طرح اپنی فصاحت اور بلاغت کے گھمنڈ پر نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اسی لئے اسے متنبی یعنی بناوٹی نبی کہا جاتا ہے۔ اپنے دیوان میں جس کی فصاحت و بلاغت علما میں مسلم ہے کہتا ہے

وَالَّذِیْ تُنْبِتُ الْبِلَادُ سُرُوْرٌ
وَالَّذِیْ تُمْطِرُ السَّحَابُ مُدَامٌ

(ترجمہ) "اب جو کچھ شہروں کی زمین میں اگے گا وہ شراب ہی ہوگا۔
اور جو کچھ بادل برسا رہے ہیں وہ بھی شراب ہی ہوگا۔"

اسی طرح دیوان ابی العتاہیہ میں ہے

إِلٰهِیْ لَا تُعَذِّبْنِیْ فَإِنِّیْ
مُقِرٌّ بِالَّذِیْ قَدْ كَانَ مِنِّیْ

(ترجمہ) "اے اللہ مجھے عذاب نہ کر' کیونکہ جو کچھ مجھ سے ہو چکا ہے
میں اس کا اقرار کرتا ہوں۔"

اسی طرح رضی شرح قافیہ باب موصول بیان ذوالطائیہ میں ہے

فَإِنَّ الْمَآءَ مَاءُ أَبِیْ وَجَدِّیْ
وَ بِئْرِیْ ذُوْ حَفَرْتُ وَ ذُوْ طَوَيْتُ

(ترجمہ) کیونکہ وہ پانی تو میرے باپ دادا کا ہے اور کنواں بھی میرا
ہے جو میں نے کھودا اور سنوارا تھا۔"

اس شعر میں بنی طے کی لغت پر ذُوْ بمعنے اَلَّذِیْ ہے۔ اور غیر جاندار کے لئے مستعمل ہوا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ آیت زیر بحث میں اَلَّذِیْنَ سے کفار مکہ کے بت مراد لینے محاورۂ عرب کے خلاف نہیں۔ اگر کہا جائے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عام ہے' چاہے جاندار ہو چاہے بے جان۔ سب کے لئے بولا جاتا ہے۔ پس اس میں کفار مکہ کے بت بھی شامل ہیں۔ اور ان کے سوائے اور بھی مثلاً حضرت مسیح اور عزیر علیہما السلام اور دیگر باطل معبود جو کسی قوم نے ٹھہرایا ہو۔ کیونکہ اس آیت میں دو لفظ اموات اور غیر احیاء فرمائے گئے ہیں۔ یعنی جو جاندار اللہ کے سوائے معبود مانے گئے ہیں۔ ان کے لئے تو اموات فرمایا۔ پس اس میں حضرت مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور دیگر جاندار آ گئے۔ اور غیر احیاء میں بے جان معبود بت وغیرہ آ گئے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک کلمہ من دون اللہ عام ہے جاندار

اور بے جان دونوں پر بولا جاتا ہے اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوائے ہر قسم کے باطل معبودوں کی تردید ہے لیکن اس آیت کی رو سے یہ کہنا کہ وہ سب جاندار و ذوی العقول معبود جن کو لوگ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں۔ اس آیت کے نزول کے وقت مردہ تھے۔ یا فی الحال مرے ہوئے ہیں۔ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے وقت کفار مکہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں یہ مضمون کئی مقامات پر مذکور ہے۔ حالانکہ فرشتے جن کو کفار پکارتے تھے۔ اس آیت زیر بحث کے نزول کے وقت زندہ تھے اور اب تک زندہ ہیں۔ پس اگر اس آیت کی رو سے جملہ معبودات باطلہ فی الحال مردہ ثابت ہوتے ہیں۔ تو فرشتوں کی نسبت کیا جواب ہوگا۔ جیسا کہ پ ۱۴ ع ۱۳۔ اور نیز پ ۲۵ ع ۷۔ اور نیز پ ۲۳ ع ۹۔ اور پ ۲۷ ع ۴۔ میں مذکور ہے کہ کفار مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

دیگر یہ کہ اگر کوئی شخص یا قوم اس وقت کسی زندہ شخص کو معبود قرار دے لے۔ تو اس کو اس آیت کی رو سے جیتے جی کس طرح مردہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ پس آیت اپنے مطلب میں غیر کافی رہے گی۔ جس سے قرآن شریف پاک ہے۔

اموات کے متعلق اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوائے ان سب معبودوں پر جو اس وقت مردہ ہیں اور جو اس وقت زندہ ہیں۔ دونوں پر صادق آ سکتا ہے۔ فوت شدوں پر اس طرح کہ وہ موت چکھے ہوئے ہیں۔ اور مردہ خدائی کے لائق نہیں۔ اور جو زندہ ہیں۔ ان پر اس طرح کہ جو آخر کار مر جائے گا۔ وہ بھی خدائی کے لائق نہیں کیونکہ جو اپنی بقا اور زندگی پر قادر نہیں وہ کس طرح معبود ہو سکتا ہے۔ دیکھیے قرآن شریف میں زندوں پر بھی میت کا لفظ آیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان سب کو انجام کار موت پہنچنی ہوگی۔ جیسا کہ فرمایا اللہ سبحانہ نے سورۃ زمر میں کہ:۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ. (زمر پ۲۳ ع اخیر)(۳۹:۳۱)

''تو بھی میت ہے۔اور یہ (کافر) بھی میت ہیں۔''

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو میّت کہا گیا ہے حالانکہ آپ ﷺ اس آیت کے نزول کے وقت صفحۂ دنیا پر موجود تھے اور اسی طرح آپ ﷺ کے مخالفین کفار کو بھی میّت کہا گیا ہے حالانکہ وہ بھی زندہ موجود تھے۔پس زندوں پر بھی اس لحاظ سے میّت کا لفظ بولنا جائز ہے کہ وہ سب انجام کار اپنے مقررہ وقت پر مر جائیں گے۔پس اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام اس آیت زیر بحث کے حکم میں اس لحاظ سے داخل ہیں۔کہ وہ بھی آخر کار مر جائیں گے۔جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے نہ اس لحاظ سے کہ وہ اس وقت یا اس آیت کے نزول کے وقت مر چکے تھے۔حاشا وکلا۔قرآن شریف کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے۔اس آیت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی وموت ہردو سے کوئی تعلق نہیں۔کیونکہ لفظ میّت کا اطلاق جیسا کہ ہم نے قرآن شریف سے ثابت کر دکھایا ہے۔مردوں اور زندوں دونوں پر جائز ہے۔پس اگر کسی خارجی دلیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ثابت ہے تو بے شک آپؑ اس آیت میں اس لحاظ سے داخل ہیں۔کہ آپ مر چکے ہیں۔لیکن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کسی خارجی دلیل سے ثابت نہیں۔اس لئے آپ علیہ السلام مرے بھی نہیں۔اور اگر کسی خارجی دلیل سے آپ کی حیات ثابت ہے تو بے شک آپ اس آیت میں اس لحاظ سے داخل ہو سکتے ہیں۔کہ آپ آخر کار مر جائیں گے۔اور چونکہ آپ کی زندگی قرآن وحدیث ہردو سے ثابت ہے جیسا کہ اس کتاب کا پہلا حصہ بلند آواز سے شہادت دے رہا ہے۔اس لئے آپ ابھی مرے نہیں۔

پس مرزا صاحب کا اس آیت زیر بحث کو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کی دلیل سمجھنا عجب طرح کی الٹی منطق اور غلط استدلال ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ نے اس آیت کے حکم میں فرشتوں کو بھی داخل کیا

ہے۔ اور اس کی وجہ یہی بتائی ہے کہ آخر کار وہ بھی مرجائیں گے۔ چنانچہ فرمایا کہ

(الثالث ان یکون المراد بقوله والذین یدعون من دون الله

الملائکة و کان ناس من غیر احیاء ای غیر باقیة حیاتهم۔

(تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۳۱۱)

تیسرا جواب یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد فرشتے ہیں اور کفار میں سے کئی لوگ ان کی بھی پرستش کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اموات ہیں۔ یعنی موت سے ان کو بھی بچاؤ نہیں وہ غیر احیا ہیں۔ یعنی ان کی زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔"

قسم سوم میں سے بارھویں آیت یہ ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ.

(۲۱ سورہ روم)

"یعنی اللہ وہ ہے، جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم کو رزق دیا۔ پھر تم کو مارے گا۔ پھر تم کو زندہ کرے گا۔" (۴۰:۳۰)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون قدرت بتلایا ہے کہ انسان کی زندگی میں صرف چار واقعات ہیں۔ پہلے وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر تکمیل اور تربیت کے لئے روحانی اور جسمانی طور پر رزق مقسوم اسے ملتا ہے۔ پھر اس پر موت وارد ہوتی ہے۔ پھر وہ زندہ کیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان آیات میں کوئی ایسا کلمہ استثنائی نہیں جس کے رو سے مسیح کے واقعات خاصہ باہر رکھے گئے ہوں۔

قسم سوم میں سے تیرھویں آیت یہ ہے:

اَیْنَمَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ.

(پ ۵ نساء)

"یعنی جس جگہ بھی تم ہو۔ اسی جگہ تمہیں موت پکڑے گی۔ اگرچہ تم

بڑے مرتفع برجوں میں بود و باش اختیار کرو۔'' (۷۸:۴)

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ''چونکہ اس آیت میں حضرت مسیح کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس لئے حضرت مسیح مرگئے۔''

ان آیتوں سے جس طریق سے مرزا صاحب نے استدلال کیا ہے۔ اس کا تفصیلی رد اور جواب صفحہ ۳۰۷ سے ۳۰۹ تک گذر چکا ہے کہ استثنا کے لئے ضروری نہیں کہ اسی عبارت میں موجود ہو' بلکہ قرآن شریف میں جہاں کہیں کسی امر کی تصریح پائی جائے اور وہ کسی حکم عام کے خلاف نظر آئے تو وہ اس عام حکم سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی نظیریں بھی گذر چکی ہیں' اور آپ کا یہ کہنا کہ انسان کے لئے یہ چاروں مراتب ہیں۔ اور اس سے عمر طبعی کے الحاد کا استدلال کرنا۔ سو یہ بھی اچھی طرح سے باطل ثابت ہو چکا ہے اور اگر بالفرض یہ آیتیں کسی طرح اشارۃً یا دلالۃً حضرت مسیح علیہ السلام کی موت پر دلالت کریں بھی' تو بھی بمقابلہ ان تصریحات کے جو آیات اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ اور وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتَابِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ میں آپ کی زندگی اور رفع آسمانی کے بارے میں موجود ہیں۔ کچھ مفید نہیں۔ کیونکہ دلیل خاص دلیل عام پر مقدم ہوتی ہے۔ اور عبارت النص کے مقابلے میں اشارۃً اور دلالۃً اعتبار نہیں ہوتا اور اسی طرح منطوق کے مقابلہ میں مفہوم کو پیش نہیں کر سکتے۔

قسم سوم میں سے چودھویں آیت یہ ہے:۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. (الفجر پ ۳۰) (۸۹: ۲۷-۳۰)

مرزا صاحب اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:۔

''اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر اس کے بعد میرے ان بندوں میں داخل ہو جا۔ جو دنیا کو چھوڑ گئے ہیں اور میری بہشت کے اندر آ۔''

اور پھر اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر اس طرح استدلال کرتے ہیں:-

''اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ انسان جب تک فوت نہ ہو جائے۔ گذشتہ لوگوں کی جماعت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن معراج کی حدیث سے جس کو بخاری نے بھی مبسوط طور پر اپنے صحیح میں لکھا ہے۔ ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم فوت شدہ نبیوں کی جماعت میں داخل ہے۔ لہٰذا حسب دلالت صریحہ اس نص کے مسیح ابن مریم کا فوت ہو جانا ضروری طور پر ماننا پڑا۔''

قسم سوم میں سے پندرھویں آیت یہ ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَى أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ.

(انبیاء پ ۱۷۔ ۲۱: ۱۰۱، ۱۰۲)

مرزا صاحب اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:-

''جو لوگ جنتی ہیں اور ان کا جنتی ہونا ہماری طرف سے قرار پا چکا ہے وہ دوزخ سے دور کیے گئے ہیں۔ اور وہ بہشت کی دائمی لذات میں ہیں۔''

اور پھر کہتے ہیں:-

''اس آیت سے مراد حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام ہیں اور ان کا بہشت میں داخل ہو جانا اس سے ثابت ہوتا ہے۔ جس سے ان کی موت بھی بپایہ ثبوت پہنچتی ہے۔''

قسم سوم میں سے سولھویں آیت یہ ہے:-

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ. (پ ۲۷ قمر) (۵۴: ۵۴، ۵۵)

مرزا صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

''یعنی متقی لوگ جو خدا تعالیٰ سے ڈر کر ہر ایک قسم کی سرکشی کو چھوڑ دیتے ہیں وہ فوت ہونے کے بعد جنات اور نہر میں ہیں۔ صدق کی نشست گاہ میں با اقتدار بادشاہ کے پاس۔''

''فوت ہو جانے کے بعد مرزا صاحب نے از خود بڑھایا ہے۔ قرآن شریف میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں۔''

ان تینوں آیتوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کرنے کے جواب میں اوّل تو یہی کافی ہے۔ کہ ان آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کا ذکر نہیں ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی رائے و قیاس سے نتیجہ نکالا ہے۔ اور ان کا یہ قیاس ان آیات کے منطوق کے خلاف ہے۔ جو خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور نزول ثابت کر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ استدلال درست نہیں۔ لیکن تفصیلی جواب یہ ہے کہ بہشت میں داخل ہونا روز قیامت کو ہوگا نہ کہ مرنے کے ساتھ ہی۔ اگر یہ درست ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی بہشت میں دخول ہو جاتا ہے۔ تو پھر قیامت کس لئے ہے؟ پس یہ آیتیں مرزا صاحب کو کسی طرح بھی مفید نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو لوگ جنتی ہیں ضرور نہیں کہ وہ اس وقت بھی مردہ ہوں۔

- مرزا صاحب نے پہلی آیت کے ساتھ حدیث معراج کو ملا کر جو استدلال کیا ہے۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اوّل تو مرزا صاحب معراج جسمانی کے منکر ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنے ازالہ میں لکھتے ہیں۔ ''سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا۔'' (ازالہ اوہام)

دیگر یہ کہ مرزا صاحب نے معراج کی سب حدیثوں پر نظر نہیں کی۔ اگر کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا۔ کہ بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی زبان مبارک سے نزول ثانی کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفاً اور مسند امام احمد میں مرفوعاً صحیح سند

شہادت القرآن

سے مروی ہے کہ:

عن عبداللّٰہ ابن مسعود قال لما کان لیلۃ اُسری برسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم لقی ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ فتذاکروا الساعۃ فبدؤا بابراھیم فسألوہ عنھا فلم یکن عندہ منھا علم ثم سالوا موسیٰ فلم یکن عندہ منھا علم فرُدَّ الحدیث الٰی عیسی ابن مریم فقال قد عھد الیّ فیما دون وجبتھا فاما وجبتھا فلا یعلمھا الا اللّٰہ فذکر خروج الدجال قال فانزل فاقتلہ (الحدیث) (سنن ابن ماجہ باب فتنۃ الدجال وخروج عیسیٰ بن مریم وخروج یاجوج وماجوج ص ۳۰۹)

جس رات رسول اللہ ﷺ کو معراج کرایا گیا۔ اس رات آپ نے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام (اولوالعزم پیغمبروں) سے ملاقات کی۔ تو ان سب میں قیامت کی بابت ذکر چلا۔ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ آپ کو قیامت کے وقوع کی بابت کوئی خبر نہ تھی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا۔ آپ کو بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی باری آئی۔ تو آپ نے کہا کہ ہاں قیامت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا مجھ سے عہد ہے لیکن قیامت کے واقع ہونے کا وقت سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں پھر آپ نے دجال کا ذکر کیا اور کہا پھر میں نازل ہوں گا اور اس کو قتل کروں گا۔" (الحدیث)

اس حدیث سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ﷺ سے اپنے قرب قیامت میں نازل ہونے کی بابت ذکر کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب چاہے کیسے استدلال پیش کریں اور نصوص کو چاہے کیسے بعید احتمال سے رد کریں۔ اس حدیث کی تصریح کے مقابلہ میں ان کے مفید مطلب کوئی

بات بن نہیں پڑتی۔

اگر کہا جائے کہ اس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام تینوں سے ملاقات کی تو بہرحال تینوں کو ایک حال میں ماننا پڑے گا۔ خواہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کو عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ مانو۔ خواہ عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی طرح فوت شدہ تسلیم کرو۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملاقات تین طرح پر ہوتی ہے۔ اوّل ہر دو جانب سے بدنی ملاقات ومصاحبت ہو۔ دوم یہ کہ ہر دو جانب سے روحانی ہو۔ سوم یہ کہ ایک طرف سے روحانی اور دوسری طرف سے بدنی۔ سو معراج کی رات میں رسول اللہ ﷺ پر یہ تینوں کیفیتیں پوری کی گئیں۔ تا کہ آپ کو ہر طرح کا کمال حاصل ہو۔ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام سے آپ کو قسم سوم کی ملاقات ہوئی۔ یعنی آپ کی طرف سے بدنی ملاقات تھی۔ اور ان کی طرف سے روحانی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو معراج جسم مبارک کے ساتھ کرایا گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ اور رسالہ سُلَّمُ الْوُصُوْلِ اِلٰی اَسْرَارِ اِسْرَآءِ الرَّسُوْلِ میں بڑی تحقیق و تدقیق سے ثابت کیا گیا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات قرآن و حدیث صحیح بخاری سے ثابت ہے۔ پس حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرف سے روحانی ملاقات تھی۔ اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے جسمانی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی آپس میں قسم دوم کی ملاقات تھی۔ یعنی دونوں طرف سے روحانی اور ان کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی ﷺ کی طرح قسم سوم کی ملاقات تھی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی جسمانی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ جیسا کہ اسی کتاب کا پہلا حصہ بآواز بلند قرآنی شہادت سے پکار رہا ہے۔ باقی رہی آنحضرت ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ملاقات۔ سو یہ قسم اوّل میں سے تھی۔ یعنی دونوں طرف سے جسمانی۔ کیونکہ حضرت رسول اللہ ﷺ اور حضرت روح اللہ علیہ السلام دونوں کا

معراج جسمانی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ پس معترض کا اعتراض باطل ہوا۔ ملاقات کی تقسیم جو اوپر کی گئی ہے۔ مرزا صاحب کی طرح از خود نہیں بنائی گئی بلکہ اہل اللہ کے نزدیک مسلم ہے۔ اور حدیث صحیح بخاری سے ماخوذ ہے اور وہ حدیث یہ ہے:۔

عن ابن عباس قال مرالنبی صلّی اللّٰه علیه وسلّم بقبرین فقال انهما لیُعَذَّبَانِ وما یعذبان فی کبیرٍ اَمّا احدهما فکان لا یستتر من البول و امّا الاخر فکان یمشی بالنمیمة ثم اخذ جریدة رطبةً فشقها نصفین فغرز فی کل قبر واحدة۔ قالوا یا رسول اللّٰه لم فعلت قال لعله یخفف عنهما ما لم یَیبسا۔ (صحیح بخاری کتاب الوضوء)

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دو قبروں کے پاس سے گذرے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان مردوں کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور جس گناہ کی بابت ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ اس سے بچنا کوئی بڑی بات نہیں ایک تو پیشاب سے پرہیز نہیں کیا کرتا تھا۔ اور دوسرا چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ پھر آپؐ نے ایک ہری ٹہنی لی۔ اور اس کے دو ٹکڑے کئے ایک کو ایک قبر پر گاڑا اور دوسرے کو دوسری پر۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جو ساتھ تھے انہوں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ۔ آپ نے کس لئے ایسا کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا امید ہے کہ جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہو جائیں ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔"

یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے۔ پس یہ متفق علیہ ہونے کی وجہ سے اول درجہ کی صحیح حدیث ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ قسم اوّل کی ملاقات تھی۔ یعنی ہر دو جانب سے بدنی مصاحبت تھی۔ اور ان مردوں کے ساتھ قسم سوم کی۔ یعنی آپ ﷺ کی طرف سے بدنی تھی۔ اور ان کی

طرف سے روحانی۔

اسی طرح جنگِ بدر کے مقتول کافروں کو جب گڑھے میں ڈالا گیا۔ تو آپ ﷺ نے کنارے پر کھڑے ہو کر ان کے نام مع ولدیت کے پکار کر کہا کہ کیا اب تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے یا نہیں؟ کہ تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا دیکھ لیا۔ کیا تم نے بھی وہ وعدہ جو عذاب کے بارے میں تم سے کیا جاتا تھا سچا پا لیا یا نہیں؟ جب آپ ﷺ نے ان لاشوں سے ایسی باتیں کیں۔ تو پاس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایسے جسموں سے باتیں کرتے ہیں۔ جن میں روح نہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے تم اس بات کو جو میں ان سے کہتا ہوں۔ ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ ''یعنی وہ اس وقت یہ سب صاحب حال ہونے کے میری بات کو بالکل حق الیقین کے مرتبے پر سنتے ہیں۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی آواز ان کو بطور معجزہ کے سنا دی۔''

یہ حدیث صحیح بخاری کی ہے اور اس سے بھی تقسیم مذکور واضح ہے۔ پس مرزا صاحب کا آیات زیر بحث کے ساتھ حدیث معراج کو ملا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وہم کرنا صحیح نہیں۔

قسم سوم میں سے سترھویں آیت اور مرزا صاحب کی ترتیب کی اکیسویں آیت یہ ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ.

''یعنی محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے۔ مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا نبیوں کا۔'' (احزاب پ۲۲) (۳۳:۴۰)

اس آیت کے تحت مرزا صاحب لکھتے ہیں:۔

''یہ آیت بھی صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی ﷺ کے

کوئی رسول دنیا میں نہیں آئے گا۔ پس اس سے بھی بکمال وضاحت ثابت ہے کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ دنیا میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ مسیح ابن مریم رسول ہے اور رسول کی حقیقت اور ماہیت میں یہ امر داخل ہے کہ دینی علوم کو بذریعہ جبرئیل حاصل کرے۔ اور ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب وحی رسالت تا قیامت منقطع ہے۔ اس سے ضروری طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسیح ابن مریم ہرگز نہیں آئے گا اور یہ امر خود مستلزم اس بات کو ہے کہ وہ مر گیا۔"

مرزا صاحب کا یہ استدلال حضرت مسیح کی موت اور ان کے نازل نہ ہونے کے بارے میں تو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ مرزا صاحب کا استدلال محض قیاسی ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی اور زندگی اور نزول قطعی دلائل سے ثابت ہے۔ ہاں اس آیت سے مرزا صاحب کا دعویٰ نبوت ضرور جھوٹا ثابت ہوتا ہے' جیسا کہ ان شاء اللہ مذکور ہوگا۔

مرزا صاحب کا اس آیت سے منشا یہ ہے۔ کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں۔ تو یا تو آپ منصب نبوت سے معزول ہو کر آئیں گے۔ یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہ رہیں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی جدید نبی منع ہے جیسا کہ آپ کے بعد مرزا صاحب اور آپ کے دوسرے ہم مشربوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اگر کوئی پچھلا نبی جس کو آپ سے پیشتر نبوت مل چکی ہو۔ پھر آئے تو وہ اس کی رو سے منع نہیں۔ جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ ان کو آپ ﷺ سے پیشتر نبوت مل چکی ہوئی ہے۔ اور جب پھر نازل ہوں گے۔ تو ان کی نبوت وہی ہوگی۔ جو پہلے تھی نہ کہ مرزا صاحب کی طرح نئی نبوت۔ احادیث نبویہ ﷺ سے ایسا ثابت ہے۔ چنانچہ مسند امام احمد میں ہے کہ:-

عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُولَ بَعْدِي وَلَا نَبِيَّ. (مسند امام احمدؒ)

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک رسالت اور نبوت ختم ہو چکی ہے۔ پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا نہ کوئی نبی۔"

مسند امام احمد میں بروایت حضرت ابی بن کعب ایک اور حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ کہ "میری مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص ایک حویلی تعمیر کرائے۔ مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ جائے۔ (جب لگے تو وہ حویلی پوری ہو) پس میں پیغمبروں میں اس آخری اینٹ کی مانند ہوں۔" (صحیح بخاری ملخصاً)

ان احادیث اور ان کی مانند دوسری احادیث کو زیر نظر رکھنے سے صاف کھل جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے ہیں کہ مجھے نبوت عطا ہونے کے بعد اب کسی اور شخص کو منصب نبوت نہیں ملے گا۔ نیز مفسرین علیہم الرحمۃ نے اس خدشہ کو اسی طرح دور کیا ہے چنانچہ تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں آیت خاتم النبیین کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ

ولا يقدح فيه نزول عيسى بعده عليهما السلام لان معنى كونه خاتم النبيين انه لا يُنَبَّأُ احد بعده و عيسى ممن نُبِّيءَ قبله و حين ينزل انما ينزل عاملا على شريعة محمد صلى الله عليه وسلم مصليًا الى قبلته كانه بعض اُمته.

"آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام تو ان میں سے ہیں۔ جو آپ ﷺ سے پہلے نبی بنائے گئے ہیں دیگر یہ کہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ﷺ ہی کی شریعت پر عمل کریں گے اور آپ ﷺ ہی کے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز

پڑھیں گے گویا وہ آپ ﷺ کی امت میں سے ہیں۔" (پس اس لحاظ سے بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوا۔)

اسی طرح دیگر تفاسیر میں ہے۔ مثلاً بیضاوی۔ خازن۔ مدارک اور فتح البیان۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت میں کچھ حرج ہوتا ہے۔ تو کیا مرزا صاحب کے دعوائے نبوت سے حرج نہیں ہوتا اور اگر مرزا صاحب بروز کا (جو باطل ہے) عذر کر کے اس زد سے بچ سکتے ہیں۔ تو کیا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ عذر کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے نبی ہیں' اور آیت میں اور حدیث میں کسی نئے نبی کی بابت نفی ہے صحیح نہیں؟ انصاف! انصاف!! انصاف!!!

اگر عدل و انصاف سے سوچا جائے۔ تو جس صورت سے مرزا صاحب نے اور آپ کے متقدمین دجالوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ قرآن و حدیث میں اسی کی تردید ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آیا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ میری امت میں سے قریباً تیس دجال نہ ہو لیں۔ جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا۔ کہ میں اللہ کا رسول ہوں" اس حدیث کو حدیث لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اور آیت خاتم النبیین کے ساتھ رکھ کر انصاف کریں۔ تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مرزا صاحب کا دعوائے نبوت وہ ہے۔ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مدعیانِ نبوت کو دجال اور کذاب کہتے ہیں۔ پس آیت زیر بحث کی رو سے آپ کا دعویٰ غلط نکلا' نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے انکار میں مرزا صاحب کے پاس کوئی معقول وجہ اور دلیل نہیں۔ صرف شکوک و شبہات ہیں۔ جن سے لوگوں کو بہکاتے ہیں۔ اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک یہ شبہ بھی ڈالا کرتے ہیں۔ کہ جب عیسیٰ علیہ السلام پھر نازل ہوں گے۔ تو کیا ان کی نبوت چھن جائے گی؟ اور وہ کس شریعت پر عمل کریں گے؟ عیسوی شریعت پر یا محمدی پر؟ تو اس کا جواب یہ ہے

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت چھینی نہیں جائے گی۔ کیونکہ اہل سنت کے نزدیک نبوت ایک ایسا منصب ہے۔ جو چھینا نہیں جاتا۔ (دیکھو تمہید ابی الشکور سالمی) اور نہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت منسوخ ہوگی۔ بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی اپنی پچھلی نبوت سے نازل ہوں گے۔ اور شریعت محمدی ﷺ پر عمل کریں گے اور اسی کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اس کی حکمت اور راز پہلے حصہ کے ص ۲۴۳ پر بیان ہو چکا ہے نیز یہ کہ ایک وقت میں دو نبیوں کا ہونا اور ایک کا امام ہونا اور دوسرے کا تابع ہونا ممتنع نہیں۔ بلکہ قرآن شریف سے بالتصریح ثابت ہے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام دونوں ایک وقت میں ہوئے ہیں۔ اور دونوں نبی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اصل صاحب شریعت اور امام تھے۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے تابع اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں فرمایا

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا.

(فرقان پ ۱۹)

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) دی۔ اور اس کے ساتھ اس کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر بنایا۔ (۲۵:۳۵)

اسی طرح سورہ اعراف میں فرمایا کہ

وَقَالَ لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ. (اعراف پ ۹)

کہ جب موسیٰ علیہ السلام حسب وعدۂ الٰہی کوہ طور پر جانے لگے تو اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو کہنے لگے کہ میرے بعد میری قوم میں میرا خلیفہ رہنا۔ (۷:۱۴۲)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ اور قوم کو صرف اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت ہارون علیہ السلام بھی نبی تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا. (مریم پ ۱۶)

"ہم نے موسیٰ کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارونؑ نبی کر کے بخشا۔" (۱۹:۵۳)

اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت لوط علیہما السلام دونوں ایک وقت میں ہوئے ہیں۔ اور دونوں نبی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اصل صاحب شریعت اور امام تھے۔ اور حضرت لوط علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے ان کے تابع تھے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کی نبوت ورسالت کی بابت فرمایا:

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ. (الصافات پ ۲۳)

یعنی "بے شک حضرت لوطؑ بھی رسولوں میں سے ہیں۔" (۳۷:۱۳۳)

اور ان کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہونے کی بابت فرمایا:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ. (عنکبوت پ ۲۰)

یعنی "(حضرت) لوط (حضرت) ابراہیم (علیہما السلام) پر ایمان لائے۔" (۲۹:۲۶)

اسی طرح حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام دونوں ایک وقت میں نبی تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام تھے۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے تابع تھے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات میں فرمایا:

مُصَدِّقًاۢ بِکَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ. (آل عمران پ ۳)

یعنی "حضرت یحییٰ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔" (۳:۳۹)

پس اسی طرح جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے۔ تو اس وقت شریعت محمدی ﷺ منسوخ نہیں ہو جائے گی۔ بلکہ اصل صاحب شریعت اور امام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ ﷺ کے خلیفہ اور وزیر اور تابع بھی ہوں گے۔ اور نبی بھی ہوں گے۔ اسی لئے صحیح مسلم

کی حدیث جو حضرت نواس بن سمعان کی روایت سے ہے۔ اس میں آپ کو چار دفعہ نبی اللہ کہا گیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ وہ ایسے نبیوں کی بابت ہے جو ایک زمانے میں دنیا پر موجود تھے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صورت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ نبی ﷺ دنیا میں تشریف نہیں رکھتے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صورت میں تو یہ امر بطریق اولیٰ جائز ہے۔ کیونکہ جب حقیقۃً دو نبی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ تو زمانہ اور زندگی کے لحاظ سے یہ کیوں منع ہے۔ یعنی یہ کہ ایک تو باعتبار زمان نبوت کے ہو۔ اور دوسرا اپنی حقیقی زندگی سے موجود ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لو آپ کی تسلی کے لئے ہم یہ امر بھی قرآن شریف سے ثابت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ. (بقرہ پ۱)

ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی اور اس کے بعد اس کے قدم بقدم کئی رسول بھیجے۔ (۲:۸۷)

اسی طرح سورہ مائدہ میں فرمایا:-

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا. (مائدہ پ۶)

"ہم نے توریت نازل کی' اس میں ہدایت اور نور تھا۔ اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ خدا کے فرمانبردار نبی۔" (۵:۴۴)

ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ شریعت موسوی کے تابع کئی رسول مبعوث کیے گئے۔ اور وہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ہوئے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے آئین و شریعت پر کئی نبیوں کے ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہو کر دنیا میں زندہ موجود ہونے میں کوئی فرق نہیں' اور رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے نازل ہونے کی حکمت اور ضرورت پہلے باب کے ص ۲۳۹ و ۲۴۰ میں گذر چکی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ پر نبوت ختم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت نہیں ملے گی۔ نہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو آپ ﷺ سے پیشتر نبوت مل چکی ہوئی ہے۔ نہیں آئیں گے۔ بلکہ اس آیت سے مرزا صاحب کی نبوت صاف جھوٹی ثابت ہوتی ہے۔ اور ان لوگوں جیسی ہے۔ جن کو رسول اللہ ﷺ نے دجال اور کذاب کہا ہے اور ان کی تعداد تیس کے قریب بتلائی ہے۔ جن میں سے بہت سے گذر چکے ہیں۔

قسم سوم میں سے اٹھارہویں آیت یہ ہے۔

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (پ ۱۷ ع ۱)(۲۱:۷)

مرزا صاحب اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

یعنی اگر تمہیں ان بعض امور کا علم نہ ہو جو تم میں پیدا ہوں تو اہل کتاب کی طرف رجوع کرو اور ان کی کتابوں کے واقعات پر نظر ڈالو تا کہ اصل حقیقت تم پر منکشف ہو جائے۔ سو جب ہم نے موافق حکم اس آیت کے اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا اور معلوم کرنا چاہا۔ کہ کیا اگر کسی نبی گذشتہ کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہو۔ تو وہی آ جاتا ہے یا ایسی عبارتوں کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اسی امر متنازعہ فیہ کا ہمشکل ایک مقدمہ حضرت مسیح ابن مریم آپ ہی فیصل کر چکے ہیں۔ اور ان کے فیصلے کا ہمارے فیصلے کے ساتھ اتفاق ہے۔ دیکھو کتاب سلاطین و کتاب ملاکی نبی اور انجیل جو ایلیا کا دوبارہ آسمان سے اترنا کس طور سے حضرت مسیح نے بیان فرمایا ہے۔'' انتہی بالفاظہ۔

مرزا صاحب کی عبارت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اہل کتاب کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم کرتا ہے۔ پس اس آیت کے حکم سے ہم نے بائبل پر نظر کی۔ تو اس میں حضرت ایلیا کا آسمان سے اترنا پایا۔ مگر اس کی صورت حضرت مسیح نے

یہ بیان فرمائی۔ کہ ایلیا کا آنا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے پورا ہو گیا۔ پس اسی طرح احادیث میں جو حضرت مسیح علیہ السلام کا آسمان سے اترنا آیا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ کوئی شخص مثیل مسیح آئے گا۔ چنانچہ وہ میں آ گیا ہوں اور حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب کا استدلال بالکل غلط ہے اور وہ آیت کے صحیح مطلب کو ہرگز نہیں سمجھے۔ اس آیت زیر بحث کی صحیح تفسیر ان شاء اللہ تعالیٰ ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے مرزا صاحب کو مراد کے موافق فرض کر کے ان کے استدلال کو غلط ثابت کرتے ہیں۔

اوّل:۔

اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اہلِ کتاب کی طرف رجوع کرنے کا حکم اس شرط سے کیا ہے۔ کہ ہم کو اپنی شریعت میں وہ بات معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ صاف ارشاد فرمایا:

اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

”یعنی اگر تم نہیں جانتے۔“

پس جب آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ حقیقی اور رفعِ آسمانی اور نزولِ عینی ثابت ہے۔ اور ہمیں اس میں کوئی تردد اور بے علمی کا خدشہ نہیں۔ تو ہم اہل کتاب کی کتابوں کی طرف کیوں رجوع کریں۔ کیا آسمانی اور حق اور محفوظ اور غیر محرف کتاب کو چھوڑ کر بندوں کی بنائی ہوئی اور محرف کتابوں کے پیچھے لگنا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ کا مصداق نہیں (یعنی کیا تم بہتر چیز کے بدلے میں ادنیٰ چیز کو لیتے ہو)۔ (بقرہ پ۱) (۶۱:۲)

دوم:۔

اس طرح کہ الیاس علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور وہاں سے پھر اترنے کا مسئلہ قرآن و حدیث سے کہیں بھی ثابت نہیں۔ نہ حقیقۃً اور نہ مثالاً۔ پس مرزا

صاحب اس پر اپنی مماثلت کی بنا نہیں رکھ سکتے۔ قرآن شریف سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی بابت کبھی کوئی پیشگوئی نہیں کی گئی۔ یہ یہودیوں کا منگھڑت عذر تھا اور نیز یہ بھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے مثیل نہ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کی تعریف ان لفظوں سے سنائی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ. (آل عمران پ۳)(۳:۳۹)

(اے زکریا علیہ السلام!) اللہ تعالیٰ تجھ کو ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے۔ جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ وہ کلمۃ اللہ کی (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی جوان سے بعد پیدا ہوئے) تصدیق کرنے والا ہوگا اور اپنی قوم کا سردار ہوگا۔ اور عورتوں سے علیحدہ رہنے والا اور بہت پاکباز ہوگا اور صالحین انبیا میں سے ہوگا۔"

پس اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت الیاس علیہ السلام کے نزول کی پیشگوئی ہوئی ہوتی۔ اور اس کا پورا ہونا حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے ہوتا تو یہ امر حضرت زکریا علیہ السلام کو ضرور معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس وقت آپ ہی بوجہ نبی ہونے کے کامل العلم تھے۔ اور دوسرے لوگ آپ کے علم کے محتاج تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت یوں سناتا کہ یہ وہ مولود مسعود ہے۔ جو مدتوں سے منتظر وموعود ہے۔ تاکہ حضرت زکریا علیہ السلام اپنے بیٹے سے اس پیشگوئی کے پورا ہونے سے زیادہ خوش ہوں۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے باوجود سبب کے موجود ہونے کے اس امر کا ذکر نہیں کیا۔ تو معلوم ہوا کہ نہ الیاس علیہ السلام کا نزول خدا کی طرف سے بتلایا گیا تھا۔ اور نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ان کا مثیل ہونا درست ہے۔

اسی طرح سورت مریم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفت میں فرمایا:

لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا. (مریم پ۱۶)(۱۹:۷)

یعنی ہم نے اس سے پیشتر اس کا ہمنام بنایا ہی نہیں"
سَمِیّ کے معنی نظیر وشبیہ اور مثیل کے بھی ہیں۔ جیسا کہ اسی سورت میں آگے آتا ہے۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (مریم پ ۱۶) (۱۹: ۶۵) یعنی "کیا تو کوئی ایسا شخص جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا نظیر ہو۔" پس جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پیشتر ان کا ہمنام و مثیل بنایا ہی نہیں۔ تو اب مرزا صاحب ان کو حضرت الیاس علیہ السلام کا مثیل کس طرح قرار دیتے اور کس طرح اس پر اپنے دعوائے مماثلت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔

سوم:-

اس طرح کہ انجیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نہ تو مثیل الیاس علیہ السلام ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ وہ تھے۔ بلکہ یہودیوں کے پوچھنے پر اس سے صاف انکار کیا۔ جیسا کہ انجیل یوحنا باب اول میں آیت ۱۹ سے ۲۱ تک لکھا ہے

> "(۱۹) اور یوحنا کی گواہی یہ تھی۔ جب کہ یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا ہے کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے۔ (۲۰) اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ مسیح علیہ السلام نہیں ہوں۔ (۲۱) تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا۔ میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ نہیں۔"

اس عبارت اور اس سے بعد کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کا انجیلی نام یوحنا ہے۔ کاہنوں کے سوال پر اپنے مثیل الیاس ہونے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ پس مرزا صاحب کا دعوائے مماثلت بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر یہ عذر کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے اعتراض پر حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشین گوئی کے پورا ہونے کی بابت حضرت یحییٰ علیہ السلام کا آنا پیش کیا تھا۔ تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ یہ انجیل سے ثابت نہیں۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے اپنی زبان سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پیش کیا۔ دوم اگر تسلیم بھی کر لیں۔ تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اپنے انکار کے مقابلے میں ہو بہو "مدعی سست گواہ چست" کا معاملہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ خود حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے آپ کو مثیل الیاس قرار دے سکتے تھے۔ اگر کہا جائے کہ کیا پھر حضرت مسیح علیہ السلام نے غلط جواب دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے سمجھا سکتا ہے۔ کہ یہ معاملہ بالکل من گھڑت ہے۔ چہارم اس طرح کہ اگر بالفرض اسے تسلیم بھی کر لیں۔ کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی نسبت پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے آنے سے پوری ہوئی تو پھر بھی یہ ایک نظیر ہی بنے گی۔ نہ کہ علت موجبہ کہ اس کی رو سے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی بھی اسی رنگ میں پوری ہو۔ یہ نکتہ اہل علم پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ دوسرا واقعہ خواہ مخواہ پہلے معاملہ کی مانند ہو۔

اس سارے بیان سے واضح ہو گیا کہ مرزا صاحب نے اپنے دعوائے مماثلت کے متعلق جس امر کو بنا قرار دیا تھا۔ وہ بالکل غلط ہے۔ اور ان کو کسی طرح مفید نہیں۔ پس اس آیت زیر بحث سے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت نہ ہو سکی۔

اب ہم اس آیت فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کا صحیح مطلب بیان کر کے ناظرین کو قرآنی نکتوں سے سرفراز کرتے ہیں۔ اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں کے متعلق ہم صرف وہی کچھ نقل کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ جو کچھ شیخ علی مہائی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:-

> "(اے پیغمبر) ہم نے تو تجھ سے پیشتر جو رسول بھیجا ہے۔ وہ (انسانوں میں سے) مرد ہی تھا اور بشریت اور رسالت میں کس طرح منافات ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رسالت کے لئے تو آسمان سے اترنا شرط نہیں۔ بلکہ صرف اس قدر کافی ہے کہ ہم ان کی طرف فرشتہ بھیجنے سے ان کو وحی کرتے رہے ہیں۔ پس اگر یہ معاملہ شیطان کے نزول سے ملتبس ہو جائے تو تم اہل الذکر کو جو بڑے پائے کے علما ہیں۔ پوچھ دیکھو۔ اگر خود

قصور نظر کے سبب اس میں فرق نہیں جان سکتے۔ اور انبیا پر فرشتے نازل ہونے میں یہ بھی شرط نہیں کہ وہ بشریت سے بالکل باہر ہو جائیں۔ کیونکہ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ جسد یعنی بے جان ہو۔ اور یہ باطل ہے۔ کیونکہ ہم نے ان پیغمبروں کو پتھروں کی طرح بے جان جسم نہیں بنایا کہ کھائیں نہیں۔ کیونکہ جمادات کو ملائکہ سے کوئی نسبت نہیں۔ پس صرف طعام کے ترک کر دینے سے ان کی مناسبت کامل نہیں ہو سکتی اور یا یہ صورت ہے کہ وہ پیغمبر حیات کے کمال کی رو سے ایسے ہوں کہ مریں نہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں۔ (پس کفار کا اعتراض درست نہیں) پیغمبروں کے لئے تو یہی شرط ہے کہ دلائل کی رو سے ان کی سچائی ثابت کی جائے۔ سو ہم نے ایسا کر دیا۔ پھر ہم نے ان کے متعلق اپنے وعدوں کے سچا کرنے سے بھی ان کو سچا ثابت کر دیا کہ ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا اور اس پر یہ دلیل ہے۔ کہ ان کو ہم نے بچا لیا۔ باوجود اس کے کہ وہ بھی ان ہلاک شدوں کے بیچ میں بستے تھے۔ اور ان کے ساتھ کے مومنوں کو بھی بچا لیا۔ (جن کے بچانے کے متعلق ہماری مشیت ہوا کرتی ہے۔)

آیت فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ کے متعلق صحیح تفسیر یہی ہے۔ جو لکھی گئی۔ مرزا صاحب اس کا نہ صحیح مطلب سمجھتے ہیں۔ اور نہ ان کا استدلال صحیح ہے۔ بلکہ اس آیت میں مرزا صاحب کی صریح تکذیب پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ ان وعدوں کا سچا ہونا ضروری فرماتا ہے۔ جو پیغمبروں کے ساتھ ان کے دشمنوں کی ہلاکت کے متعلق کیے جاتے ہیں۔ اور یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ کہ مرزا صاحب جب کسی کو کوئی ڈر سناتے ہیں۔ تو وہ اس سے محفوظ رہتا ہے اور اگر تجربہ سے طاعون کے دنوں میں کچھ ہلچل مچا کر لوگوں کو اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے اپنے مخلص مرید بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جس سے آپ کا جھوٹا ہونا عام لوگوں میں مشہور

اور وہ منسوخ ہو چکا ہے اور اسی طرح کبھی آپ زلزلہ کو دیکھ کر کچھ اپنے تجربہ سے اور کچھ تجربہ کار لوگوں سے سن سنا کر دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کر دیتے ہیں اور مریدوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دیتے ہیں اور خود بھی باہر نکل جاتے ہیں تاکہ آپ کے ایسے فعل اور تاکیدی حکم سے دوسرے لوگوں پر کچھ اثر پڑے۔ مگر نہ زلزلہ آتا ہے اور نہ کچھ اور ہوتا ہے اور مفت میں آپ فضیحت اٹھاتے ہیں۔ بلکہ اس سے لوگ اور آپ کی تکذیب پر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا ایمان سلامت رہتا ہے۔

قسم سوم میں سے انیسویں آیت اور مرزا صاحب کی ترتیب کے رو سے انیسویں آیت یہ ہے:

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.

(سورہ حشر پ ۲۸۔ ۵۹:۷)

''یعنی رسول ﷺ جو کچھ تمہیں علم اور معرفت عطا کرے۔ وہ لے لو اور جس سے منع کرے وہ چھوڑ دو۔''

اس آیت کی رو سے مرزا صاحب نے بعض احادیث نبویہ ﷺ سے استدلال کیا ہے۔ اور اپنی الٹی منطق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مر گئے ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے۔ عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اعمار امتي ما بين الستين الی السبعين و اقلهم من يجوز ذلک رواه الترمذی و ابن ماجه (مشکوٰۃ) یعنی اکثر عمریں میری امت کی ساٹھ سے ستر برس تک ہوں گی اور ایسے لوگ بہت کمتر ہوں گے۔ جو ان سے تجاوز کریں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:-

''یہ ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم اس امت کے شمار میں ہی آ گئے ہیں پھر اتنا فرق کیونکر ممکن ہے کہ اور لوگ تو ستر برس تک مشکل سے پہنچیں۔ اور ان کا یہ حال ہو کہ دو ہزار کے قریب ان کی زندگی کے برس گذر گئے اور اب تک مرنے میں نہیں آتے۔ بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ

دنیا میں آ کر پھر چالیس یا پینتالیس برس زندہ رہیں گے۔"
دوسری حدیث مرزا صاحب نے یہ پیش کی ہے عن جابر قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم یقول قبل ان یموت بشھر تسئلونی عن الساعة و انما علمھا عنداللّٰہ و اقسم باللّٰہ ما علی الارض من نفس منفوسة یاتی علیھا مائة سنة و ھی حیة رواہ مسلم اور روایت ہے جابرؓ سے کہ کہا سنا میں نے پیغمبر خدا ﷺ سے کہ وہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ کوئی ایسا زمین پر مخلوق نہیں کہ اس پر سو برس گذریں اور وہ زندہ رہے۔"
چونکہ مرزا صاحب جانتے ہیں کہ یہ حدیث بوجہ علی الارض کی قید کے ہمارے مفید مطلب نہیں بیٹھ سکتی۔ اس لئے اس کے معنی بدلنے اور خلاف مراد تاویل کرنے میں بہت زور لگایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص زمین کی مخلوقات میں سے ہو وہ شخص سو برس کے بعد زندہ نہیں رہے گا اور ارض کی قید سے مطلب یہ ہے تا کہ آسمان کی مخلوقات اس سے باہر نکالی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام آسمان کی مخلوقات میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ زمین کی مخلوقات اور ما علی الارض میں داخل ہیں۔"

اس آیت زیر بحث اور دونوں حدیثوں کے جواب میں اوّل تو یہ عرض ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع آسمانی اور آپ کا نزول آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ مرفوعہ سے ثابت ہے اور ان آیات واحادیث میں ان کی موت کا کوئی ذکر نہیں۔ مرزا صاحب کا اپنا نیا اجتہاد اور رائے وقیاس ہے نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں پیش نہیں ہو سکتا۔
دیگر یہ کہ اس آیت کے ترجمے میں مرزا صاحب نے علم ومعرفت کی تخصیص کہاں سے نکالی۔ کیونکہ اگر آیت کے ماقبل پر نظر کریں تو ذکر فیئے اور غنیمت کا چلا آ رہا ہے پس اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ غنیمت اور فیئے میں جو کچھ تم کو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دیں اسے لے لو۔

اور اگر کلمہ مَا کے ابہام اور عموم پر نظر کریں۔ تو ہر معاملہ میں خواہ علم کے متعلق ہو' خواہ عمل کے' خواہ کسی امر کے فیصلے کے ہو۔ اس آیت کا حکم لیا جائے گا۔ پس اس آیت کی رو سے تو عیسٰی علیہ السلام کا آسمان پر ہونا اور اس سے نازل ہونا ثابت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ احادیث میں آپ کے آسمان سے نازل ہونے کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا یہ آیت ہمارے مفید مطلب ہوئی۔ نہ کہ مرزا صاحب کے۔

سوم یہ کہ ساٹھ ستر سال عمر کی حدیث سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات ثابت کرنی عجب طرح کی بے استادی ہے۔ کیونکہ اول تو حدیث میں صاف کہا گیا ہے کہ بعض کی عمر اس سے زیادہ بھی ہوگی۔ اور اس زیادتی کی انتہائی حد نہیں بتائی کہ عیسٰی علیہ السلام کی عمر کو اس سے متجاوز سمجھ کر آپ کو فوت شدہ تصور کرلیں۔ اور عمر طبعی کی تردید پیچھے مفصل گزر چکی ہے۔ دیگر یہ کہ امتی کا لفظ صاف بتلا رہا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ یہ سب کچھ اپنی امت کے لوگوں کی بابت فرما رہے ہیں۔ عیسٰی علیہ السلام آپ کی امت کے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مستقل نبی ہیں اور نزول کے وقت نبی ہی ہوں گے۔ مطلق خلاف دیگر امر ہے اور امت میں سے ہونا دیگر امر ہے۔ حضرت عیسٰیؑ کا امت میں سے نہ ہونا حدیث صحیح مسلم سے بصراحت ثابت ہے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ حق پر رہے گا اور اپنے مخالفوں کے مقابلے میں غالب رہے گا۔ پس عیسٰی علیہ السلام نازل ہوں گے۔ تو جو شخص اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا۔ (یعنی امام مہدی علیہ السلام) وہ کہے گا کہ آئیے حضرت ہمیں نماز پڑھائیے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام جماعت کرانے سے انکار کریں گے۔ اور کہیں گے کہ تمہارا امام تم ہی سے ہے یہ فضیلت اللہ تعالٰی نے اسی امت کو بخشی ہے۔" صاف ظاہر کر رہا ہے کہ آپ اس امت کے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے۔ ورنہ یہ عذر ٹھیک نہیں۔ اس حدیث سے مرزا صاحب کی مماثلت کا رنگ بھی اڑ گیا۔ کیونکہ مسیح موعود اس امت کے لوگوں میں سے نہیں۔ اور مرزا صاحب اس امت کے

لوگوں میں سے ہیں۔ پس اس حدیث کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر کو کم سمجھنا سخت غلطی ہے۔ دیگر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی آسمانی زندگی زمینی زندگی میں معدود نہیں۔ جیسا کہ وَکَہْلًا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس امت میں سے نہ ہونے کے بارے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے۔ مرزا صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بات ان کی اپنی عبارت سے ظاہر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''یہ ظاہر ہے کہ حضرت مسیح ابن مریم اس امت کے شمار میں ہی آگئے ہیں۔''

''شمار میں ہی آگئے ہیں۔'' پنجابی اردو ہے۔ صحیح اس طرح ہے ''شمار ہی میں آگئے ہیں'' خیر کچھ ہو۔ شمار ہی میں آجانا اور فی الحقیقت ہونے میں فرق ظاہر ہے۔ پس ہمارا مطلب ثابت ہے۔ دیگر یہ کہ اگر بالفرض مرزا صاحب کی اس بارے میں ساری باتیں مان بھی لیں۔ تو بھی مرزا صاحب کی مراد پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس حدیث کی رو سے وفات مسیح علیہ السلام کی بنا مرزا صاحب کے قیاس ورائے پر ہے اور آپ کے نزولِ عینی کی بنا صحیح حدیث کی تصریح سے ہے۔ پس عیسیٰ علیہ السلام اس حدیث کے حکم سے مستثنیٰ رہیں گے۔

دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں کلمہ علی الارض شہادت دے رہا ہے کہ یہ حکم ان زندہ چیزوں کے بارے میں ہے۔ جو زمین پر موجود ہوں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہیں۔ اس لئے اس حدیث کے حکم میں نہیں آسکتے۔ اور مرزا صاحب کا علی الارض کے معنی زمینی مخلوق کرنا زبانِ عربی کے محاورات کے خلاف ہے۔ مرزا صاحب نے لکھتے وقت صحیح مسلم کی شرح پر تو نظر کر لی ہوتی۔ تاکہ آپ کو علی الارض کے استعمال کا موقع معلوم ہو جاتا۔ مرزا صاحب خوب پہچانتے ہیں کہ اس حدیث سے مراد کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ادھر ادھر کھینچ تان کر کے حدیث کے مطلب کو بگاڑنا چاہا ہے۔ مگر اہل علم پر آپ

کا یہ دھوکا اور مغالطہ مخفی نہیں رہتا۔

قسم سوم میں سے بیسویں آیت اور مرزا صاحب کی ترتیب کی رو سے تیسویں اور آخری آیت یہ ہے:۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.

''یعنی کفار کہتے ہیں کہ تو آسمان پر چڑھ کر ہمیں دکھلا۔ تب ہم ایمان لائیں گے۔ ان کو کہہ دے۔ کہ میرا خدا اس سے پاک تر ہے کہ اس دارالابتلا میں کھلے کھلے نشان دکھلا دے۔ اور میں بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوں مگر ایک آدمی۔''

مرزا صاحب نے اس آیت کے ترجمہ میں اپنی طرف سے زیادتی کی ہے۔ اور قرآن کے الفاظ کی پابندی نہیں کی۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

''اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کفار نے آنحضرت ﷺ سے آسمان پر چڑھنے کا نشان مانگا تھا اور انہیں صاف جواب ملا کہ یہ عادت اللہ نہیں کہ کسی جسم خاکی کو آسمان پر لے جائے۔ اب اگر جسم خاکی کے ساتھ ابن مریم کا آسمان پر جانا صحیح مان لیا جائے۔ تو یہ جواب مذکورہ بالا سخت اعتراض کے لائق ٹھہرے گا۔ اور کلام الٰہی میں تناقض اور اختلاف لازم آئے گا۔ لہٰذا قطعی اور یقینی امر یہی ہے کہ حضرت مسیح بجسدہ العنصری آسمان پر نہیں گئے۔ بلکہ موت کے بعد آسمان پر گئے۔''

اس کے بعد مرزا صاحب نے حضرت یحییٰ اور حضرت آدم اور حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف علیہم السلام کا ذکر کر کے کہا ہے کہ:۔

''جس طرح معراج کی رات رسول اللہ ﷺ کو یہ نبی ملے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ملے۔ پس جس طرح موت کے بعد یہ سب اٹھائے گئے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی موت کے بعد اٹھائے گئے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کے معراج کی رات میں دیگر انبیاء سے ملاقات کرنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ملاقات کرنے کا بیان بالتفصیل پہلے گذر چکا ہے۔ اب اس آخری آیت زیر بحث کا جواب سنئے کہ مرزا صاحب نے اس آیت کے ماقبل پر نظر نہیں کی اور نہ اس کی صحیح تفسیر سمجھی ہے۔ صرف اپنی پرانی عادت یعنی خواہش نفسانی سے جس طرح چاہا۔ قرآن شریف کے مطلب کو بگاڑ کر اپنا مطلب پورا کرنا چاہا ہے:-

تفصیل و بیان اس اجمال کی یہ ہے کہ سوالات کفار جن کے جواب میں کلمہ جامعہ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا تعلیم کیا ہے۔ یہ ہیں

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا.

(بنی اسرائیل پ ۱۵)

''کفار کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حتیٰ کہ تو ہمارے لئے زمین سے چشمے جاری کر دے۔ یا تیرے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں یا تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا برسا دے۔ جیسا کہ تو کہا کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ضامن لے آئے یا تیرے لئے کوئی گھر سونے کا بنایا ہوا ہو۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کو نہیں مانیں گے۔ جب تک کہ وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ نازل کرے۔ جسے ہم خود پڑھ لیں اے پیغمبر (ﷺ) ان کو ان سوالات کے جواب میں یہی کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے۔ (کہ کوئی اس پر زور و تحکم کرے) میں تو صرف ایک (فرمانبردار) بندہ اور رسول

ہوں۔" (۱۷: ۹۰۔۹۳)

ان آیات میں کفار کی ان اقتراحات کا ذکر ہے۔ اول آنحضرت ﷺ کا اعجازی قوت سے زمین سے چشمے جاری کرنا۔ دوم آنحضور سرور عالم ﷺ کے لئے خرما و انگور کا باغ موجود ہونا اور اس میں نہروں کا بہتے ہونا۔ سوم آسمان کا ٹکڑا عذاب کے لئے گر پڑنا۔ چہارم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور ملائکہ کی ضمانت' تصدیق یا ان کو سامنے لانا۔ پنجم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سونے کا محل ہونا۔ ششم آنحضرت سید الرسل وافضل البشر کا آسمان پر چڑھ جانا۔ اور وہاں سے کتاب کا اتارنا جسے کفار خود پڑھ لیں۔

یہ بالکل بدیہی اور مصرح امر ہے کہ ان سب سوالات کے جوابات میں ایک ہی کلمہ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تعلیم کیا گیا ہے۔ اگر یہ جواب امر ششم یعنی آسمان پر چڑھ جانے کے محال ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ تو باقی سب امور بھی مستبعد و ناممکن ماننے پڑیں گے۔ کیونکہ جملہ سوالات کا ایک ہی جواب سکھایا گیا ہے۔ پس واضح ہو کہ ان کل امور کا ممکن اور غیر ممتنع ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اور ایسے خوارق کا ذوات بابرکات انبیا علیہم السلام سے باذنِ الٰہی واقع ہونا محل استبعاد نہیں۔ کیونکہ معجزہ یعنی خرق عادت ممکن ہے۔ پہلے ہم ان سب امور کو قرآن کریم سے ممکن ثابت کرتے ہیں۔ اور پھر قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کی صحیح تفسیر بیان کریں گے اور اس کے بعد یہ ذکر کریں گے کہ باوجود ان امور کے ممکن ہونے کے پھر کفار کی طلب پوری کیوں نہ کی گئی۔

امر اوّل :-

یعنی پیغمبر برحق کے معجزے سے زمین میں سے چشموں کا پھوٹ پڑنا آیت فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (بقرہ پ ۱۔ ۲: ۶۰) سے ثابت ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑنا اور اسی طرح

رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں سے فوارے جاری ہو پڑنا۔ اور نیز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کی ضربوں سے آب زمزم کا پیدا ہونا امر مطلوب کے ممکن ہونے کی بڑی بھاری دلیل ہے۔ اور ان ہر دو واقعات کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ امر دوم اور پنجم یعنی پیغمبر برحق کے لئے باغات و انہار و محلات کے میسر ہونے کی دلیل بھی قرآن شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں کفار کے اس سوال کو ذکر کر کے جواب فرمایا ہے:-

تَبٰرَکَ الَّذِیْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَکَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِکَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَیَجْعَلْ لَّکَ قُصُوْرًا۔

(فرقان ع ۲ پ ۱۸) (۲۵:۱۰)

"وہ اللہ بہت برکت والا ہے جو اگر چاہے۔ تو تیرے لئے ایک چھوڑ کئی باغات ان باغوں سے بہتر مہیا کر دے۔ کہ ان کے تلے نہریں بھی چلتی ہوں۔ اور تجھے ایک چھوڑ کئی محل بھی میسر کر دے۔"

نیز حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی اور ان کے لئے جڑاؤ شیش محل کا میسر ہونا سورہ نمل میں مذکور ہے۔ اور اسی طرح شیاطین کا آپ کے لئے مسخر ہونا اور آپ کے لئے سمندروں میں سے بیش بہا موتی نکالنا اور طرح طرح کے مکلف اسباب خانگی تیار کرنا سورۂ انبیاء۔ سبا اور ص میں مذکور ہے۔

سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام تو بہترین خلائق ہوتے ہیں۔ ان کے لئے خزانہ الٰہی میں کس چیز کی کمی ہے۔ یہ فرہند و اسباب تو دیگر افراد بنی نوع بلکہ کفار کے لئے بھی اس دنیا میں میسر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بعض کو حاصل ہیں۔ چنانچہ سورہ زخرف میں فرمایا:-

وَلَوْلَآ اَنْ یَّکُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّکِئُوْنَ وَزُخْرُفًا۔ (پ ۲۵ زخرف)

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ کفر ہی پر کمر باندھ لیں گے۔ تو ہم منکرین کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں اور دروازے اور تخت اور تکیہ گاہ سب کچھ چاندی کے کر دیتے۔ اور اسی طرح دیگر اسباب بھی کچھ سونے کا عطا کر دیتے۔" (۴۳:۳۳ تا ۳۵)

اس آیت میں کفار کے لئے چاندی کی چھتیں اور سیڑھیاں اور دروازے اور تخت اور تکیہ گاہ اور دیگر اسباب طلائی میسر ہو سکنے کا ذکر ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ان اسباب کا حاصل کر لینا (بتوفیقہ تعالیٰ) طاقتِ بشری سے خارج نہیں ہے۔ پس جب عامۂ خلائق کے لئے ممکن ہوا۔ تو انبیا جو خواصِ دربارِ ایزدی ہوتے ہیں۔ ان کے حق میں کس طرح محال ہوگا۔ خواص کا ایسے اسبابِ فانیہ کو محبوب نہ جاننا امر دیگر ہے اور ان کے حق میں معاذ اللہ محال و مستبعد ہونا امر دیگر ہے۔

امرِ سوم:۔

یعنی آسمان سے کوئی ٹکڑا عذاب کے طور نازل ہونا کفار کے مقولہ کما زعمت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کو اس عذاب سے ڈرایا تھا۔ جس پر کفار نے مطالبہ کے وقت اس کا حوالہ دیا ہے۔ اور وہ ڈر جو ان کو سنایا گیا تھا۔ سورۂ سبا میں مذکور ہے:۔

إِنْ نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ. (پ۲۲۔ السباء ع۱)

"اگر ہم چاہیں۔ تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل کر دیں۔" (۳۴:۹)

اسی طرح سب آسمانوں اور زمین کا سقوط و زوال ممکن ہونا کئی آیات سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ. (فاطر پ۲۲)(۳۵:۴۱)

"آسمان اور زمین کو صرف اللہ تعالیٰ ہی نے تھاما ہوا ہے۔ اور اگر وہ نہ تھامے اور وہ گرنے کو ہوں تو پھر ان کو کوئی بھی نہ تھام سکے۔"

بلکہ قیامت کو یہ سب آسمان و زمین فنا کر دیے جائیں گے اور یہ امر قرآن شریف میں کئی جگہ مذکور ہے۔ چنانچہ تبدیل زمین وآسمان کی نسبت سورہ ابراہیم کے آخر میں فرمایا:-

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ. (ابراہیم پ۱۳ ع۲)

"جس دن زمین اور آسمان نئے تبدیل کیے جائیں گے۔" (۱۴:۴۸)

پس آسمان سے کوئی ٹکڑا بطور عذاب نازل ہونا بھی ناممکن ومحال نہ ہوا۔

امر چہارم:-

یعنی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اور ملائکہ کو ضامن کر کے صداقت نبوت کو ثابت کرنا اس میں کون سا استبعاد ہے۔ قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے۔

چنانچہ فرمایا:-

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا. (نساء پ۶ ع۲۳) (۴:۱۶۶)

"اللہ تعالیٰ تو اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس نے اس قرآن شریف کو تجھ پر اپنے علم سے سچ سچ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور شہادت کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔"

اور اگر قبیلا بمعنی قبلاً سمجھیں تو بھی مستبعد نہیں۔ کیونکہ اتیان باری بکیفیۃ تلیق بشانہ العظیم ممتنع بالغیر ہے۔ اور ہر ممتنع بالغیر ممکن بالذات ہوتا ہے جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اول میں ثابت ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (بقرہ پ۲ ع۲۵) (۲:۲۱۰) اور وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (فجر پ۳۰) (۸۹:۲۲) وغیرہما اور احادیث نزول باری سبحانہٗ۔

امر ششم:-

یعنی آسمان پر بارادۂ الٰہیہ چڑھ سکنا عامہ بشر بلکہ کفار کے حق میں بھی ممکن ہے۔ چنانچہ سورہ حجر کے شروع میں فرمایا:-

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ. (حجر ع ۱ پ ۱۴)

''اور اگر ہم کفار پر آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں دن ہوتے چڑھ بھی جائیں۔ تو پھر بھی کہیں گے کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔'' (۱۴:۱۵)

پس عباد صالحین و حضرات مرسلین جو بہت اعز و اکرم ہیں۔ ان کے لئے کس طرح محال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کتاب کا لکھی ہوئی صورت میں آسمان سے اتر سکنا سورہ انعام کی آیت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا:-

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ. (انعام ع ۱ پ ۷)

اور اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کریں اور یہ کفار اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیں تو بھی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔'' (۶:۷)

الغرض یہ سب آیات طیبہ صاف بتلا رہی ہیں۔ کہ امور مسئولہ کفار ممکن و غیر ممتنع ہیں۔ تو پھر آیت سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا سے عذر استحالہ کس طرح بجا ہے۔ اس صورت میں تو قرآن حکیم میں تعارض ہوگا۔ وَھٰذَا باطلٌ۔ اگر اسی آیت کو بغور دیکھیں۔ تو اسی سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ کفار معترضین کو اس امر کا علم تھا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ معراج جسمانی کے مدعی ہیں اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ کے بعد وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ. اسی لئے کہا کہ آپ پچھلے معراج کا حوالہ نہ دے دیں۔ مزید بریں کفار کا سوال کرنا ہی اس امر پر دال ہے۔ کہ وہ ان امور خارقہ عادات کا ظہور ذوات بابرکات انبیاء

علیہم السلام سے ممکن جانتے تھے۔ اسی لئے یہ امور پیش کئے کہ اگر آپ ان ممکنات کو واقعات کر دکھائیں۔ تو آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اور آپ کی رسالت کی تصدیق کریں گے۔

پھر اگر یہ سوال ہو کہ اگر سب امور مقترحہ ممکنات میں سے ہیں تو سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کی صحیح تفسیر جس سے یہ جواب ہر امر کے ساتھ منطبق ہو جائے کس طرح ہے' تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اس کی صحیح تفسیر جس کی دوسری آیات مؤید و مصدق ہیں۔ یہ ہے جو تفسیر ابن کثیر و سراج منیر سے نقل کی جاتی ہے:۔

وقوله تعالٰی. سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ای سبحانه و تعالٰی و تقدس ان یتقدم احد بین یدیه فی امر من امور سلطانه و ملکوته بل هو الفعال لما یشاء ان شاء اجابَکُمْ الٰی ماسالتم و ان شاء لَمْ یُجِبْکُمْ وما انا الّا رسول الیکم اُبلغکم رسالات رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَکُمْ و قد فعلتُ ذٰلکَ و اَمْرُکُمْ فیما سالتم الی اللّٰه عزوجل (ابن کثیر)

اس آیت سُبْحَانَ رَبِّیْ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس کی بادشاہی میں پیش دستی یا اس کے سامنے بڑھ کر بات کر سکے بلکہ جس امر کو چاہتا ہے۔ خود کرتا ہے۔ پس اگر وہ چاہے گا۔ تو تمہارا سوال قبول کرے گا ورنہ نہیں۔ اور میں تو صرف اس کے حکم کا مطیع اور اس کا رسول ہوں۔ میرا کام صرف تبلیغ رسالت ہے۔ جو میں کر چکا ہوں اور جو کچھ تم نے سوال کئے ہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

اسی طرح تفسیر سراج منیر میں بھی بوضاحت اس امر کو محقق کیا ہے۔

ولما لم تعنّتهم وکان لسان الحال طالبا من اللّٰه تعالٰی الجواب عنه امر اللّٰه تعالٰی بجوابهم بقوله قل ای لهؤلاء البعداء الا شقیاء سبحان ربی ای تعجبا من افترا حاتهم و

تنزیھا للّٰہ من ان یاتی احدیتحکم علیه اویشارکه احد فی القدرة و قرء ابن کثیر و ابن عام بصیغة الماضی و الباقون قل بصیغة الامر وَھل کنت الّا بشرا رسولا کما کان من قبلی من الرسل و کانوا لا یاتون قومھم الا بما یظھره اللّٰہ علی ایدیھم بماَ یلائم حال قومھم ولم یکن امر الآیٰت الیھم ولا لھم ان یتحکموا علی اللّٰہ حتی یتخیروھا ھذا ھوالجواب المجمل واما التفصیل فقد ذکر فی ایات اُخرکقوله تعالٰی وَلو نزّلنَا عَلَیْکَ کِتَابًا فِی قِرطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِاَیْدِیْھِمْ وَلو فتحنَا عَلَیْھِمْ بَابًا وَ نَحْوَ ذَالک.

''اور جس وقت کفار کی سرکشی اور کج بحثی حد کو پہنچ گئی۔ تو آپ ﷺ کی زبانِ حال اللہ تعالیٰ سے اس بات کا جواب طلب کر رہی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے جواب سکھایا کہ ان بدبختوں سے کہو کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس پر حکم وزور کر سکے یا قدرت میں اس کا شریک ہو سکے۔ میں اپنے اختیار سے یہ امر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں تو ایک رسول ہوں۔ اور مجھ سے پہلے جتنے رسول ہوئے تھے۔ اپنے اختیار سے کوئی بھی معجزہ نہ دکھاتا تھا۔ بلکہ صرف وہی جو اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھ پر ظاہر کرے۔ اور ان کی قوم کے حال کے موافق ہوں اور معجزات کا دکھانا رسولوں کے اختیار میں نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ان کو یہ قدرت ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ پر حکم اور زور کر کے اپنی مرضی سے معجزے طلب کریں۔ اس آیت میں یہ جواب مجمل دیا گیا ہے۔ اور تفصیل کے ساتھ دیگر مقامات میں مذکور ہے۔ مثلاً آسمان سے کتاب اتارنے کا جواب سورۂ انعام میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم تجھ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کرتے اور منکر لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول بھی لیتے۔ تو بھی یہ منکر اس کو

جادو کہہ کر انکار کر دیتے اور آسمان پر چڑھنے کا جواب سورۂ حجر میں فرمایا: کہ اگر ہم ان کفار کے لئے آسمان کا دروازہ بھی کھول دیں اور یہ لوگ اس پر چڑھ بھی جائیں تب بھی یہ منکر کہیں گے۔ کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اور اسی طرح اور سوالات کے تفصیلی جواب دیگر آیات میں دیئے ہیں۔"

تفسیر سراج منیر نے تو بیشک ظلمات و وساوس و شبہات کو دور کر دیا۔ اور قلب مومن کو منور کر دیا۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا۔ کہ یہ امر ممنوعات میں سے نہیں۔ بلکہ اعراض صرف ان کے تعنت کی وجہ سے ہے اور نیز یہ کہ یہ جواب مجمل سب امور مسئول عنہا کا جواب ہے۔ اور ہر امر کا بالتفصیل جواب دیگر آیات میں مذکور ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر دو امر صعود الی السماء اور تنزیل کتاب کے امکان میں وہی آیتیں ذکر کیں۔ جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور باقی امور کے جواب کی تفصیل کی طرف و نحو ذلک سے اشارہ کر دیا کہ طالبِ تفصیل خود قرآن شریف میں تدبر و تفحص کر کے ڈھونڈ لے۔ فالحمدللہ علی نعمائہ الشاملة و الآئہ الکاملة۔

تفسیر کبیر میں بھی اس جواب کی اسی طرح تقریر کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

تقریر الجواب. ان یقال اما ان یکون مراد کم من هذا الاقتراح انکم طلبتم الاتیان من عند نفسی بهذ الاشیاء او طلبتم من ان اطلب من الله تعالی اظهارها علی یدی لتدل علی کونی رسولا حقا من عندالله و الاوّل باطل لانی بشر والبشر لا قدرة له علی هذه الاشیاء والثانی ایضاً باطل لانی قد اتیتکم بمعجزة واحدة وهی القران والدلالة علی کونها معجزة فطلب هذه المعجزات طلب لما لاحاجة الیه ولا ضرورة فکان مجری العنت والتحکم وانا عبد مامور لیس لی ان التحکم علی الله فسقط هذا السوال فثبت ان قوله

قل سبحان ربی ھل کنت الّا بشرا رسولا جواب کاف فی ھذا الباب۔ (تفسیر کبیر)

''اس جواب کی تقریر اس طرح ہے کہ کفار کے سوال کی دو صورتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ان امور کو اپنے اختیار سے کر دکھاؤں۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ سے طلب کروں کہ وہ میری صداقت کے لئے ان امور کو ظاہر کرے۔ پس یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلے تو اس لئے کہ میں بشر ہوں اور اپنے اختیار سے ان اشیا پر قادر نہیں ہوں۔ اور دوسری اس وجہ سے کہ معجزہ تو میں تمہارے پاس لا چکا ہوں۔ کیونکہ یہ قرآن شریف میری نبوت کی تصدیق کے لئے کافی معجزہ ہے۔ پس تمہارے معجزہ کی طلب محض تعنت اور تحکم ہے۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کا مطیع بندہ ہوں۔ میں اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ تحکم اور زور سے کوئی امر اس سے طلب کروں۔ پس یہ سوال کفار مردود ہے۔ اور ثابت ہو گیا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اس بارے میں کافی جواب ہے۔''

جو تقریر مفسرین علیہم الرحمۃ سے اس جواب کے بارے میں نقل کی گئی ہے۔ وہ بالکل حق اور مراد الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اور دیگر آیات اس کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ پس یہ تفسیر' تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔ اصل اس سارے مضمون کا آیت سورہ مومن وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (مومن پ ۲۴ ع ۸) ہے یعنی ''کوئی رسول بغیر اذن الٰہی کوئی نشان و معجزہ نہیں دکھا سکتا۔'' (۴۰: ۷۸) کیونکہ معجزہ مقدور بشر سے خارج شئے کا نام ہے اور رسول بھی بوجہ بشر ہونے کے بذات خود بالاستقلال خرق عادت پر قادر نہیں ہوتے۔ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ایسے امور جن سے دیگر عاجز ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول برحق کے دست مبارک پر ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ اس کی صداقت کے دلائل ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت روح اللہ علیہ السلام اپنی رسالت کی صداقت کے بارے میں اِنِّیْ اَخْلُقُ

لکم من الطین الآیہ. اور موسیٰ علیہ السلام اپنی رسالت کی تصدیق میں فرعون کے سامنے اَوَلَوْ جِئْتُکَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ فرماتے ہیں۔ اور فرعون اس پر طلب کرتا ہے اور کہتا ہے۔ فَاْتِ بِہٖٓ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ. ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے وسیلے کچھ عجائب جو مقدور بشر سے خارج ہوں۔ ظاہر کیا کرتا ہے۔ یہ ان کے صدق پر دلیل ہوا کرتے ہیں۔ اور ایسے عجائب کوئی رسول بغیر اذنِ الٰہی کے دکھا نہیں سکتا۔

اب قرآن شریف کے چند مقامات ذکر کیے جاتے ہیں۔ جن میں اسی طرح کفار نے اقتراحی آیات کا مطالبہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہی جواب تعلیم کیا ہے۔ کہ ان سے کہہ دو کہ میرا کام اتباع وحی اور تبلیغ رسالت ہے۔ معجزات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ چاہے تو دکھائے ورنہ نہ دکھائے۔ اس میں اس پر میرا کوئی تحکم وتغلب تو نہیں کہ بزور معجزہ طلب کروں۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (پ۹ اعراف ع۲۴)(۷:۲۰۳،۲۰۴)

اور (اے پیغمبر ﷺ) جس وقت تم ان کو ان کی طلب کے موافق کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں از خود بنا لیتا۔ ان کو جواب دو کہ میں تو صرف وحیٔ الٰہی کا تابع ہوں۔ یہ قرآن شریف تمہارے رب کی طرف سے کافی معجزہ ہے۔ اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سبب ہے اور جب میں اس کو پڑھا کروں تو تم اس کو چپ چاپ غور سے سنا کرو کہ تم بھی مومن ہو کر رحمت میں داخل ہو جاؤ۔"

دیکھو اس آیت میں کیسے صاف طور پر فرما دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں امر الٰہی کے تابع ہوں۔ اپنی حول وقول سے کچھ نہیں دکھا سکتا۔ اور منصب تبلیغ رسالت سے

ہرگز سرمو تجاوز نہیں کرسکتا۔ اور اگر تمہاری غرض طلبِ آیات سے طلبِ حق ہے۔ اور ہدایت حاصل کرنا ہے۔ تو تصدیقِ رسالت کے لئے قرآن شریف کافی دلیل ہے۔ اسے غور سے چپ چاپ سنتے رہو۔ امید ہے کہ تم کو ہدایت نصیب ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں فرمایا:۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ.

(پ۲۱ ع ا عنکبوت۔ ۲۹: ۵۰ و ۵۱)

''اور یہ کفار کہتے ہیں کہ اس پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا۔ اے پیغمبر ﷺ! تم ان سے کہہ دو کہ معجزات تو اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں ہیں۔ میں تو ایک ڈرسنانے والا ہوں۔ اے پیغمبر ﷺ! کیا ہم نے ان پر ایسی کتاب نازل نہیں کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے اور ان کو تصدیق رسالت کے لئے اعجازی رہبری کرتی ہے۔ پس وہ رسالت کا کافی ثبوت ہے اور مومنین کے لئے موجبِ رحمت اور نصیحت ہے۔''

ناظرین! غور کریں کہ سورۂ اعراف کی آیات اور یہ آیات کیسے بالاتفاق ایک ہی مضمون کو ادا کرتی ہیں۔ اور یہ جواب کچھ ہمارے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بلکہ انبیائے سابقین سے بھی یہی منقول ہے۔ اور انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ہم اپنی مرضی سے بغیر اذنِ الٰہی نشان نہیں دکھا سکتے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں فرمایا۔ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (پ۱۳ ابراہیم) یعنی ہم بغیر اذنِ الٰہی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔'' (۱۴: ۱۱) ان آیات سے صاف معلوم ہو گیا کہ کفار کے اقتراحِ آیات کے جواب میں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کی تعلیم کرنا اس وجہ سے نہ تھا۔ کہ یہ امور ناممکن تھے۔ اگر یہ تعلیم کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ اپنی سلطنت میں کسی کی

شہادت القرآن

مرضی پر انتظام کرے۔ یا کوئی شخص اس پر تحکم کرے۔ اور حسبِ اقتراح اس سے آیات طلب کرے۔ اگر غرض ان کفار کی طلبِ حق ہے۔ تو تصدیقِ رسالت کے لئے کافی دلائل ظاہر ہو چکے ہیں۔ اور دلیلِ کافی پر زیادتی طلب کرنا تعنت وتحکم ہوتا ہے۔ پس اس سے اعراض کرنا چاہئے۔ اور منصبِ رسالت کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ مطلب اس آیت کا یہ تھا۔ جو بیان کیا گیا۔ خوش فہم لوگوں نے اور کا اور سمجھ لیا۔ اور کہاں کی کہاں بے تکی ہانک دی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ امور ممکن تھے۔ اور نبی برحق کے معجزہ سے بعید نہ تھے۔ تو پھر کیوں ان کو پورا نہ کر دکھایا۔ تو اس کا جواب وہ ہے۔ جو اجمالاً اوپر گذر چکا ہے اور وہ خود قرآن شریف نے تعلیم کیا ہے کہ قرآن شریف تصدیقِ رسالت کے لئے کافی ثبوت ہے۔ اس پر غور کرو۔ تو تمہارا مطلب ومقصود پورا ہو جائے گا۔ یہ ضرور نہیں کہ جو کچھ تم کہتے جاؤ۔ اور احتمالاتِ بعیدہ سے رد کرتے جاؤ۔ میں ہر روز اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہوں دیکھنا تو یہ ہے کہ رسول مدعیٔ رسالت جو کچھ پیش کرتا ہے۔ اسے دعوائے رسالت سے مناسبت وتعلق ہے یا نہیں۔ اور وہ اثباتِ نبوت کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو پھر اس پر زیادتی کی طلب کیوں کی جاتی ہے۔ معجزے سے غرض تو یہ ہے کہ تصدیقِ رسالت کی طرف ہدایت کر سکے۔ پس قرآن شریف اپنے اعجاز سے تم کو ساکت وملزم کر رہا ہے۔ اور تصدیقِ رسالت کے لئے بصدائے بلند پکار رہا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔

آیاتِ مذکورہ سے ناظرین کے خاطرنشین ہو گیا ہوگا۔ کہ کفارِ مکہ کے معتنانہ سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تصدیقِ رسالتِ محمدی کے لئے قرآن شریف کو پیش کیا ہے۔ آپ کے مزید اطمینان کے لئے اب ہم یہ بیان کرتے ہیں۔ کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جن سوالات کے جواب میں سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تعلیم کیا گیا ہے۔ ان آیتوں کے پہلے بھی قرآن مجید کے معجز اور بے مثل ہونے کو بڑے ہی پر زور دعویٰ اور تحدی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

اے پیغمبر ان کو سنا دو۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ (الٰی) قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل پ۱۵۔۱۷:۸۸۔۹۳)

کہ اگر تمام انسان اور جن مجتمع ہو کر اور ایک دوسرے کی امداد پر کمر باندھ کر کوشش کریں کہ اس قرآن عظیم کی نظیر بھی لا سکیں۔ تو ہرگز نہیں لا سکیں گے۔ بے شک ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم کا بیان نصیحت واضح طور پر پھیر پھیر کر بیان کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ انکار ہی اختیار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اے پیغمبر ان کو کہہ دو کہ میرا رب اس بات سے پاک ہے کہ کوئی اس پر تحکم کر سکے میں تو صرف ایک بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

آیت ماقبل کو ساتھ ملانے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ سورہ بنی اسرائیل میں بھی سورۂ اعراف اور سورۂ عنکبوت کی طرح طلب معجزات کے جواب میں قرآن شریف ہی پر کفایت کی گئی ہے۔ پس اس جواب سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کو جن معنوں میں مرزا صاحب نے لیا تھا وہ ہرگز صحیح نہیں۔ اس جواب کا صحیح مطلب وہی ہے۔ جو تفسیر کبیر وغیرہ سے پیشتر گذر چکا ہے۔

تَمَّ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ۔

۱۶ جون ۱۹۵۸ء — تصحیح کردہ: عبدالقیوم میر

الخبر الصحيح
عن
قبر المسيح

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا

الخبر الصحيح
عن
قبر المسيح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ مُحْصِيْ كُلِّ شَيْءٍ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنِ الَّذِيْ جَعَلَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً وَّاٰوٰهُمَا اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ الْاَتَمَّانِ الْاَكْمَلَانِ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ الَّذِيْ اَخْبَرَنَا بِخُرُوْجِ الدَّجَاجِلَةِ الْكَذَّابِيْنَ قَرِيْبًا مِّنْ ثَلٰثِيْنَ وَاَنْبَاَنَا بِنُزُوْلِ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ قَبْلَ يَوْمِ الدِّيْنِ وَقَالَ فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِيْ قَبْرِيْ فَاَقُوْمُ اَنَا وَعِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فِيْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ بَيْنَ اَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ الطَّيِّبِيْنَ وَاَصْحَابِهِ الصِّدِّيْقِيْنَ الْفَارِقِيْنَ وَاَزْوَاجِهٖ اِمَامِ اَهْلِ الْيَقِيْنِ ﴾

سبب تالیف:

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب سے دعویٰ مسیحیت کیا نئے نئے مسائل نکال کر ہندوستان میں شور برپا کر دیا اور بہت سی خلق خدا کو حق سے گمراہ کر دیا۔ ان نئے مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں بتائی جس کے بارہ میں نہ تو کوئی آیت ہی آئی ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حدیث فرمائی اور نہ ہم نے صحابہ کی کوئی روایت پائی۔ قادیانی نے محض اپنا مطلب سیدھا کرنے کے لیے اِدھر اُدھر سے طومار توہمات جمع کیا اور اپنے ماننے والوں کو جو ان کی تقلید میں پھنس کر دین و ایمان کو ان کے ہاتھ بیچ چکے ہیں پرچا لیا۔

مرزا صاحب کی عام عادت تھی کہ اپنے مریدوں کو قائم رکھنے کے لیے اپنے غلط دعاوی اور باطل اقوال کی تائید میں کبھی تو موضوع و منکر روایتیں پیش کیا کرتے تھے۔ اور کبھی قرآن شریف کی آیات میں لفظی و معنوی تصرف کر کے اپنی رائے وہوا سے تفسیر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے تھے۔ اس لیے خاکسار نے ضروری سمجھا کہ قادیانی کے اس فاسد خیال کا فساد اور باطل قول کا بطلان آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اور آثار سلفیہ سے ظاہر کر کے عام مسلمانوں کو غلطی سے بچائے اور قادیانیوں پر حجت پوری کر کے ان کو حق و باطل میں تمیز کرنے کا موقع دے۔

اگر اب بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

عذر مؤلف:

یہ رسالت کتاب شہادت القرآن باب ثانی کے زمانہ تصنیف ۱۳۲۵ھ ہی میں تصنیف کیا گیا تھا۔ اسی لیے اس کتاب میں کسی جگہ اس کی بابت نوٹ بھی لکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کثرت سے متواتر سفروں اور دیگر مشاغل اور کئی عوائق کے سبب اس کی طبع کا موقع نہ مل سکا کُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِوَقْتِهٖ ہر کام کے لیے خدا کے علم میں ایک وقت

مقرر ہے۔ شق اول ختم ہوتے پر اب مجھے اس کے طبع کا خیال آیا ہے اور خدا کا نام لے کر مضمون پر نظر ثانی کر کے شق دوم شروع کرتا ہوں ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

مرزا صاحب کی تحریر پر تردید:

مرزا صاحب نے اپنے رسالہ الھدی والتبصرۃ لمن یری کے صفحہ ۱۰۹ میں لکھا ہے۔

﴿ وثبت بثبوت قطعی ان عیسی ھاجر الی ملک کشمیر بعد ما نجاہ اللہ من الصلیب بفضل کبیر ولبث فیہ الی مدۃ طویلۃ حتی مات ولحق الاموات۔ وقبرہ موجود الی الآن فی بلدۃ بلدۃ سری نگر التی ھی من اعظم امصار ھذا الخطۃ ﴾

ترجمہ:۔ اور قطعی طور پر (مگر صرف مرزا صاحب کے نزدیک) ثابت ہو چکا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے ملک کشمیر کی طرف ہجرت کی بعد اس کے کہ آپ کو اللہ (تعالیٰ) نے (اپنے) بڑے فضل سے نجات دی اور اس (ملک) میں بہت مدت تک ٹھہرے رہے۔ حتیٰ کہ مر گئے اور مردوں کو جا ملے اور آپ کی قبر شہر سری نگر میں جو اس خطہ کے سب شہروں سے بڑا ہے اب تک موجود ہے

اور پھر اس کے بعد کتاب اکمال الدین کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ تسلی واطمینان کے لیے اس کتاب کو پڑھنا چاہیے کیونکہ اس میں یہ بیان تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

مرزا صاحب کا یہ سارا بیان بالکل غلط اور محض بہتان ہے جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا۔

اس بیان سے مرزا صاحب کا مدعا صرف یہ ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں اور فوت شدہ لوگ پھر دنیا پر نہیں آتے تو حدیث میں جس مسیح کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس سے خواہ مخواہ کوئی مثیل مسیح مراد ہے اور وہ مسیح موعود بہ حسب ادعاء خود مرزا صاحب ہیں۔ مرزا صاحب کے اس بیان کا تارو پود بالکل باطل اور خلاف واقع ہے اور قرآن وحدیث کے سراسر مخالف ہے۔ کیونکہ نہ تو حضرت روح اللہ علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے اور نہ ان کے لیے کوئی مرہم تیار کی گئی اور نہ وہ کشمیر کی طرف کو بھاگے اور نہ وہ وہاں فوت ہوئے نہ کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر لکھا ہے اور نہ احادیث نبویہ کا احادیث نبویہ کا مصداق کوئی مثیل ہے نہ مرزا صاحب مسیح موعود ہو سکتے ہیں۔ بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ عزیز وحکیم نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے آسمان پر اٹھا لیا اور یہودیوں کے ہاتھوں کو آپ تک نہ پہنچنے دیا اور آپ آخری زمانہ میں قیامت سے پہلے زمین پر نزول فرما ہوں گے اور مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ اور قیامت کو آنحضرت ﷺ اور آپ اسی قبرستان سے اٹھیں گے۔ وَاللّٰهُ عَلٰی مَانَقُوْلُ شَهِيْدٌ.

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت واقعہ صلیبی کی تردید اور آپ کی رفع جسمانی وحیات جسمانی وحیات آسمانی کا ثبوت اور ان تمیں ۳۰ آیات کے جوابات جو مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کے بارے میں اپنے ازالہ میں لکھی ہیں ہمارے رسالہ صدق مقالہ شہادت القرآن میں جو اس امر میں آپ اپنی نظیر ہے۔ ایسے زبردست اور محکم دلائل سے بیان ہو چکے ہیں کہ آج تک مرزا صاحب اور ان کے حواری اس کے جواب سے عاجز ہیں۔ اب اس رسالہ الخبر الصحیح عن قبر المسیح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر اور آپ کے مدفن مقدس کے متعلق مدلل بحث کر کے مرزا صاحب کے قول کی تردید کی جاتی ہے تاکہ مرزاہ صاحب سے رنگ مماثلت کافور ہو جائے اور ملمع مشابہت اتر جائے اور مرزا صاحب اپنی اصلی رنگت میں لوگوں کو نظر آئیں اور وہ دھوکے سے بچ جائیں ھذا بالله اعتصم عما یصم وان ارید الا الا صلاح مااستطعت وما توفیقی الا بالله علیه توکلت والیه انیب.

مرزا صاحب کی نئی اور پرانی تصانیف میں اختلاف:

مرزا صاحب کی مختلف کتابوں کو غور و تحقیق سے مطالعہ کرنے والے لوگ خوب جانتے ہیں کہ ان کی اکثر عبارات میں تعارض و تناقص ہوتا ہے اور ان کی بات بات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی نئی اور پرانی تصانیف حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر کے متعلق بھی متفق نہیں ہیں چنانچہ اوپر گزر چکا ہے کہ آپ الہدیٰ میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں بتاتے ہیں۔ لیکن ازالہ وہام (تقطیع خرد ص ۴۷۳ اور تقطیع کلاں ص ۲۳۷) جلد اول میں فرماتے ہیں۔

سچ ہے کہ مسیح اپنے وطن گلیل میں جا کر فوت ہو گیا لیکن یہ ہرگز سچ نہیں کہ وہی جسم جو دفن ہو چکا تھا پھر زندہ ہو گیا۔

دنیا کے نقشہ پر نظر کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ گلیل اور سری نگر میں مشرق و مغرب کا فرق ہے اور یہ دو مختلف مقامات ہیں کہاں ولایت کشمیر اور کہاں علاقہ شام۔

اگر یہ عذر کیا جائے کہ ازالہ اوہام کا بیان پادری صاحبان کے مقابلہ میں لکھا ہے اور انہیں انجیلی حوالہ سے جواب دیا ہے۔ تو یہ عذر درست نہیں کیونکہ اول تو انجیل کی عبارت سے ایسا مفہوم نہیں ہوتا اور اگر مرزا صاحب نے اپنی نئی منطق سے اناجیل سے ایسا ہی سمجھا ہے تو پھر بھی عذر صحیح نہیں کیونکہ اس عبارت کو آپ اس طرح شروع کرتے ہیں" یہ تو سچ ہے" جس سے ظاہر ہے کہ مرزا صاحب مضمون بعد کی تصدیق کرتے ہیں اور اگر کہیں کہ یہ سچ انجیلی سچ ہے نہ کہ نفس الامری تو یہ بھی معقول نہیں کیونکہ اسی اپنے ازالہ اوہام میں آپ نے اناجیل کے مسئلہ صلیب اور موت مسیح پر اپنی تحقیق یہ لکھی ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر کھینچے تو گئے۔ مگر اس پر مرے نہ تھے۔ بلکہ نیم جان اتارے گئے تھے پس اس کے بعد مرزا صاحب کا حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ ماننا اور پھر گلیل میں جا کر فوت شدہ جاننا ثابت کر رہا ہے کہ مرزا صاحب اس عبارت میں اپنا ذاتی خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ گو اس

کی بنا اناجیل پر ہے۔ دیگر یہ کہ مرزا صاحب اس موقع پر اناجیل کا مطالعہ اضطراری طور پر کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس واقعہ صلیبی کے ثبوت کے لیے سوائے بیان اناجیل کے کوئی دستاویز نہیں ہے اور ان میں سے بعض امروں کو جو آپ کے خیال کے موافق ہوں تسلیم کر لیتے ہیں اور جو مخالف ہوں انہیں رد کرتے ہیں یا تاویل کرتے ہیں۔ اس سے اتنا ثابت ہے کہ مرزا صاحب ان کتابوں کو بالکل حق اور سراسر راست قرار نہیں دیتے۔ پس حق کو حق سمجھنے اور باطل کو باطل قرار دینے کے لیے ان کے پاس اناجیل کے علاوہ کوئی اور معیار چاہیے اور یہ مسلم ہے کہ وہ معیار مسلمانوں کے پاس قرآن شریف اور حدیث نبوی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تورات وانجیل کے ذکر کے بعد قرآن شریف کا ذکر فرمایا اور اس کی یہ صفت بیان کی۔ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ. یعنی اے پیغمبر ہم نے یہ قرآن شریف تم پر پہلی کتاب (یعنی جنس کتاب خواہ توریت ہے خواہ زبور خواہ انجیل) پر مہیمن کر کے نازل کیا ہے یعنی اختلاف کو دور کر کے محکم رائے سے فیصلہ کرنے والا اور (حق کی) حفاظت کرنے والا اور اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بھی فرمایا کہ پچھلی کتابوں کا بیان جو کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کے موافق ہو وہ (بوجہ تحریف سے محفوظ رہنے کے) قبول کر لو اور جو موافق نہ ہو اُسے چھوڑ دو۔

پس مرزا صاحب پر واجب ہے کہ واقعہ صلیبی کے اثبات کے لیے قرآن و حدیث میں سے کوئی دلیل پیش کریں اور بیان اناجیل پر جن کو وہ خود محرف مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مصنفین اناجیل نے کئی امور از خود بڑھا دیئے ہیں یا صرف حسن ظنی سے لکھ دیے ہیں یا پچھلی نسلوں میں سے کسی نے لکھ دیے ہیں۔ کفایت نہ کریں کیونکہ ان پر سے امان مرفوع ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ ازالہ اوہام کی تصنیف کے وقت بے شک مرزا صاحب کی تحقیق یہی تھی کہ مسیح علیہ السلام گلیل میں فوت ہوئے اور اب یہ تحقیق ہے کہ ان کی قبر کشمیر میں ہے اور اس کے متعلق آپ کو وحی بھی ہو چکی ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اسی لیے ہم

کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کی تحقیق میں نقص ہوتا ہے اور بات بات میں وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور الزام سے بچنے کے لیے پچھلی عبارت کو وحی الٰہی قرار دے لیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے پیشتر کی تحریر بھی وحی یا بمنزلہ وحی مانی جاتی تھی۔ چنانچہ ازالہ اوہام کا یہی حال ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو وحی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ ان کے ازالہ اوہام کی تصنیف اور رسائل الہدیٰ وغیرہ کی تصنیف میں کئی برسوں کا عرصہ ہے۔ اگر آپ صاحب وحی ہوتے تو اللہ تعالیٰ علیم وخبیر آپ کو اتنے سال تک اس غلطی کے اندھیرے میں نہ پڑا رہنے دیتا کیونکہ پیغمبران خدا اپنی غلطی کے بعد بلا مہلت متنبہ کئے جاتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف اور کتب حدیث اور کتب عقاید کے مطالعہ کرنے والوں پر مخفی نہیں ہے اور یہ امر عرف شرع میں عصمت کی تعریف میں داخل ہے چنانچہ طوالع الانوار میں عصمت کی تعریف میں یہ بھی لکھا ہے وَتَتَأَكَّدُ فِي الْأَنْبِيَاءِ بِتَتَابُعِ الْوَحْيِ عَلَى التَّذَكُّرِ وَالْاِعْتِرَاضِ عَلَى مَا يَصْدُرُ عَنْهُمْ سَهْوًا.

وَاٰوَيْنٰهُمَا اِلٰى رَبْوَةٍ (مومنون پارہ ۱۸) کی صحیح تفسیر:

مرزا صاحب کی عادت تھی کہ اپنے مریدوں کو قائم رکھنے کے لیے اپنے غلط دعاوی واقوال کی تائید میں کبھی تو موضوع ضعیف روایتیں پیش کیا کرتے تھے اور کبھی قرآن شریف کی آیتیں جن کو آپ کے مدعا سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سے آپ کی حدیث وتفسیر دانی بخوبی معلوم ہو جاتی ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں ہونے کے متعلق اس آیت سے استدلال کیا ہے

﴿ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴾ (مومنون ۱۸)

ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنایا اور ان دونوں کو ایک اونچی جگہ پر جو ٹھیرنے کے قابل اور شاداب بھی تھی یکجا کر پناہ دی۔ اس آیت

سے مرزا صاحب اس وجہ سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خبر دی ہے کہ ہم نے مسیح کو اور اس کی ماں مریم کو ایک ایسی جگہ پر پناہ دی جو اونچی ہے اور شاداب ہے اور چونکہ کشمیر ان ہر دو صفتوں سے موصوف ہے اس لیے اس آیت میں ولایت کشمیر کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ واقعہ تب ہی ہوا جب عیسیٰ علیہ السلام واقعہ صلیبی کے بعد مرہم پی کرا کر اس طرف بھاگ آئے۔

اس آیت کی تفسیر صحیح بیان کرنے سے پہلے ناظرین کی توجہ اس طرف کرنی ضروری ہے کہ اس آیت میں کشمیر وغیرہ کسی ولایت کا نام مذکور نہیں بلکہ ایسے دو وصف مذکور ہیں جو دنیا میں بہت سے مقامات وولایات میں پائے جاتے ہیں اور وہ جغرافیہ دانوں سے پوشیدہ نہیں پس اس مقام کی تخصیص کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جو امر کئی ایک میں مشترک ہو اس کے متعلق یہ حکم لگانا کہ اس مقام پر فلاں مقصود ہے اور فلاں مراد نہیں ہے بغیر دلیل کے مقبول نہیں ہوسکتا۔ اور مرزا صاحب کی تحریر میں ہم نے اس آیت کے سوا کوئی آیت یا حدیث یا کسی صحابی یا مفسر کا قول نہیں دیکھا جو آپ کے اس خیال کی تائید کرے۔

دوم یہ کہ مرزا صاحب کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیاحت کشمیر کے لئے آپ کا صلیب پر چڑھایا جانا ضروریات میں سے ہے اور جب ثابت ہو چکا کہ واقعہ صلیبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت بآیت قرآنی۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (یہود نے حضرت عیسیٰ کو نہ تو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا) بالکل باطل اور غلط ہے تو اس کے بعد کشمیر کی طرف ہجرت کرنے کے کیا معنے؟

اب ہم اس آیت کی صحیح تفسیر بیان کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ایک امر کا اشارہ ہے۔ اور اس مقام سے مراد بیت المقدس ہے۔ جہاں حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمیت پناہ لی تھی۔ اس امر کی دلیل کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ایک

واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ ہے کہ اس کے شروع میں فرمایا وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً یعنی ہم نے ابن مریم کو اور اس کی ماں کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنایا اور ان کا یہ نشان ہونا عیسیٰ علیہ السلام کے بے باپ ہونے کے اعتبار سے ہے اور اس کے بعد فرمایا وَآوَيْنٰهُمَا إِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ یعنی ہم نے اُن دونوں کو ایک اونچی جگہ میں جو قرار کے قابل اور شاداب بھی تھی پناہ دی۔ اور ان دونوں جملوں کو حرف عطف سے وصل کیا اور لفظ آیہ کو مفرد ذکر کیا حالانکہ ذکر ان دونوں کو نشان بنانے کا ہے تو جب تک دونوں اکٹھے ایک ہی امر میں نشان نہ ہوں تب تک ان کو ایک نشان نہیں کہہ سکتے بلکہ پھر دو نشان کہنا پڑے گا۔ جیسا کہ فرمایا وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ (بنی اسرائیل پارہ ۱۵) بنایا ہم نے رات اور دن کو (اپنی قدرت و انتظام کے دو نشان۔

اور وہ امر جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ دونوں اکٹھے ایک نشان ہیں سوائے آپ کی ولادت بلا پدر کے اور کونسا ہے۔ چنانچہ اسی کے موافق سورۂ انبیاء میں بھی فرمایا۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہم نے مریمؑ کو اور اس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنایا۔

سورۂ مومنون کی آیت میں مقصود عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اس لیے اس مقام پر آپ کا ذکر پہلے کیا اور آپ کی ماں حضرت مریم کا ذکر پیچھے لیکن سورۂ انبیاء میں مقصود مریم کا ذکر ہے اس لیے اس جگہ ان کا ذکر پہلے کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیچھے۔

اسی طرح سورۂ مریم میں مذکور ہے۔ کہ حضرت مریم کو عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بلا پدر کی بشارت کے وقت بھی سنایا گیا تھا۔ (کہ اس کے بلا پدر پیدا کرنے میں یہ حکمت ہے) کہ اس کو لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کا) نشان بنانا چاہتے ہیں۔

﴿ وَلِنَجْعَلَهٗ آيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ (مریم پارہ ۱۶)

اور اسی طرح سورۂ زخرف میں بھی کفار کے جواب میں فرمایا

﴿ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَآئِيلَ ﴾ (زخرف پارہ ۲۵)
ہم نے اس کو (ابن مریم کو) بنی اسرائیل کے لیے (اپنی قدرت کا)
ایک نشان بنایا

اس سارے بیان سے واضح ہو گیا کہ دوسری آیات قرآنی کی طرح اس آیت زیر بحث میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بلا باپ پیدا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس قدر بیان کے بعد شاید میرے ناظرین یہ کہہ اٹھیں کہ دلیل تو اس امر کی دینی تھی کہ جملہ وَاٰوَیْنٰھُمَا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بلا پدر کے متعلق ایک واقعہ کا اشارہ ہے۔ اور تقریر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بلا پدر ہونے کی چھیڑ دی۔ تو آپ کی حیرانی کو دور کرنے کے لیے اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یہ سارا بیان اصل مقصود کے ثابت کرنے سے پہلے ذکر کیا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی حکمت تو ضرور ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ سورہ مریم میں جہاں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے۔ فرمایا۔

﴿ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴾ (مریم پارہ ۱۶)

پس جبرئیل کے بشارت سناتے ہی (خدا کی قدرت سے) اس نے (پیٹ میں) اس (بیٹے) کو اٹھا لیا (جس کی بشارت سنائی گئی تھی) پس اس کو دردزہ کھجور کے تنے کی طرف لے پہنچا۔ کہنے لگی اے کاش میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی۔ اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی اس پر اس کو اس کے نیچے سے آواز دی تو کوئی اندیشہ نہ کر (دیکھ تو) تیرے پروردگار نے تیرے نیچے ایک چشمہ بہا دیا ہے اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا وہ تجھ پر پکی پکی تازہ کھجوریں جھاڑی گی۔

سورۃ مریم کی ان آیات میں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ذکر میں چشمہ کا ذکر صاف طور پر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو اس وقت کرامت فرمایا تھا۔ پس آیت زیر بحث یعنی وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ذکر کے بعد اسی کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر ہے جو نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

اب ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ خوشگوار پانی والا اونچا قطعہ زمین وہی علاقہ شام ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے۔

﴿ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ﴾ (اعراف پارہ ۹)

اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو ضعیف شمار کیے جاتے تھے اس زمین کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے

اسی سورۂ بنی اسرائیل میں بھی فرمایا۔

﴿ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ ﴾

(پارہ ۱۵ بنی اسرائیل)

پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے کچھ حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد ہم نے برکت رکھی ہے

سورۂ مائدہ میں اس مبارک زمین کو ارض مقدسہ بھی کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔

﴿ يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ﴾

(مائدہ پارہ ۶)

اے میری قوم داخل ہو اس زمین پاک میں جو خدا نے تمہارے لیے لکھی ہے

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔

﴿ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾ (انبیاء پارہ ۱۷)

سلیمان کے لیے زور کی ہوا بھی چلتی تھی اس کے حکم سے اس زمین کی طرف جس میں ہم نے برکت رکھی ہے

ان آیات مذکورہ بالا سے صاف واضح ہو گیا کہ اس زمین کو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ارض مبارکہ اور ارض مقدس فرمایا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے روحانی وجسمانی ہر طرح کی برکتیں رکھی ہوئی ہیں۔ روحانی یہ کہ اس میں بہت پیغمبر پیدا کیے۔ جسمانی یہ کہ اس میں میٹھی نہریں چلتی ہیں باغات بکثرت ہیں۔ میوہ جات بافراط ہوتے ہیں اور یہ ہر دو امر ایسے ہیں کہ محتاج بیان نہیں [1]

پس اس آیت زیر بحث میں بھی اس جگہ سے یہاں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جگہ ملی یہی زمین مبارک مراد ہے۔ کیونکہ اس کی صفات دوسرے مقامات پر قرآن شریف میں مذکور ہیں جو ہم نے بیان کر دیں تفسیر ابن کثیر میں اس قول کو اقرب اور اظہر اور موید بالقرآن کہہ کر لکھا ہے۔

﴿ واقرب الاقوال في ذالك ما رواه العوفي عن ابن عباس في قوله وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ قال المعين الماء الجاري وهو النهر الذي قال الله تعالىٰ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وكذا قال الضحاك وقتادة اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ هو بيت المقدس فهذا والله اعلم هو الاظهر لانه المذكور في الاية الاخرى والقران يفسر بعضه بعضا ﴾

اور سب قولوں سے اقرب وہ ہے جو عوفی نے ابن عباس سے اس

---

[1] چنانچہ خاکسار بتوفیق الٰہی ۱۳۲۰ھ کے سفر حج میں بچشم خود دیکھ آیا ہے۔ منہ

آیت واوینٰہما الخ کی بابت روایت یہ ہے کہ معین جاری پانی کو کہتے ہیں اور اس سے وہ نہر مراد ہے جس کی بابت دوسری جگہ فرمایا قد جعل ربک تحتک سریا (سورہ مریم) (یعنی حضرت عیسیٰ کی ولادت پر جو حضرت مریم کے لیے خدا نے ظاہر کی) اور اسی طرح خشک اور تر دونوں ہیں کہ ربوۃ ذات قرار و معین سے مراد بیت المقدس ہے اور یہی قول اظہر ہے کیونکہ یہ دوسری آیت میں مذکور ہے اور قرآن کی بعض آیتیں بعض کی تفسیر کرتی ہیں

مرزا صاحب کا یہ کہنا کہ اس زمین سے مراد ملک کشمیر ہے نہ تو قرآن مجید سے اور نہ حدیث شریف سے ثابت ہے اور نہ اقوال صحابہ اس کی تائید کرتے ہیں۔ پس ان کی اپنی رائے قرآن شریف کی آیات اور آثار صحابہ و تابعین کے مقابلہ میں ہرگز پیش نہیں ہو سکتی۔

ثانیاً یہ کہ آوینٰہما سے تحقق موت ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ جملہ صرف اس امر کا مفید ہے کہ خدا نے ان کو جگہ دی اس سے موت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے!

شاہزادہ یوز آسف کا قصہ

چونکہ مرزا صاحب نے کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ کا ذکر کر کے کہا ہے کہ کشمیری قبر کی تصدیق کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس سے انہوں نے خلق خدا کو سخت دھوکا دیا ہے اور یوز آسف کو یسوع بنا کر اپنا مطلب سیدھا کرنا چاہا ہے اس لئے ہم اس کتاب کا کچھ ترجمہ بطور خلاصہ درج کرتے ہیں۔ تا کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ اصل کتاب میں کسی اور شخص کا ذکر ہے اور مرزا صاحب حسب عادت دھوکے سے اسے حضرت عیسیٰ کہہ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔

شیخ ابن بابویہ کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ میں بسند خود محمد بن زکریا سے نقل کرتے ہیں کہ۔

ممالک ہندوستان میں ایک بادشاہ تھا جس امر کو امور دنیا سے چاہتا تھا آسانی میسر ہوتا تھا۔ اس کی مملکت میں دین اسلام ہو چکا تھا جب یہ تخت پر بیٹھا تو اہل دین سے بغض رکھنے لگا۔ اور ان کو ستانے لگا بعض کو قتل کروا دیا اور بعض کو جلا وطن کر دیا اور بعض اس کے خوف سے روپوش ہو گئے ایک دن بادشاہ نے ان لوگوں میں سے جو اس کے نزدیک نظر عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک شخص کی نسبت سوال کیا تو وزراء نے جواباً عرض کیا کہ وہ چند ایام سے تارک دنیا ہو کر گوشہ نشین ہو گیا ہے بادشاہ نے اس کی طلبی کا حکم دیا اور اسے لباس زہاد و عباد میں دیکھ کر بہت خفگی ظاہر کی۔ اس باخدا کے ساتھ بادشاہ کی بہت باتیں ہوئیں۔ اور اس نے بہت حکمت آموز باتیں کیں۔ لیکن بادشاہ کو کچھ اثر نہ ہوا۔ اور اسے اپنی مملکت سے نکلوا دیا۔ بعد اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ نہ گزرا تھا کہ بادشاہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور اس کا نام یوز آسف رکھا۔ شہزادے کی ولادت پر منجموں نے اس کے طالع کی نسبت بالا تفاق کہا کہ یہ شہزادہ فرخندہ طلعت نیک اختر نہایت اقبال مند ہو گا لیکن ایک بوڑھے منجم نے کہا کہ اس کا طالع واقبال دنیوی جاہ وحشم کے متعلق نہیں بلکہ یہ سعادت

مندی عاقبت کی ہے اور گمان قوی ہے کہ یہ شاہزادہ پیشوایان زہاد و عباد سے ہوگا۔

بادشاہ یہ سن کر نہایت حیران و غمگین ہوا اور اس کی تربیت کے لیے حکم دیا کہ ایک شہر و قلعہ خالی کرایا جائے جس میں صرف شاہزادہ اور اس کے خادم سکونت کریں اور سب کو نہایت تاکید کی کہ آپس میں کوئی تذکرہ دین حق اور مرگ و آخرت کا ہرگز نہ کریں تاکہ یہ خیالات اس کے کان میں نہ پڑیں۔

اس کے بعد کئی سو صفحوں تک شاہزادے کی تربیت اور دین حق کی طرف اس کی رغبت اور علم دین کی تعلیم اور ترک سلطنت اور اختیار فقر کا ذکر ہے۔

اس بیان سے صاف واضح ہے کہ شہزادہ یوز آسف ممالک ہندوستان کے شہزادوں میں سے ایک باہدایت و باایمان شاہزادہ ہوا ہے جسے خدا تعالیٰ نے اپنے دین کی راہ دکھائی۔ نہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی اسرائیلی پیغمبر ملک کشمیر میں آئے اور یہاں فوت ہوئے۔

ہم مرزا صاحب کے مقلدوں کو پکار کر کہتے ہیں کہ وہ کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ کو نکال کر ہمارے سامنے کسی مجلس میں اس میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر خدا کا ذکر نکال کر دکھا دیں۔ ورنہ جھوٹ کا اقرار کرلیں اور کہیں۔

”جھوٹے پر خدا کی لعنت“

یہ کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ لنڈن کے سرکاری کتب خانہ میں بزبان فارسی موجود ہے چنانچہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر کا ایک خط جو انہوں نے سفر ولایت کے ایام میں لنڈن سے لکھا تھا پیسہ اخبار لاہور میں شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے اس کتاب کے دیکھنے کا ذکر کیا تھا اور اس کی بعض عبارتیں اصل فارسی زبان میں نقل کی تھیں۔ جن کا ترجمہ ہماری عبارت منقولہ بالا میں آ گیا ہے اور اب اس تمام کتاب کا اردو ترجمہ بنام تنبیہ الغافلین مطبع صبح صادق میں چھپ چکا ہے لاہور وغیرہ سے دستیاب ہو سکتا ہے مزید اطمینان کے لیے شائقین خود کتاب منگوا کر تسلی کرلیں۔

مدفنِ عیسیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مدفن مدینہ طیبہ داخلِ حجرہ نبویہ ﷺ ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام

﴿ ثُمَّ يَمُوتُ فَيُدْفَنُ مَعِي فِي قَبْرِي فَأَقُومُ أَنَا وَعِيسَى بْنُ مَرْيَمَ فِي قَبْرٍ وَاحِدٍ بَيْنَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ ﴾

بعد نزول کے فوت ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ کے روضہ شریف میں آپ کے ساتھ شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان مدفون ہوں گے۔

یہ حدیث بروایت عبداللہ بن عمر تخریج ابن الجوزی در کتاب الوفاء مشکوٰۃ کے باب نزول عیسیٰ علیہ السلام میں موجود ہے اس سے منصوصاً اور منطوقاً ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مدفن مقبرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے نہ کوئی اور موضع۔

اس حدیث کے متعلق ہم علاوہ امر مقصود کے دیگر امر بھی ذکر کرتے ہیں جن سے مرزا صاحب کی مسیحیت ان کی اپنی زبانی بالکل درہم برہم ہو جاتی ہے۔

مرزا صاحب اپنی مشہور کتاب ضمیمہ انجام آتھم اور شہادت القرآن کے ص ۵۳ پر اس حدیث کو اپنی مسیحیت کی دلیل گزارتے ہیں۔ اس تقریب سے کہ اس حدیث کا شروع اس طرح ہے۔

﴿ يَنْزِلُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ إِلَى الْأَرْضِ فَيَتَزَوَّجُ وَيُولَدُ لَهُ وَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ خَمْسًا وَأَرْبَعِينَ سَنَةً ثُمَّ يَمُوتُ ﴾

اتریں گے عیسیٰ بن مریم زمین پر پس نکاح کریں گے اور ان کے ہاں اولاد پیدا ہوگی اور زمین میں پینتالیس سال رہیں گے پھر فوت ہوں گے۔

اس حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نکاح کا جو ذکر ہے اس کی بابت مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مرزا احمد بیگ ہوشیار پوری کی لڑکی محمدی بیگم کے میرے نکاح میں آنے اور پھر اس سے اولاد کے ہونے کی بشارت ہے چنانچہ شہادت القرآن کے ص ۵۳ پر فرماتے ہیں کہ۔

حدیث میں اس نکاح کو مسیح موعود کی صداقت کی علامت خود حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ پھر اسی حدیث کو ذکر کیا ہے جو ہم نے اوپر لکھی ہے۔

اوّل یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب مرزا صاحب اس حدیث کو اپنے دعوے کے دلائل میں شمار کرتے ہیں تو یہ حدیث اُن کے نزدیک صحیح اور قابل استناد ہے پس جب اسی حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مدفن مدینہ طیبہ داخل حجرہ شریفہ ہے تو مرزا صاحب کا آپ کی قبر کی بابت یہ کہنا کہ وہ کشمیر میں ہے باطل ہے۔

دوم یہ کہ اس حدیث میں مسیح موعود کے لیے بتایا گیا کہ وہ مدینہ طیبہ میں مدفون ہوں گے اور سب پر واضح ہے کہ مرزا صاحب لاہور میں فوت ہوئے اور وہاں سے ریل پر سوار کر کے قادیاں میں دفن کیے گئے۔ پس جب مطابق حدیث کے آپ کا دفن نہ ہوا تو آپ کا دعویٰ مسیحیت بھی باطل ہوا۔

سوم یہ کہ مرزا صاحب نے اس حدیث کے رو سے محمدی بیگم کے نکاح کو اپنی مسیحیت کا نشان قرار دیا۔ اور معلوم ہے کہ مرزا صاحب دنیا سے اس کے نکاح سے محروم رخصت ہوئے تو جس امر کو انہوں نے مسیحیت کا نشان قرار دیا تھا وہ پورا نہ ہوا تو مرزا صاحب کا دعویٰ مسیحیت غلط ہوا۔

مولوی محمد احسن صاحب نے اس حدیث نبوی پر یہ اعتراض کیا کہ اس سے اہانت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لازم آتی ہے۔ کیونکہ جب عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک میں دفن کیے جائیں تو بالضرور قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کھودنا لازم آئے گا اور یہ بے ادبی ہے جناب اقدس رسول کریم ﷺ میں۔

مولوی محمد احسن صاحب نے لیاقت علمی اور قوت نظری سے بالکل کام نہیں
لیا اور تقویٰ اور ادب کو بالائے طاق رکھ دیا یہ اعتراض تو رسول اللہ ﷺ ناطق بالوحی کے
کلام ہدایت التیام پر ہوا نہ کہ اہل سنت کے اعتقاد پر۔ کیونکہ اہل سنت تو صرف کلمات نبویہ
کے ناقل ہیں۔ اور ان کے مطابق اعتقاد رکھنے والے افصح الفصحی ناطق بالوحی صلی اللہ علیہ
وسلم کے کلمات جو معہ خود اس شبہ والی وارد کرتے ہیں اور تصریح بین ابی بکر و عمر اسی لیے
ہے کہ کسی متجاہل کو شبہ قبر کے کھودنے کا نہ پڑے کیونکہ مرکب اضافی بین ابی بکر و عمر متعلق
بفعل یدفن کے نہ اقوم کے کیونکہ نقشہ روضہ پاک اس کا انکار کر رہا ہے جب یہ صاف بتلا
دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام شیخین خلیفتین کے درمیان مدفون ہوں گے تو شبہ کھودنے قبر کا جاتا رہا
اور یہی تخصیص بین ابی بکر و عمر مفید ہے اس امر کی کہ قبر بمعنی مقبرہ ہے اور فے بمعنی من ہے
(فافہم) اس حدیث میں قبر بمعنی مقبرہ اور فی ثانی بمعنی من کی تصریح ملا علی قاری نے اسی حدیث
کی شرح میں کی ہے۔

روضہ مطہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ حسب ذیل ہے (منقول از جذب القلوب)

نقشہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوبکرؓ

موضع قبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عمرؓ

اس کیفیت سے کہ سر مبارک حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا محاذی معدن اسرار منبع
انوار صدر شریف حضرت رسول اللہ ﷺ کے ہے اور سر مبارک حضرت خلیفہ ثانی کا
بمقابلہ سینہ حضرت خلیفہ اول اور قدم مبارک حضرت رسول اللہ ﷺ کے ہے اور قدم

حضرت عمرؓ کے دیوار کے بیچ میں ہیں۔ اس کیفیت سے جو موضع حضرت خلیفہ ثانی فاروق اعظم حضرت عمرؓ کے سرہانے خالی بچی ہوئی ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کی جگہ ہے جو قادیانی کو کبھی بھی نصیب نہ ہوگی ان اللہ لا یخلف المیعاد[1]

یہ کیفیت قبور ثلاثہ کی شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے جذب القلوب میں درج فرمائی اور اسی وضع کو صحیح کہا ہے حج الکرامہ میں بنقل ابن خلدون از کندی ذکر کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام مدینہ میں فوت ہوں گے اور حضرت عمرؓ کے پاس دفن کئے جائیں گے یہ بھی مروی ہے کہ ابوبکر و عمر دو پیغمبروں کے درمیان سے محشور ہوں گے۔

دوسری حدیث کنز العمال میں بتخریج ابن عساکر نقل کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ میں نے جناب اقدس سے عرض کیا کہ

﴿عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَرٰی اَنِّیْ اَعِیْشُ بَعْدَکَ فَتَاْذَنُ اَنْ اُدْفَنَ اِلٰی جَنْبِکَ فَقَالَ وَاَنّٰی لِیْ بِذٰلِکَ الْمَوْضِعَ مَافِیْهِ الا موضع قَبْرِیْ وَقَبْرُ اَبِیْ بَکر وعُمر وعیسٰی ابن مریم﴾

(کنز العمال علیہ ہامش المسند الامام احمد جلد سادس ص ۵۷)

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں آپ کے بعد زندہ رہوں گی پس آپ اجازت فرمائیں کہ میں آپ کے پہلو میں دفن کی جاؤں تو آپ نے فرمایا کہ اس جگہ کی نسبت میرا کچھ اختیار نہیں ہے وہاں تو سوائے میری قبر ابوبکر اور عمر اور عیسیٰ بن مریم کی قبر کے کسی کی جگہ نہیں﴾

چونکہ حضرت عائشہؓ کا آئینہ قلب بوجہ اکتساب انوار نبویہ ازبس مجلّٰی تھے اس لیے آپ پر کرامۃً مکشوف و مشہور ہو گیا کہ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہیں گی پس تمنا کی کہ آپ کی جنب مبارک میں مدفون ہوں۔ اس پر آپ نے جواب فرمایا

[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو بروز منگل سہ شنبہ لاہور میں بعارضہ مرض ہیضہ فوت ہو گئے اور فریضہ حج ادا نہ کیا جو بوجہ تمول آپ پر فرض تھا اور بوجہ دعوائے مسیحیت ہونا ضروری تھا۔

کہ اللہ مدبر السموات والارض کی طرف سے یہی امر مقدر ہے کہ میرے مقبرہ میں سوائے میری قبر اور ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عیسیٰ بن مریم کی قبر کے اور کسی کی قبر نہ ہو پس یہ میرا اختیاری امر نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جس امر کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وضاحت اور صفائی سے مصرح بیان فرمائیں۔ مبطلین منکرین اس میں ترددات وشبہات وارد کرتے ہیں اور صراط مستقیم کی طرف توجہ نہیں کرتے یہ صرف بداعتقادی کا نتیجہ ہے۔

تیسری حدیث کو امام ترمذی نے عبداللہ بن سلام سے روایت کیا اور اس حدیث کو حسن کہا کہ توریت میں محمد رسول اللہ ﷺ کی صفت ہوئی ہے۔

﴿عن عبد الله بن سلام قال مكتوب في التوراة صفة محمد وعيسى بن مريم يدفن معه قال ابو مودود وقد بقي في البيت موضع قبر﴾

(رواہ الترمذی (وحسنہ) مشکوۃ باب اسماء النبی)

اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم ان کے ساتھ مدفون ہوں گے ابو مودود جو اس حدیث کے ایک راوی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ابھی تک حجرہ منیفہ وروضہ شریفہ میں ایک قبر کی جگہ باقی پڑی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہر دو پیغمبران صلوۃ اللہ علیہما والسلام کی خبر توریت میں دی تھی اور یہ بھی کہ ان دونوں کا مدفن ایک ہوگا اور الفاظ مبارکہ یدفن معہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسیٰ بن مریم کی موت وفات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متاخر ہوگی۔ کیونکہ مقام وصول پر ملحق بہ ملحق سے متقدم ہوتا ہے۔

روایت چہارم تفسیر ابن کثیر میں تخریج ابن عساکر عن بعض السلف ذکر کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم رسول اللہ ﷺ کے حجرہ میں آپ کے پاس مدفون ہوں گے۔

روایت کیجم طبرانی اور ابن عساکر اور امام المحدثین امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عبداللہ بن سلام سے روایت کیا کہ

﴿ذکر الحافظ ابو القاسم ابن عساکر فی ترجمة عیسی بن مریم من تاریخه عن بعض السلف انه یدفن مع النبی صلی اللہ علیه وسلم فی حجرته﴾

(ابن کثیر جلد ثالث بذیل آیت وان من اہل الکتاب)

عیسیٰ بن مریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحبین یعنی حضرت ابوبکر اور عمر کے ساتھ مدفون ہوں گے

﴿یدفن عیسی بن مریم مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وصاحبیه فیکون قبره رابعا ص ۳۲۹﴾

پس آپ کی قبر چوتھی ہوگی

اور اسی طرح امام زرقانی مالکی نے شرح مواہب لدنیہ میں کہا کہ

﴿ذکر ابن عساکر ان وفات عیسی تکون بالمدینة فیصلے علیه هنالک ویدفن بالحجرة النبویة﴾ (ج)

ابن عساکر نے ذکر کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات مدینہ طیبہ میں ہوگی

پس اسی جگہ آپ کا جنازہ پڑھا جائے گا۔

اور حجرہ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن کئے جائیں گے۔

ان احادیث واخبار سے عیسیٰ علیہ السلام کا اب تک زندہ ہونا اور پھر زمانہ اخیر میں نازل ہونا اور کئی سال کے بعد فوت ہو کر مدینہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے پاس دفن کیا جانا صاف ثابت ہے اور اسی امر پر امت مرحومہ کا اجماع ہے پس چونکہ ان سے مرزا صاحب کی عمارت مسیحیت بالکل منہدم اور ان کی بیخ رسالت کھوکھلی ہو جاتی ہے

اوردام بیعت کا سارا تانا بانا ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ مرزا صاحب قادیانی کا مدینہ منورہ میں پہلوئے نبی ﷺ میں مدفون ہونا تو در کنار ان پر دخول حرمین بھی حرام ہے اس لیے ان الزامات سے بچنے کے لیے ایک دروغ بے سروپا گھڑا کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں بتا دی۔

چونکہ مرزا صاحب کا خروج وفتنہ مذہبی پہلو میں ہے اور ان کا ادعا مسلمانوں کی امامت کا ہے اس لیے اُن کو خواہ مخواہ قرآن وحدیث میں تصرف کر کے مسلمانوں کے سامنے کچھ نہ کچھ پیش کرنا پڑا ہے ورنہ ان کے مسائل مخصوصہ میں ان کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہوتی جو قابلِ اعتبار ہو کیا آپ دیکھتے نہیں کہ قرآن مجید میں صاف طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب نہ ہونے کا ذکر موجود ہے اور پھر انہوں نے اپنے مطلب کو سیدھا کرنے کے لیے عیسائیوں کی کتابوں کی پیروی کی اور قرآن شریف کی آیت کے معنی ہی بدل دیئے حالانکہ وہ معنی نہ تو لغت کی رو سے درست ہیں اور نہ سلف وخلف میں سے کسی سے منقول ہیں۔ اسی طرح اس آیت اٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبۡوَةٍ. کو انہوں نے محض مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے پیش کیا ہے اور اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کا کشمیر میں ہونا بتایا ہے حالانکہ اس میں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے۔ نہ قبر کا اور نہ ملک کشمیر کا۔

علاوہ بریں یہ کہ اس آیت میں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا ذکر نہیں بلکہ آپ کی والدہ حضرت مریم کا بھی ساتھ ہی ذکر ہے اور صیغہ تثنیہ کے یہی معنی ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرا بھی اس حکم میں شامل ہے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ بعد مصلوب ہونے کے کشمیر کو بھاگ آئے۔ تو حضرت مریم بھی ساتھ ہی ہوں گی اور ان کی قبر بھی کشمیر ہی میں چاہیے کیونکہ اس آیت میں دونوں کا ذکر ہے۔ لیکن بیان بالا سے معلوم ہو چکا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر مدینہ طیبہ میں آنحضرت ﷺ کے روضہ پاک

ہیں ہوگی اور حضرت مریم کی قبر تو بیت المقدس میں ہے جہاں وہ بعد رفع عیسوی فوت ہوئیں اور دفن کی گئیں[1] پس مرزا صاحب کا قول سراسر باطل ہے۔

مولوی ثناء اللہ صاحب کے ساتھ (مرزا غلام احمد قادیانی کا) آخری فیصلہ

قبر مسیح یا حیات مسیح وغیرہ کے مضامین گو ایک حد تک مفید ہیں لیکن پوری طرح ازالہ فساد کرنے کو یہی مضمون ہے جس کا نام آخری فیصلہ ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ مرزا صاحب قادیانی نے ایک اشتہار بطور آخری فیصلہ کے دیا تھا جس میں آپ نے دعا کی تھی کہ الٰہی ہم دونوں (مرزا اور مولوی ثناء اللہ) میں سے جو تیرے نزدیک جھوٹا ہے اس کو سچے کی زندگی میں مار دے چنانچہ وہ اشتہار یہ ہے۔

بخدمت مولوی ثناء اللہ صاحب السلام علی من اتبع الھدی۔ مدت سے آپ کے پرچہ اہلحدیث میں میری تکذیب اور تفسیق کا سلسلہ جاری ہے ہمیشہ مجھے آپ اس پرچہ میں مردود کذاب دجال مفسد کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور دنیا میں میری نسبت شہرت دیتے ہیں کہ یہ شخص مفتری اور کذاب اور دجال ہے اور اس شخص کا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا اسراسر افترا ہے میں نے آپ سے بہت دکھ اٹھایا اور صبر کرتا رہا مگر چونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میں حق کے پھیلانے کے لیے مامور ہوں اور آپ بہت سے افترا میرے اوپر کر کے دنیا کو میری طرف آنے سے روکتے ہیں اور مجھے ان گالیوں اُن تہمتوں اور ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں کہ جن سے بڑھ کر کوئی لفظ سخت نہیں ہوسکتا۔ اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ یہ کسی الہام یا وحی کی بنا پر پیشگوئی نہیں بلکہ محض دعا کے طور پر میں نے خدا سے فیصلہ چاہا ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے مالک بصیر وقدیر جو علیم وخبیر ہے جو میرے دل کے حالات سے واقف ہے۔ اگر یہ دعویٰ

---

[1] چنانچہ خاکسار سفر ۱۳۳۰ھ میں بچشم خود دیکھ آیا ہے ۱۲ منہ

مسیح موعود ہونے کا محض میرے نفس کا افترا ہے اور میں تیری نظر میں مفسد اور کذاب ہوں اور دن رات افترا کرنا میرا کام ہے تو اے میرے پیارے مالک میں عاجزی سے تیری جناب میں دعا کرتا ہوں کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کی زندگی میں مجھے ہلاک کر اور میری موت سے ان کو اور ان کی جماعت کو خوش کر دے۔ آمین میں تیرے ہی تقدس اور رحمت کا دامن پکڑ کر تیری جناب میں ملتجی ہوں کہ مجھ میں اور ثناء اللہ میں سچا فیصلہ فرما اور وہ جو تیری نگاہ میں حقیقت میں مفسد اور کذاب ہے اس کو صادق کی زندگی میں ہی دنیا سے اٹھا لے یا کسی اور نہایت سخت آفت میں جو موت کے برابر ہو مبتلا کر اے میرے پیارے مالک تو ایسا ہی کر آمین ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین۔ آمین (راقم عبداللہ الصمد مرزا غلام احمد مسیح موعود عافاہ اللہ وایدہ۔

اس دعا کی بابت اخبار "بدر" ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء میں مرزا صاحب کا قول لکھا ہے کہ ثناء اللہ کی بابت جو ہم نے دعا کی ہے خدا نے اس کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے چنانچہ وہ قبول ہوگئی کہ مرزا صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے اور مولوی صاحب تا حال زندہ سلامت ہیں۔ الحمد للہ کیا سچ ہے۔

لکھا تھا کاذب مریگا پیشتر کذب میں پکا تھا پہلے مر گیا

المرتب خاکسار

ابراہیم سیالکوٹی عفی عنہ

مناظرانہ اسلوب میں لکھی گئی کتب میں اہم ترین کتاب

مولانا ثناء اللہ امرتسری کی لاجواب تصنیف

بجواب

ستیارتھ پرکاش

از سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج

1. تبلیغ اسلام میں غیر مسلموں کے شکوک و شبہات رفع کرنے کیلئے شاہکار کتاب۔
2. ہندو دھرم اور آریہ سماج سے متعلق وہ مواد جو آج کے دور کی سینکڑوں کتب میں ناپید ہے۔
3. سوامی دیانند سرسوتی (بانی آریہ سماج) کی کتاب ستیارتھ پرکاش باب چودہ کا اہل اسلام کی جانب سے ہندو دھرم کے پیشواؤں کو مسکت اور مدلل جواب۔

اس کتاب کا مطالعہ غیر مسلموں میں تبلیغ کرنے والے احباب کیلئے نہایت معاون و مددگار ہوگا۔

نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور۔
مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ۔ سے طلب فرمائیں

برائے یادداشت
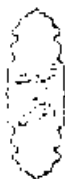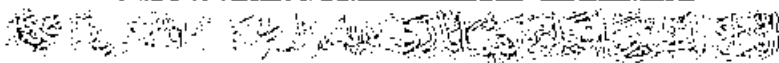
اسلام اور مسیحیت
اخلاقی پستیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے
مقدس رسول
جس میں آریوں کے رسالہ "رنگیلا رسول"
ناگری مصنفہ پنڈت کالی چرن کا مدلل و مسکت
جواب ہے